اسلام
ایک تعارف

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

تمہید

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اسلام فطرت انسانی کا مثنیٰ ہے۔ اسلام انسان کے تمام فکری اور روحانی تقاضوں کی تکمیل ہے۔ اسلام سب کے خدا کی طرف سے ہے اور وہ یکساں طور پر سب کے لیے آیا ہے۔ وہ رب العالمین کی پسند کا مظہر ہے جس کو پیغمبر رحمت ؐ کے ذریعہ انسانوں کے پاس بھیجا گیا ہے۔

خدا نے موجودہ کائنات بنائی اور اسی نے انسان کو اس زمین پر آباد کیا۔ اس نے انسان اور بقیہ کائنات کے لیے ایک ہی دین مقرر کیا، اس فرق کے ساتھ کہ بقیہ کائنات جس دینِ خداوندی پر مجبورانہ طور پر قائم ہے، اسی دینِ خداوندی پر انسان کو اختیارانہ طور پر قائم ہونا ہے۔

درخت زمین پر سیدھا کھڑا ہوتا ہے مگر اس کا سایہ زمین پر جھکا ہوا ہوتا ہے۔ یہ درخت کے لیے تواضع کا عمل ہے۔ اسی طرح انسان سے مطلوب ہے کہ وہ اپنی زندگی میں تواضع کا رویہ اختیار کرے۔

خلا میں بے شمار ستارے اور سیارے ہیں۔ سب کے سب مسلسل حرکت کر رہے ہیں مگر ان میں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ستارہ اور سیارہ اپنے متعین مدار کے اندر گھومتا ہے۔ یہی روش انسان کو اس طرح اختیار کرنا ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے دائرہ میں سرگرم ہو، کوئی انسان دوسرے انسان کے دائرہ میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرے۔

دنیا میں یہ نظام ہے کہ درخت آکسیجن نکالتے ہیں جو زندہ حیوانات کے کام آتی ہے اور حیوانات کاربن ڈائی آکسائڈ نکالتے ہیں جس کو درخت لے لیتے ہیں۔ یہ کائنات میں خدا کا قائم کردہ نظام ہے۔ یہی طریقہ انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسانی سماج میں یہ ہونا چاہیے کہ ہر ایک دوسرے کے کام آئے۔ ہر ایک دوسرے کے لیے نفع بخش بننے کی کوشش کرے۔

پہاڑوں سے چشمے جاری ہوتے ہیں۔ وہ بہتے ہوئے بار بار چٹانوں سے گزرتے ہیں مگر کوئی چشمہ کبھی چٹان کو توڑنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ چٹان کے اطراف سے اپنا راستہ نکال کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہی طریقہ انسان کو بھی اپنی سرگرمیوں میں اختیار کرنا ہے۔ وہ مسائل سے لڑنے کی

کوشش نہ کرے، وہ مسائل کو نظرانداز کرے اور مواقع کو استعمال کر کے اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔

سمندر سے بھاپ اٹھتی ہے اور بادل بن کر بارش کی صورت میں زمین پر برستی ہے۔ وہ ایک ملک اور دوسرے ملک کے درمیان امتیاز نہیں کرتی۔ وہ تمام کھیتوں اور باغوں کو یکساں طور پر سیراب کرتی ہے۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہونا چاہیے۔ انسان کی فیض رسانی کو بھی بارش کی طرح عام ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے ماحول میں اس طرح رہنا چاہیے کہ بارش کی مانند اس کا فیض سب کے لیے عام ہو۔

خدا نے جو دین کائنات میں تکوینی طور پر قائم کر رکھا ہے وہی دین اسلام کی صورت میں انسان کو تشریعی طور پر دیا گیا ہے۔ بقیہ کائنات کا کامیابی کے ساتھ چلنا اس لیے ہے کہ وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے دین کو کامل طور پر اختیار کیے ہوئے ہے۔ اسی طرح انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ بھی اسی دین خداوندی کو اپنا لے۔ اسی کے مطابق وہ اپنی زندگی کے معاملات کو درست کرے۔

جو لوگ ایسا کریں وہ موجودہ دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور موت کے بعد آنے والی دوسری دنیا میں بھی۔ دونوں دنیاؤں کی کامیابیاں اور سرفرازیاں ایسے ہی لوگوں کا حصہ ہیں۔

وحید الدین خان

۶ جنوری ۱۹۹۸

اسلام کیا ہے

خدا

خدا ایک ہے۔ خدا ایک ازلی و ابدی حقیقت ہے۔ وہ سب کچھ ہے۔ ہر چیز خدا سے ہے، خدا کسی چیز سے نہیں۔ خدا ہر چیز کا خالق بھی ہے اور وہی تمام عالم کا انتظام کرنے والا ہے۔

خدا، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے، سب کا تھامنے والا۔ اس کو نہ اونگھ آتی اور نہ نیند آتی۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے۔ اسی کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ تھکتا نہیں ان کے تھامنے سے۔ اور وہی ہے بلند مرتبہ والا۔ (البقرہ)

> قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: کہو کہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے
> نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد، اور کوئی اس کے
> برابر کا نہیں (الاخلاص)

قرآن کی یہ سورہ (الاخلاص) توحید الٰہی کی سورہ ہے وہ نہ صرف یہ بتاتی ہے کہ خدا ایک ہے بلکہ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خدا کے ایک ہونے کا مطلب کیا ہے۔ اس سورہ میں خدا کے تصور کو ان تمام آمیزشوں سے الگ کر کے پیش کیا گیا ہے جس میں ہر زمانہ کا انسان مبتلا رہا ہے، خدا کئی نہیں، خدا صرف ایک ہے سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں، وہ بذات خود ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اس سے بلند ہے کہ انسانوں کی طرح وہ کسی کی اولاد ہو یا اس کی کوئی اولاد ہو۔ وہ ایسی یکتا ذات ہے جس کا کسی بھی اعتبار سے کوئی مثل اور برابر نہیں۔ ہر قسم کی یکتائی صرف ایک ہستی کے لیے ہے اور وہ ہستی صرف خداوند ذوالجلال کی ہے۔ ایک خدا کا تصور اسلام کا مرکزی تصور ہے۔ یہی عقیدہ اسلام کا اصل سرا ہے اور یہی اسلام کی تمام تعلیمات کا واحد سرچشمہ۔

فرشتہ

خدا کی پیدا کی ہوئی بہت سی مخلوقات میں سے ایک مخلوق وہ ہے جس کو فرشتہ کہا جاتا ہے۔ فرشتوں کو خدا نے خصوصی صلاحیت اور خاص اختیارات دیے ہیں۔ وہ کائنات میں بڑے بڑے تصرفات کر سکتے ہیں۔ مگر ان کا سارا عمل خدا کی مکمل تابعداری میں ہوتا ہے۔ وہ ادنی درجہ میں بھی خدا سے انحراف نہیں کرتے۔

کائنات میں ہر لمحہ بے شمار واقعات ہو رہے ہیں مثلاً ستاروں کی گردش، سورج اور چاند کا چمکنا، زمین کا گردش کرنا۔ اسی طرح بارش، موسم اور دوسری بہت سی تبدیلیوں کا پیش آنا۔ انسان اور حیوان کی نسل کا زمین پر مسلسل باقی رہنا، اس طرح کے بے شمار واقعات جو ہر وقت دنیا میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں، ان سب کا انتظام یہی فرشتے کرتے ہیں۔ وہ خدا کی کائنات میں خدا کے انتہائی وفادار اور فرماں بردار کارندے ہیں۔

انسان فرشتوں کو نہیں دیکھتا۔ مگر فرشتے انسانوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ خدا کی طرف سے انسان کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ یہی فرشتے انسان پر موت بھی واقع کرتے ہیں اور اس کی روح کو یہاں سے لے جاتے ہیں۔

فرشتے موجودہ دنیا کا انتظام بھی کرتے ہیں اور فرشتے ہی آخرت میں جنت اور دوزخ کا انتظام بھی کرنے والے ہیں۔ یہ فرشتے اَن گنت تعداد میں ہیں۔

فرشتوں کے معاملہ کو ایک بڑے کارخانے کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کسی بڑے کارخانے میں ایک طرف بہت سی بڑی بڑی اور پیچیدہ مشینیں ہوتی ہیں۔ انھیں مشینوں سے وہ پیداوار نکلتی ہے جس کے لیے کارخانہ قائم کیا گیا ہے۔ مگر یہ مشینیں اپنے آپ نہیں چلتیں۔ ان کو چلانے کے لیے بہت سے انسانی کارکن درکار ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر کارخانہ میں بڑی تعداد میں انسانی کارکن سرگرم رہتے ہیں تاکہ وہ کارخانہ کو اس کے مطلوب انداز پر چلاتے رہیں۔ اسی طرح کائنات کے عظیم کارخانہ میں بے شمار فرشتے اس کو چلانے کے لیے مامور ہیں۔ دونوں کارخانوں میں صرف یہ فرق ہے کہ عام کارخانوں کے انسانی کارکن دکھائی دیتے ہیں، جبکہ کائناتی کارخانہ میں کام کرنے والے فرشتے ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتے۔

پیغمبر

پیغمبر وہ انسان ہے جس کو خدا اپنی نمائندگی کے لیے چن لے۔ خدا جب ایک انسان کو اپنا پیغمبر بناتا ہے تو خدا کا فرشتہ اس کے پاس آکر اس کو اس انتخاب کی خبر دیتا ہے۔ اس طرح اس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ اس کے بعد فرشتہ کے ذریعہ خدا اس پر اپنی تعلیمات اتارتا ہے تاکہ وہ ان تعلیمات سے تمام انسانوں کو باخبر کر دے۔ پیغمبر گویا خدا اور انسان کے درمیان ہوتا ہے۔ وہ خدا سے لے کر انسانوں تک پہنچاتا ہے۔

خدا نے انسان کو عقل دی۔ وہ اس کے ذریعہ ظاہری باتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ مگر بہت سی باتیں وہ ہیں جن کو جاننے اور سمجھنے کے لیے صرف ظاہری علم کافی نہیں۔ خود موجودہ دنیا کے بارہ میں زیادہ گہری حقیقتیں انسان کی عقلی گرفت میں نہیں آتیں۔ اور جہاں تک خدا اور عالم آخرت کا معاملہ ہے وہ مکمل طور پر نہ دکھائی دینے والی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس بنا پر وہ انسان کے عقلی ادراک سے باہر ہے۔

پیغمبر یہ کرتا ہے کہ وہ انسان کی اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ وہ اشیاء کی حقیقت کو بتاتا ہے۔ وہ آخرت کی دنیا کی خبر دیتا ہے۔ اس طرح وہ انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ علم و شعور کی پوری روشنی میں اپنی زندگی کا نقشہ بنائے اور اس کے مطابق کامیاب زندگی کی تعمیر کرے۔

انسان جب سے دنیا میں آباد ہوا اسی وقت سے پیغمبر بھی آنا شروع ہو گئے۔ وہ ہر زمانہ میں انسان کو خدا کی باتیں بتاتے رہے تاہم قدیم زمانہ میں آنے والے پیغمبروں کا مستند ریکارڈ باقی نہیں رہا۔ بعد کے حالات نے ان کی شخصیت کو بھی غیر تاریخی بنا دیا اور ان کی کتابوں کو بھی تاریخی طور پر غیر مستند۔

آخر میں خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا پیغمبر بنایا۔ آپ اس وقت پیدا ہوئے جبکہ دنیا میں دورِ تاریخ آچکا تھا۔ اسی کے ساتھ جلد ہی بعد وہ دور شروع ہونے والا تھا جس کو پریس کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح آپؐ کو وہ موافق اسباب ملے جنھوں نے آپ کو ایک مسلّمہ شخصیت بنا دیا۔ اس طرح آپ کی لائی ہوئی کتاب محفوظ رہ کر پریس کے دور میں داخل ہو گئی۔ اس کے بعد یہ امکان ہی ختم ہو گیا کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب میں کوئی تبدیلی کی جا سکے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول ہیں اور قیامت تک دنیا میں خدا کے واحد نمائندہ۔

قرآن

قرآن خدا کی کتاب ہے۔ قرآن میں جو تعلیمات ہیں وہ اصلاً وہی ہیں جو پچھلی آسمانی کتابوں میں اتاری گئی تھیں۔ مگر پچھلی آسمانی کتابیں اپنی ابتدائی صورت میں محفوظ نہیں رہیں۔ بعد کی تبدیلیوں نے ان کو غیر معتبر بنا دیا۔ جب کہ قرآن اپنی اصل صورت میں پوری طرح محفوظ ہے۔ اس لیے وہ کامل طور پر ایک قابل اعتبار کتاب ہے۔

قرآن میں ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی ایک خدا کو مانے۔ وہ اسی کے آگے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھے۔ وہ یقین کرے کہ پیغمبر آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو باتیں خدا نے بتائی ہیں وہ سب صحیح ہیں اور ان کو ماننے ہی پر انسان کی ابدی نجات کا دارومدار ہے۔

قرآن کی حیثیت صرف یہ نہیں ہے کہ وہ بہت سی آسمانی کتابوں میں سے ایک کتاب ہے۔ بلکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ بہت سی آسمانی کتابوں کے درمیان واحد قابل اعتبار کتاب ہے۔ کیوں کہ دوسری تمام کتابیں تبدیلیوں کے نتیجہ میں تاریخی طور پر غیر معتبر ثابت ہو چکی ہیں۔ پچھلی آسمانی کتابوں کو ماننے والا کوئی شخص جب قرآن کو مانتا ہے تو وہ اپنے عقیدہ کو رد نہیں کرتا۔ بلکہ خود اپنے عقیدہ کو زیادہ مستند صورت میں از سر نو پالیتا ہے۔

قرآن سب کے خدا کی طرف سے سب کی طرف بھیجی ہوئی مقدس کتاب ہے۔ وہ ہر انسان کی اپنی کتاب ہے، کیوں کہ اس کو اس خدا نے بھیجا ہے جو ہر انسان کا اپنا خدا ہے نہ کہ کسی غیر کا خدا۔

قرآن کوئی نئی آسمانی کتاب نہیں وہ پچھلی آسمانی کتابوں کا اگلا مستند ایڈیشن ہے اس اعتبار سے گویا قرآن تمام انسانوں اور تمام قوموں کی کتاب ہے وہ ہر ایک کے لیے خدا کی رحمت کا ظہور ہے، وہ ہر ایک کی طرف بھیجا ہوا خدا کا کامل پیغام ہے قرآن اسی طرح تمام دنیا کے لیے ہدایت کی روشنی ہے جس طرح سورج تمام دنیا کے لیے روشنی اور حرارت کا ذریعہ۔

حدیثِ رسولؐ

قرآن لفظ اور معنیٰ دونوں کے اعتبار سے خدا کا کلام ہے۔ حدیث اس مجموعہ کو کہا جاتا ہے جو معنیٰ کے اعتبار سے خدا کی بات ہے مگر لفظ کے اعتبار سے وہ رسولؐ کی اپنی زبان سے ادا ہوئی ہو۔ گویا کہ قرآن براہ راست طور پر خدا کا ہدایت نامہ ہے اور حدیث بالواسطہ طور پر خدا کا ہدایت نامہ۔

حدیث کی بہت سی کتابیں ہیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں وہ ہیں جو خصوصی طور پر زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ مثلاً —— صحیح البخاری، صحیح مسلم، جامع الترمذی، سنن ابی داؤد، سنن النسائی، سنن ابی ماجہ، موطا الامام مالک، مسند الامام احمد۔

حدیث، قرآن مجید کی تشریح اور تفصیل ہے۔ قرآن میں زیادہ تر اصولی احکام بیان کیے گئے ہیں، ان احکام کی تفصیلات حدیث سے معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح نظری احکام کا عملی ڈھانچہ بھی حدیث ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ حدیث کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ اس کو قرآن سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

حدیث کی کتابوں میں زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارہ میں تعلیمات اور احکام موجود ہیں۔ مثلاً یہ کہ نیت اور کیفیت کے اعتبار سے ایک مسلمان کو کیسا ہونا چاہیے۔ عبادت کا تفصیلی طریقہ کیا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں لوگوں کے ساتھ کس طرح معاملہ کیا جائے۔ زبان کا استعمال کس طرح کیا جائے، کھانے پینے کے حدود کیا ہیں۔ خاندانی نظام کا ڈھانچہ کس طرح بنایا جائے، اجتماعی تعلقات کی بنیاد کیا ہو۔ صلح و جنگ کے ضابطے کیا ہیں، مسلمانوں کا اگر کوئی اسٹیٹ ہو تو اس کو کس طرح چلایا جائے، وغیرہ۔

اس طرح کے تمام معاملات جو انسانی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کے اوپر دنیا و آخرت کی کامیابی کا انحصار ہے وہ سب تفصیل کے ساتھ حدیث کے ذخیرہ میں موجود ہیں۔ حدیث کے مطالعہ کے بغیر نہ اسلام کا مطالعہ مکمل ہوتا اور نہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی کا نقشہ بنایا جا سکتا۔

قرآن کے بعد اسلام کا سب سے بڑا ماخذ حدیث ہے۔ کسی حدیث کے بارہ میں جب یہ ثابت ہو جائے کہ وہ پیغمبر اسلامؐ کی حدیث ہے تو اس کو ماننا اتنا ہی ضروری ہو جاتا ہے جتنا کہ قرآن کو ماننا۔

اسلام

اسلام کے معنی اطاعت کے ہیں۔ مذہب اسلام کا نام اسلام اس لیے رکھا گیا کہ اس کی بنیاد خدا کی اطاعت پر ہے۔ اسلام والا وہ ہے جو اپنی سوچ کو خدا کے تابع کر لے، جو اپنے معاملات کو خدا کی تابع داری میں چلانے لگے۔

اسلام پوری کائنات کا دین ہے۔ کیوں کہ ساری کائنات اور اس کے تمام اجزاء خدا کے مقرر کیے ہوئے قانون کی ماتحتی میں چل رہے ہیں۔

یہی کائناتی رویہ انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو بھی اسی طرح خدا کا فرماں بردار بن کر اپنی زندگی بسر کرنا ہے جس طرح بقیہ کائنات مکمل طور پر خدا کی فرماں بردار بنی ہوئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کائنات مجبورانہ طور پر خدا کی پابندی کر رہی ہے اور انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ آزادانہ طور پر اپنے آپ کو خدا کے حکموں کا پابند بنا لے۔

آدمی جب اسلام کو اختیار کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کی سوچ اسلام کے تحت آتی ہے۔ اس کے بعد اس کی خواہش، اس کے جذبات، اس کی دل چسپیاں، اس کے تعلقات، اس کی محبت و نفرت، سب خدا کی اطاعت کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

پھر آدمی کی روزمرہ کی زندگی خدا کی ماتحتی میں آنے لگتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک اور اس کا لین دین اسلام کے تقاضوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ وہ اندر سے باہر تک ایک اطاعت شعار انسان بن جاتا ہے۔

انسان خدا کا بندہ ہے۔ انسان کے لیے درست طریقہ صرف یہ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا بندہ بن کر رہے۔ اسی بندگی والی روش کا دوسرا نام اسلام ہے۔ اسلامی زندگی خدا کی بندگی اور ماتحتی والی زندگی ہے۔ غیر اسلام یہ ہے کہ آدمی سرکش بن جائے اور خدا سے آزاد ہو کر زندگی گزارے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام یہ ہے کہ آدمی اطاعت شعار ہو اور اپنے آپ کو خدا کی وفاداری اور ماتحتی میں دیتے ہوئے زندگی گزارے۔ یہی دوسرے لوگ خدا کی رحمتوں میں حصہ دار بنائے جائیں گے۔

ایمان

ایمان کی حقیقت معرفت ہے یعنی خدا کی دریافت۔ ایک انسان جب خدا کے وجود کو شعوری طور پر پالے اور خدائی حقیقتوں تک اس کی رسائی ہو جائے تو اسی کا نام ایمان ہے۔

یہ دریافت کوئی سادہ بات نہیں۔ خدا تمام چیزوں کا خالق اور مالک ہے۔ وہ انعام دینے والا ہے اور سزا دینے والا بھی۔ اس کی پکڑ سے کوئی بچا ہوا نہیں۔ ایسے ایک خدا کی دریافت آدمی کی پوری زندگی کو ہلا دیتی ہے۔ اس کی سوچ میں ایک انقلاب آجاتا ہے۔ اس کے تمام جذبات کا مرکز خدا بن جاتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی پوری طرح خدا کا بندہ بن جاتا ہے۔ خدا ہی اس کی تمام توجہات کا مرکز بن جاتا ہے۔ اب وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جس کا جینا بھی خدا کے لیے ہو اور مرنا بھی خدا کے لیے ہو۔

اس ایمان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے آداب و اخلاق سب خدا کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ وہ بولتا ہے تو یہ سمجھ کر بولتا ہے کہ خدا اس کی آواز کو سن رہا ہے۔ وہ چلتا ہے تو اس طرح چلتا ہے کہ اس کی چال خدا کی پسند کے خلاف نہ ہو۔ وہ لوگوں سے معاملہ کرتا ہے تو اس کو یہ ڈر رہتا ہے کہ اگر میں نے کوئی برا معاملہ کیا تو خدا مجھے اس کی سزا دے گا۔

اس ایمان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی پوری زندگی آخرت رخی بن جاتی ہے۔ وہ ہر معاملہ میں دنیا سے زیادہ آخرت کے پہلو کو اپنی نظر میں رکھتا ہے۔ وہ وقتی فائدے کے بجائے آخرت کے فائدے کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتا ہے۔ جب بھی کسی معاملہ میں دو پہلو ہوں، ایک دنیا کا پہلو اور دوسرا آخرت کا پہلو تو ہمیشہ وہ دنیا کے پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے آخرت کے پہلو کو لے لیتا ہے۔

یہ ایمان اس کے لیے خدا پر انتہاء اعتماد کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ وہ ہر حال میں خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔ ایمان اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدائے برتر کی پہچان کا نام ہے۔ مگر جب یہ پہچان کسی کے دل و دماغ میں اترتی ہے تو وہ اس کی پوری شخصیت کو ایک نئی شخصیت بنا دیتی ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔

امتحان

موجودہ دنیا میں انسان آزاد ہے۔ خدا نے اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی ہے۔ مگر یہ آزادی امتحان کے لیے ہے نہ کہ بے قید زندگی کے لیے۔ اس آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی جانور کی طرح بے قید زندگی گزارے اور پھر ایک دن مر جائے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ آدمی خود اپنے ارادہ کے تحت صحیح زندگی گزارے۔ وہ خود اپنے فیصلہ کے تحت اپنے آپ کو اعلیٰ اخلاقی اصولوں کا پابند بنا لے۔

انسان کو اس انداز پر پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کو تمام مخلوقات میں سب سے اشرف مخلوق ہونے کا کریڈٹ دیا جائے۔ اس کا شمار خدا کے ان خصوصی بندوں میں ہو جنھوں نے کسی ظاہری پابندی کے بغیر اپنے آپ کو با اصول انسان بنایا۔ جنھوں نے کسی خارجی جبر کے بغیر خود اپنے آزادانہ فیصلہ کے تحت وہ کیا جو انھیں حقیقت کی رو سے کرنا چاہیے تھا۔

اس دنیا میں جتنی چیزیں ہیں سب کی سب خدا کی محکوم ہیں۔ خلا کے ستارے اور سیارے کامل طور پر خدا کے حکم کے تحت گردش کرتے ہیں۔ درخت، دریا، پہاڑ اور اس قسم کی دوسری تمام چیزیں پیشگی طور پر خدا کے مقرر کیے ہوئے نقشہ پر قائم ہیں۔ اسی طرح عام حیوانات بھی وہی کرتے ہیں جو ان کی پیدائشی جبلت کے تحت ان کے لیے مقرر کر دیا گیا تھا۔ دنیا میں استثنائی طور پر صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جس کو اختیار اور آزادی کی نعمت عطا کی گئی ہے۔

اسی آزادی نے انسان کے اوپر دو مختلف قسم کے دروازے کھول دیے ہیں۔ اگر وہ آزادی پا کر گھمنڈ اور سرکشی اور بے قیدی میں مبتلا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ آزمائش میں پورا نہیں اترا۔ اس کے بعد اس کے لیے وہی انجام مقدر ہے جو ان لوگوں کا ہونا ہے جو کسی نازک آزمائش میں ناکام ہو گئے ہوں۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اپنی ملی ہوئی آزادی کو صحیح دائرہ میں استعمال کریں۔ وہ مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو خدائی اصولوں کا پابند بنا لیں۔ یہ لوگ آزادی کی آزمائش میں کامیاب ہو گئے، ان کو خدا کی طرف سے وہ انعامات دیے جائیں گے جو کسی دوسری مخلوق کو نہ ملے ہوں۔ وہ خدا کے مقرب بندے قرار پائیں گے جو ابدی طور پر راحت اور آرام میں رہیں گے۔ ان کو وہ خوشیاں ملیں گی جو کبھی ختم نہ ہوں۔

نیت

اسلام میں سب سے زیادہ اہم چیز نیت ہے۔ کوئی عمل محض اپنے ظاہر کی بنا پر خدا کے یہاں قابل قبول نہیں ہوتا۔ خدا صرف اس عمل کو قبول کرتا ہے جس کو کرنے والے نے صحیح نیت سے کیا ہو۔ بری نیت کے ساتھ کیے ہوئے عمل کو خدا رد کر دیتا ہے۔

صحیح نیت یہ ہے کہ وہ کام خدا کے لیے کیا گیا ہو۔ اس کو کرنے سے خدا کی رضا مقصود ہو۔ آدمی جو کام کرے اس احساس کے ساتھ کرے کہ اس کا اجر اس کو خدا کے یہاں پانا ہے۔

اس کے برعکس بری نیت یہ ہے کہ آدمی بظاہر دین کا عمل کرے مگر وہ اس سے دنیا کا فائدہ لینا چاہتا ہو۔ وہ جو کام کرے اس لیے نہ کرے کہ لوگ اس کو دیکھ کر اس کی تعریف کریں گے۔ لوگوں کے درمیان اس کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوگی۔ وہ لوگوں کے درمیان عزت کا مقام حاصل کرے گا۔

نیت کا تعلق آدمی کی اندرونی سوچ یا اندرونی کیفیات سے ہے۔ عام لوگ کسی انسان کے اندر کی سوچ یا اندر کی کیفیات کو نہیں جان سکتے۔ مگر خدا کو ہر انسان کے اندر کا حال پوری طرح معلوم ہے۔ وہ جانتا ہے آدمی کے دماغ میں کیا ہے اور اس کے اندر کس قسم کے جذبات ہیں۔ کسی کے عمل کے بارہ میں عام لوگ غلط فہمی میں پڑ سکتے ہیں، مگر خدا کو ہر بات کا پورا علم حاصل ہے۔ وہ اپنے علم کے مطابق ہر ایک سے معاملہ کرے گا۔ اور ہر ایک کو وہی بدلہ دے گا جس کا وہ فی الواقع مستحق ہے۔

نیت کی حیثیت حقیقت اور معنویت کی ہے۔ جو چیز اپنی اصل حقیقت یا اپنی اصل معنویت کو کھو دے وہ چیز بے کار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جو عمل بری نیت یا ناقص نیت کے ساتھ کیا جائے وہ بے قیمت ہے۔ اس کی کوئی اہمیت نہ انسانوں کی نظر میں ہو سکتی ہے اور نہ خدا کی نظر میں۔

کسی چیز کی قیمت اس وقت ہے جب کہ وہ خالص ہو اس میں کسی اور چیز کی ملاوٹ نہ ہو صحیح نیت کے ساتھ کیا ہوا عمل خالص عمل ہے صحیح نیت کے بغیر کیا ہوا عمل غیر خالص عمل۔

آخرت

انسان ایک ابدی مخلوق ہے۔ تاہم اس کی عمر کو خدا نے دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ اس کی عمر کا بہت چھوٹا سا حصہ موجودہ دنیا میں رکھ دیا ہے، اور اس کا بقیہ تمام حصہ موت کے بعد آنے والی آخرت میں۔ موجودہ دنیا عمل کی جگہ ہے، اور آخرت کی دنیا عمل کا انجام پانے کی جگہ۔

موجودہ دنیا ناقص ہے اور آخرت کی دنیا ہر اعتبار سے کامل۔ آخرت ایک لامحدود دنیا ہے۔ وہاں تمام چیزیں اپنی معیاری حالت میں مہیا کی گئی ہیں۔

خدا نے اپنی جنت کو اسی آخرت کی دنیا میں رکھا ہے۔ جنت ہر قسم کی نعمتوں سے بھری ہوئی ہے۔ موجودہ دنیا میں جو لوگ نیکی اور خدا پرستی کا ثبوت دیں گے وہ آخرت کی دنیا میں اس حال میں داخل ہوں گے کہ ان کے لیے جنت کے دروازے ابدی طور پر کھول دیے جائیں گے۔

لیکن جو لوگ موجودہ دنیا میں خدا کو بھول جائیں یا خدا کے مقابلہ میں سرکشی کا طریقہ اختیار کریں وہ خدا کے نزدیک مجرم ہیں۔ ایسے تمام لوگ آخرت کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔

موجودہ دنیا میں خدا غیب کی حالت میں ہے۔ آخرت کی دنیا میں وہ اپنی تمام قوتوں کے ساتھ سامنے آجائے گا۔ اس وقت تمام انسان خدا کے سامنے جھک جائیں گے۔ مگر اس وقت کا جھکنا کسی کے کام نہیں آئے گا۔ خدا کے سامنے وہ جھکنا مطلوب ہے جو دیکھنے سے پہلے موجودہ دنیا میں ہو۔ آخرت میں خدا کو دیکھ لینے کے بعد جھکنا کسی کو کچھ فائدہ دینے والا نہیں۔

موت آدمی کی زندگی کا خاتمہ نہیں وہ اگلے یا دوسرے مرحلۂ حیات کا آغاز ہے۔ موت وہ درمیانی مرحلہ ہے جبکہ آدمی آج کی وقتی دنیا سے نکل کر کل کی مستقل دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ دنیا کے مسافر خانہ سے نکل کر آخرت کی ابدی قیام گاہ میں داخل ہو جاتا ہے آخرت کا یہ مرحلہ ہر ایک کی زندگی میں لازماً پیش آنے والا ہے۔ کوئی بھی نہیں جو اپنے آپ کو آخرت کی پیشی سے بچا سکے۔

جنت، دوزخ

جنت خدا کے انعامات کی جگہ ہے۔ اور دوزخ وہ جگہ ہے جہاں ان لوگوں کو داخل کیا جائے گا جن کے بارے میں خدا کی عدالت میں سزا کا فیصلہ ہوا ہو۔

موجودہ دنیا میں ہر قسم کی نعمتیں ہیں، مگر وہ ناقص صورت میں ہیں۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں یہ تمام نعمتیں اپنی کامل صورت میں موجود ہوں گی۔ موجودہ دنیا ایک غیر معیاری دنیا ہے اور جنت کی دنیا کامل طور پر ایک معیاری دنیا۔ جو لوگ موجودہ دنیا کی آزمائشوں میں پورے اتریں وہ جنت کی ابدی دنیا میں داخل کیے جائیں گے، جہاں ان کے لیے آرام ہی آرام ہوگا اور خوشی ہی خوشی۔

جنت میں آدمی کو مادی نعمتوں کے ساتھ ذہنی سکون اور قلبی اطمینان بھی مکمل طور پر حاصل ہوگا۔ ایک طرف وہاں مادی نعمتوں کی تکمیل کر دی جائے گی اور دوسری طرف وہ تمام حالات ختم کر دیے جائیں گے جو دنیا میں بے چینی اور پریشانی کا سبب ہوتے ہیں مثلاً — بڑھاپا، بیماری، حادثہ، موت، وغیرہ۔

ہر آدمی پیدائشی طور پر ایک آئیڈیل دنیا کا طالب ہے۔ ہر آدمی اپنے خوابوں کی ایک دنیا اپنے ذہن میں بسائے ہوئے ہے۔ یہ دنیا کسی کو موجودہ زندگی میں نہیں ملتی۔ موت کے بعد یہ دنیا ان خوش نصیب انسانوں کو ملے گی جنھوں نے موت سے پہلے کی زندگی میں اس کا استحقاق ثابت کیا ہو۔

دوزخ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جنت اگر ہر قسم کے آرام کی جگہ ہے تو دوزخ ہر قسم کی تکلیفوں کی جگہ۔ جنت اگر باغِ کائنات کا پھول ہے تو دوزخ اس کائنات کا کانٹا۔

جو لوگ دنیا کی زندگی میں خدا کی مرضی کو چھوڑ کر اپنی خواہشوں پر چلیں، جو لوگ اخلاقی حدود کو توڑیں اور سرکشی کا طریقہ اختیار کریں، جو لوگ نہ خدا کا حق ادا کریں اور نہ بندوں کا حق، ایسے لوگ موت کے بعد دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے تاکہ وہاں ابدی طور پر اپنی بدکرداری کی سزا بھگتتے رہیں۔

دوزخ والوں کو بچانے کے لیے وہاں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ ان کے تمام مددگار ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ وہاں کوئی نہ ہوگا جو خدائی فیصلہ کو ان کے اوپر نافذ ہونے سے روک سکے۔

روحانیت

روحانیت کیا ہے۔ خدا نے اس کو ابدی طور پر گلاب کے پیڑ کے روپ میں دکھا رکھا ہے۔ گلاب کے پیڑ میں کانٹا بھی ہوتا ہے اور پھول بھی۔ نوکیلے کانٹوں کے ساتھ خدا اسی شاخ میں ایک پھول اگاتا ہے۔ جس میں مہک ہو، جس میں رنگ ہو، جو اپنی خوشبو سے دور تک کے لوگوں کو معطر کر دے۔

یہ ہے روحانیت کا قدرتی نمونہ۔ روحانیت نام ہے کانٹوں کے بیچ میں پھول بن کر رہنے کا۔ روحانیت یہ ہے کہ آدمی زندگی کے کانٹوں میں نہ الجھے۔ وہ بھڑکنے والی باتوں پر نہ بھڑکے۔ ناخوشگوار تجربات اس کے اعتدال کو بھنگ نہ کریں۔ دوسروں کا ناپسندیدہ روپ اس کے اندر غصہ اور انتقام کے جذبات نہ پیدا کرے۔ وہ خود اپنے اصول کے تحت جئے۔ اس کی ذہنی سطح اتنی بلند ہو چکی ہو کہ پتھر مارنے والے کا پتھر اس تک پہنچ ہی نہ سکے۔

روحانیت کو قرآن میں ربانیت کہا گیا ہے۔ یعنی رب میں جینا، رب والا بن کر رہنا۔ جو لوگ انسانی جھگڑوں میں جئیں وہ اپنے قریب کی باتوں سے اثر لیتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی روحانیت کبھی ترقی نہیں کرتی۔ مگر جو آدمی اپنے آپ کو اتنا اٹھائے کہ وہ اپنے فکر و خیال کے اعتبار سے ربانی سطح پر جینے لگے وہ لوگوں کی باتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ربانیت کی صورت میں وہ اتنی بڑی چیز پا لیتا ہے کہ ہر دوسری چیز اس کی نظر میں چھوٹی ہو جاتی ہے۔

ایسے آدمی کے اندر یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ گالی سن کر مسکرا دے۔ وہ غصہ دلانے والی بات کو بھلا دے۔ وہ کانٹے کا استقبال پھول کے روپ میں کر سکے۔

روحانی انسان اپنی روحانیت یا ربانیت کی صورت میں اتنی بڑی چیز پا لیتا ہے کہ اس کے بعد کسی اور چیز کی تمنا نہیں رہتی۔ یہ چیز اس کے اندر حسد، خود غرضی اور استحصال کے جذبات کو ختم کر دیتی ہے۔ وہ اتنا زیادہ پا لیتا ہے کہ اس کے بعد کوئی اور چیز پانے کے لیے باقی نہیں رہتی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے مجموعہ سے وہ سماج بنتا ہے جو سورج کی طرح چمکے اور باغ کے روپ میں لہلہائے۔

تقویٰ

تقویٰ کے معنی ہیں پرہیز گاری۔ یعنی دنیا میں احتیاط اور پرہیز کے ساتھ زندگی گزارنا۔ محتاط زندگی کا نام متقیانہ زندگی ہے۔ اور غیر محتاط زندگی کا نام غیر متقیانہ زندگی۔

حضرت عمر فاروق ؓ نے ایک صحابی سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے امیر المومنین کیا آپ کسی ایسے راستے سے گزرے ہیں جس کے دونوں طرف جھاڑیاں ہوں۔ صحابی نے دوبارہ پوچھا کہ ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنے دامن سمیٹ لیے اور اپنے کو اس سے بچاتا ہوا گزر گیا۔ صحابی نے کہا کہ اسی کا نام تقویٰ ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں انسان کی آزمائش کے لیے مختلف قسم کے کانٹے بکھیر دیے گئے ہیں۔ کہیں منفی جذبات کا طوفان ہے۔ کہیں غیر سنجیدہ لوگوں کے چھیڑے ہوئے مسائل ہیں۔ کہیں دنیا کی کشش اپنی طرف کھینچ لینا چاہتی ہے۔ کہیں ایسے ناخوش گوار اسباب ہیں جو آدمی کے ذہن کو درہم برہم کرکے اس کو نیکی کے راستہ سے ہٹا دیں۔

یہ تمام چیزیں گویا کہ زندگی کے راستہ کے دونوں طرف کھڑی ہوئی کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ ہر لحہ یہ اندیشہ ہے کہ انسان کا دامن ان سے الجھ جائے۔ اور پھر آگے بڑھنے کے بجائے وہ انھیں چیزوں میں پھنس کر رہ جائے۔

ایسی حالت میں عقل مند وہ ہے جو دنیا کا راستہ اس طرح طے کرے کہ وہ اپنے دامن کو سمیٹے ہوئے ہو۔ وہ ناموافق چیزوں سے الجھنے کے بجائے ان سے اعراض کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہے۔ ہر حال میں اس کا ذہن یہ ہو کہ اس کو اپنے آپ کو سنبھالنا ہے۔ اس کو بچاؤ کا طریقہ اختیار کرنا ہے نہ کہ الجھاؤ کا طریقہ۔

انسان صحیح فطرت پر پیدا کیا گیا ہے۔ کوئی چیز رکاوٹ نہ بنے تو ہر انسان اپنے آپ صحیح رخ پر اپنا سفر طے کرے گا۔ اس لیے اصل اہتمام کی بات یہ ہے کہ آدمی غیر فطری رکاوٹوں کو اپنے لیے رکاوٹ نہ بننے دے۔ اس کے بعد وہ خود اپنی فطرت کے زور پر صحیح رخ اختیار کرے گا یہاں تک کہ وہ اپنے رب سے جا ملے۔

شکر یہ ہے کہ آدمی خدا کی نعمتوں کا اعتراف کرے۔ یہ اعتراف اصلاً دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر وہ الفاظ کی صورت میں آدمی کی زبان پر آجاتا ہے۔

انسان کو خدا نے بہترین جسم اور دماغ کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کی ضرورت کی تمام چیزیں افراط کے ساتھ مہیا کیں۔ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو انسان کی خدمت میں لگا دیا۔ زمین پر زندگی گزارنے یا تمدن کی تعمیر کرنے کے لیے جو جو چیزیں مطلوب تھیں وہ سب وافر مقدار میں یہاں مہیا کر دیں۔

انسان ہر لمحہ ان نعمتوں کا تجربہ کرتا ہے۔ اس لیے انسان پر لازم ہے کہ وہ ہر لمحہ خدا کی نعمتوں پر شکر کرے۔ اس کا قلب خدا کی نعمتوں کے احساس سے سرشار رہے۔

شکر کی اصل حقیقت اعتراف ہے۔ جس چیز کو انسان کے سلسلہ میں اعتراف کہا جاتا ہے اسی کا نام خدا کی نسبت سے شکر ہے۔ اعتراف کا لفظ انسان کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور شکر کا لفظ خدا کے مقابلہ میں۔

شکر تمام عبادتوں کا خلاصہ ہے۔ عبادت کی تمام صورتیں دراصل شکر کے جذبہ ہی کی عملی تصویر ہیں۔ شکر سب سے زیادہ جامع اور سب سے زیادہ کامل عبادت ہے۔ شکر خدا پرستانہ زندگی کا خلاصہ ہے۔

شکر کا تعلق انسان کے پورے وجود سے ہے۔ ابتدائی طور پر آدمی اپنے دل اور اپنے دماغ میں شکر کے احساس کو تازہ کرتا ہے پھر وہ اپنی زبان سے بار بار اس کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے بعد جب شکر کے جذبات قوی ہو جاتے ہیں تو انسان اپنے مال اور اپنے اثاثہ کو اظہار شکر کے طور پر خدا کی راہ میں خرچ کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح اس کا جذبۂ شکر اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی طاقت کو اس خدا کی راہ میں صرف کرے جس نے اس کو وقت اور طاقت کا یہ سرمایہ دیا ہے۔ ہمارا وجود پورا کا پورا خدا کا دیا ہوا ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں جیتے ہیں جو سب کا سب خدا کا عطیہ ہے۔ اسی حقیقت کے اعتراف اور اظہار کا دوسرا نام شکر ہے۔

ذکر

اسلام کی ایک بنیادی تعلیم ذکر ہے۔ ذکر کے معنی یاد کے ہیں یعنی خدا کو یاد کرنا۔ خدا کو بھولنے کی حالت کا نام غفلت ہے اور خدا کو یاد رکھنے کی حالت کا نام ذکر۔

یہ ذکر ایک فطری حقیقت ہے۔ انسان ہر لمحہ ان چیزوں کا تجربہ کرتا ہے جن کا تعلق براہ راست خدا سے ہے۔ وہ سورج اور چاند، دریا اور پہاڑ، ہوا اور پانی کو دیکھتا ہے جو سب کی سب خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اسی طرح تمام مخلوقات جو انسان کے سامنے آتی ہیں وہ سب اس کو خالق کی یاد دلاتی ہیں۔ زمین سے لے کر آسمان تک جو چیزیں ہیں وہ سب خدا کے جمال و کمال کے مظاہر ہیں۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی ہستی کا تعارف ہیں۔

اس طرح جس دنیا میں انسان رہتا ہے اور جن چیزوں کے درمیان وہ صبح و شام گزارتا ہے وہ ہر لمحہ اس کو خدا کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ ان چیزوں سے متاثر ہو کر اس کے دل و دماغ میں ہر لمحہ ربانی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ انھیں کیفیات کے لفظی اظہار کا نام ذکر ہے۔

اسی طرح انسان اپنی زندگی میں بار بار خدا سے تعلق کا تجربہ کرتا ہے۔ وہ اپنے وجود پر غور کرتا ہے تو اس کا دل اس احساس سے بھر جاتا ہے کہ خدا نے اس کو احسن تقویم کے ساتھ پیدا کیا اور ہر قسم کی اعلیٰ صلاحیتیں وافر مقدار میں اسے دے دیں۔ یہ احساسات اس کی زبان پر مختلف انداز میں آتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ذکر کی ایک صورت ہے۔

اسی طرح انسان کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آتے ہیں۔ وہ مختلف قسم کے خوش گوار اور ناخوش گوار تجربات سے گزرتا رہتا ہے۔ ان تجربات کے دوران بار بار وہ خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ بار بار وہ مختلف الفاظ میں خدا کو یاد کرتا ہے۔

اسی طرح روزمرہ کی عبادتوں کے درمیان وہ مختلف کلمات کو اپنی زبان سے ادا کرتا ہے۔ یہ کلمات کبھی قرآن و حدیث سے ماخوذ ہوتے ہیں اور کبھی خدا کی خدائی کے اعتراف میں بے ساختہ طور پر اس کی زبان سے جاری ہو جاتے ہیں۔ یہ سب خدا کا ذکر ہے۔

نماز

نماز خدا کی عبادت ہے۔ وہ روزانہ پانچ وقت کے لیے فرض ہے۔ جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی کے لیے اس کا انتظام مسجدوں میں کیا جاتا ہے۔

نماز میں سب سے پہلے وضو کیا جاتا ہے۔ چہرہ اور ہاتھ اور پاؤں کو پانی سے دھو کر نمازی اپنے اندر اس احساس کو جگاتا ہے کہ وہ ہمیشہ پاکیزہ زندگی گزارے گا۔ پھر وہ اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) کہہ کر نماز کے عمل میں داخل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اقرار کرتا ہے کہ بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہے۔ آدمی کے لیے صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ چھوٹا اور متواضع بن کر دنیا میں رہے۔

نماز میں آدمی قرآن کے کچھ حصوں کو پڑھ کر اپنے بارہ میں خدا کے احکام کو ذہن میں تازہ کرتا ہے۔ پھر وہ رکوع اور سجدہ کر کے عمل کی زبان میں یہ کہتا ہے کہ میرے لیے صرف ایک ہی رویہ درست ہے، اور وہ یہ کہ میں خدا کا تابع بن کر دنیا میں زندگی گزاروں۔

نماز کا عمل جب ختم ہوتا ہے تو تمام نمازی دائیں اور بائیں منہ پھیر کر کہتے ہیں: السلام علیکم ورحمۃ اللہ (تمہارے اوپر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت ہو) یہ اس بات کا اعلان ہے کہ نماز کے ذریعہ تربیت پا کر اب تمام نمازی اس طرح دنیا میں داخل ہو رہے ہیں کہ ان کے دل میں دوسروں کے لیے رحمت اور امن کے سوا کوئی دوسرا جذبہ نہیں۔ وہ سماج کا امن پسند ممبر بن کر رہیں گے۔ وہ کسی کے ساتھ بدخواہی کا عمل نہیں کریں گے۔

نماز ایک اعتبار سے خدا کی عبادت ہے۔ وہ خدا کی خدائی کا اعتراف ہے۔ وہ ہر قسم کی بڑائی کو صرف خدا کے لیے خاص کرتے ہوئے اس کے آگے جھک جانا ہے۔

دوسرے اعتبار سے نماز آدمی کو اس کے لیے تیار کرتی ہے کہ لوگوں کے درمیان وہ سچا انسان بن کر رہے۔ وہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تواضع اور ہمدردی کا انداز اختیار کرے — نماز خدا کے ساتھ بھی نمازی کے معاملہ کو درست کرتی ہے اور انسان کے ساتھ اس کے معاملہ کو بھی۔

روزہ

روزہ ایک سالانہ عبادت ہے۔ وہ ہر سال رمضان میں پورے ایک مہینہ تک رکھا جاتا ہے۔ روزہ میں آدمی خدا کے حکم کے تحت سحر سے لے کر سورج ڈوبنے تک کھانے پینے سے رک جاتا ہے۔ اور اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ ذکر و عبادت میں مشغول کرتا ہے۔ روزہ کا یہ عمل اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ آدمی کی مادیت کم ہو اور اس کی روحانیت ترقی کرے۔ وہ دنیا میں روحانی زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔

روزہ آدمی کے اندر شکر کا جذبہ ابھارتا ہے۔ کھانے اور پانی سے محرومی اس کو ان نعمتوں کی اہمیت بتاتی ہے۔ پھر جب بھوک اور پیاس کا تجربہ کرکے شام کو وہ کھاتا اور پیتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ کھانا اور پانی کتنی قیمتی چیز ہے جو اس کو خدا کی طرف سے مہیا کی گئی ہے۔ یہ تجربہ اس کے شکر کے احساس کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے۔

روزہ آدمی کے اندر اخلاقی ڈسپلن پیدا کرتا ہے۔ چند چیزوں پر روک لگا کر آدمی کو اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ دنیا میں اس کو پابند زندگی گزارنا ہے نہ کہ بے قید زندگی۔

روزہ گویا ایک قسم کا اسپیڈ بریکر ہے۔ آدمی پر ایک مہینہ کے لیے روک لگا کر روزہ بتاتا ہے کہ وہ اسی طرح پورے سال اور پوری عمر روک تھام والی زندگی بسر کرے۔ وہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کے باہر جانے کی کوشش نہ کرے۔

روزہ رکھ کر آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ ذکر اور عبادت اور تلاوت قرآن میں مشغول کرتا ہے۔ یہ گویا خدائی اعمال کی تاثیر کو بڑھانے کی ایک تدبیر ہے۔ اس طرح آدمی ذکر اور عبادت اور تلاوت قرآن کے اثرات کو مزید اضافہ کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

روزہ ایک تربیتی کورس ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک مہینہ خصوصی تربیت دے کر آدمی کو اس قابل بنا دیا جائے کہ سال بھر وہ خدا پرست اور انسان دوست بن کر زندگی گزار سکے۔

زکاۃ

زکاۃ سے مراد وہ متعین رقم ہے جو ایک مال والا آدمی اپنے مال میں سے سال کے آخر میں نکالتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے کمائے ہوئے مال کو پاک کرتا ہے۔ ایک جزئی حصہ کو خدا کی راہ میں دے کر بقیہ حصہ کو وہ اپنے لیے جائز طور پر قابل استعمال بنا لیتا ہے۔

اپنی کمائی میں سے زکاۃ کی رقم نکالنا اس بات کا عملی اعتراف ہے کہ اصل دینے والا خدا ہے۔ جب دینے والا خدا ہے تو بندے کو چاہیے کہ اس کے دیے ہوئے میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرے۔

زکاۃ کا قانون یہ ہے کہ مال والوں سے لے کر اس کو بے مال والوں میں دینا۔ یہ دولت کی گردش میں پیدا ہونے والی نابرابری کو دوبارہ برابر کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اس طرح مال والوں کو یاد دلایا جاتا ہے کہ تمہارے اوپر ان لوگوں کا مالی حق ہے جن کو تقسیم میں کم حصہ ملا یا سرے سے کچھ نہیں ملا۔

زکاۃ کا تعلق اخلاقیات سے بھی جڑا ہوا ہے۔ زکاۃ ایک طرف دینے والے کے اندر سے بخل اور خود غرضی کے جذبات کو نکالتی ہے، وہ دینے والے کے دل میں فیاضی اور انسان دوستی کی روح پیدا کرتی ہے۔

دوسری طرف پانے والے کے لیے زکاۃ کا فائدہ یہ ہے کہ دوسروں کو وہ اپنا بھائی اور غم گسار سمجھنے لگے۔ دوسروں کے بارے میں اس کے دل میں حسد کے جذبات نہ ابھریں۔ بلکہ اس کے بجائے اس کے دل میں دوسروں کے لیے محبت کے جذبات پیدا ہوں۔

یہ زکاۃ چوں کہ اللہ کی راہ میں نکالی جاتی ہے اسی لیے وہ دوسری عبادتوں کی طرح ایک عبادت ہے۔ بظاہر وہ انسانوں کے درمیان تقسیم کی جاتی ہے، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ انسان کو خدا سے جوڑنے والی ہے، وہ انسان کو خدا سے قریب کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

زکاۃ اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے عبادت ہے اور اپنی خارجی تعمیل کے اعتبار سے خدمت۔

حج

حج ایک عبادت ہے۔ وہ استطاعت رکھنے والے کے اوپر زندگی میں ایک بار کے لیے فرض ہے۔ جو آدمی استطاعت نہ رکھتا ہو اس کے اوپر حج کی فرضیت نہیں۔

حج میں آدمی اپنے وطن سے نکل کر حجاز جاتا ہے۔ وہاں وہ مکہ میں داخل ہو کر کعبہ کا طواف کرتا ہے۔ وہ صفا اور مروہ نام کی دو پہاڑیوں کے درمیان سعی کرتا ہے۔ عرفات میں قیام کرتا ہے۔ جمار پر پتھر مارتا ہے۔ قربانی کرتا ہے۔ اس طرح کے مختلف عبادتی رسوم ذوالحجہ کے مہینہ میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اسی کا نام حج ہے۔

یہ حج بندے کی طرف سے اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالے کرنے کی ایک علامتی صورت ہے۔ ان اعمال کے ذریعہ بندہ یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے لیے سونپ رہا ہے۔ اس کی زندگی صرف خدا کے گرد گھومے گی۔ وہ خدا کی خاطر ہر قربانی کے لیے تیار رہے۔

حج کے عمل کے دوران آدمی کعبہ کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یاد کرتا ہے۔ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی یادگاروں کو دیکھتا ہے۔ وہ اپنے کچھ ایام کو اس ماحول میں گزارتا ہے جہاں اسلام کی ابتدائی تاریخ بنائی گئی۔

اس طرح حج ایک آدمی کو خدا سے اور خدا کے پیغمبروں سے جوڑنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ خدا کے نیک بندوں کی زندگیوں کی یاد دلاتا ہے۔ وہ اسلام کی تاریخ سے زندہ تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اسی کے ساتھ حج ساری دنیا کے خدا پرستوں کو متحد کرتا ہے۔ وہ دنیا بھر کے ایمان والوں کے ذہن میں اس حقیقت کو تازہ کرتا ہے کہ ان کی نسلیں اور ان کی قومیتیں خواہ الگ الگ ہوں، مگر ایک خدا پر عقیدہ ان کے عالمی اتحاد کی مضبوط بنیاد ہے۔ وطن کے اعتبار سے وہ خواہ کتنے ہی مختلف ہوں مگر ایک خدا کا پرستار ہونے کے اعتبار سے وہ سب کے سب ایک ہیں اور ہمیشہ ایک رہیں گے۔ حج اصلاً خدا کی عبادت ہے مگر عملی اعتبار سے اس میں دوسرے بہت سے ملّی فائدے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک ملّی اتحاد ہے۔

اخلاق

اخلاق سے مراد باہمی سلوک ہے۔ اخلاق اس برتاؤ کا نام ہے جو روزمرہ کی زندگی میں ایک آدمی دوسرے آدمی کے ساتھ کرتا ہے۔

اس اخلاق کا اصول کیا ہو۔ اس کا سادہ اصول یہ ہے کہ —— تم دوسروں کے لیے وہی چاہو جو تم اپنے لیے چاہتے ہو، تم دوسروں کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو جیسا برتاؤ تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ وہ میٹھے بول کو پسند کرتا ہے۔ اس لیے ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ دوسروں سے بولے تو میٹھے انداز میں بولے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ دوسرا اس کی راہ میں کوئی پرابلم نہ کھڑا کرے، اس لیے ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ دوسروں کی راہ میں کوئی پرابلم کھڑا کرنے سے اپنے آپ کو بچائے۔

ہر آدمی چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کا معاملہ کریں۔ اس لیے ہر آدمی کو یہ کرنا چاہیے کہ جب بھی اس کا سابقہ دوسروں سے پڑے وہ ان سے ہمدردی اور تعاون کا معاملہ کرنے کی کوشش کرے۔

اخلاق کا یہ معیار انتہائی سادہ اور فطری ہے۔ یہ اتنا سادہ ہے کہ ہر آدمی اس کو جان سکتا ہے خواہ عالم ہو یا جاہل، حتیٰ کہ ایک اندھا یا معذور آدمی بھی نہایت آسانی کے ساتھ یہ سمجھ سکتا ہے کہ کیا چیز اس کے لیے پسندیدہ ہے اور کیا چیز ناپسندیدہ، اس حدیث نے انسانی اخلاق کا ایسا معیار دے دیا کہ جس کو سمجھنے سے کوئی شخص بھی عاجز نہیں ہو سکتا اسی طرح اسلام نے ہر آدمی کو اس کے اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں یہ بتا دیا کہ وہ لوگوں سے معاملہ کرنے میں کس قسم کا سلوک کرے اور کس قسم کا سلوک نہ کرے۔

حدیث میں ہے کہ لوگوں میں سب سے اچھا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو۔ اس کے مطابق اچھا انسان بننا کوئی پراسرار معاملہ نہیں، اس کا سادہ فارمولا یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دوہرے معیار سے بچالے۔ ایسا کرنے کے بعد وہ اپنے آپ اعلیٰ انسانی اخلاق کا مالک بن جائے گا۔

صبر

صبر کا مطلب ہے رکنا، اپنے آپ کو تھامنا۔ انسان کا مقصد یہ ہے کہ وہ اونچے آدرشوں کے مطابق دنیا میں زندگی گزارے۔ مگر دنیا میں قدم قدم پر ایسی ناپسندیدہ باتیں سامنے آتی ہیں جو آدمی کو بھٹکا دیں، جو آدمی کے نشانہ کو اصل مقصد سے ہٹا کر دوسری طرف کر دیں۔

ایسی حالت میں آدمی اگر ایسا کرے کہ وہ ہر بھڑکنے والی بات پر بھڑک اٹھے، وہ ہر ناموافق چیز سے الجھ جائے تو وہ اپنے مقصد کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ وہ غیر متعلق چیزوں میں الجھ کر رہ جائے گا۔

اس مسئلہ کا واحد حل صبر ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو جب کسی کڑوے تجربہ سے سابقہ پیش آئے تو وہ بھڑک اٹھنے کے بجائے برداشت کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ جھٹکے کو سہتے ہوئے سچائی کے راستہ پر آگے بڑھ جائے۔

یہ صبر ایک طرف باہر کی دنیا میں پیش آنے والے مسائل کا عملی حل ہے۔ دوسری طرف وہ آدمی کے لیے اپنی شخصیت کی تعمیر کا ذریعہ ہے۔ صبر نہ کرنے والے کی شخصیت منفی رجحانات کے کے درمیان پرورش پاتی ہے، اور جو آدمی صبر کرلے اس کی شخصیت مثبت رجحانات کے درمیان پرورش پانے لگتی ہے۔

صبر پسپائی نہیں ہے۔ صبر کا مطلب جوش والے راستہ کو چھوڑ کر ہوش والے راستہ کی طرف اقدام کرنا ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی نازک مواقع پر اپنے جذبات کو تھامے۔ وہ اپنی عقل کو استعمال کرکے زیادہ مفید سمت میں اپنے عمل کا میدان تلاش کرلے۔

موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں ہر شخص کو لازماً ناخوش گوار باتوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ناقابل مشاہدہ مناظر اس کے سامنے آتے ہیں۔ اس کو ناقابل سماعت آوازیں سننی پڑتی ہیں۔ ایسی حالت میں الجھاؤ کا طریقہ اختیار کرنے کا نام بے صبری ہے اور اعراض کا طریقہ اختیار کرنے کا نام صبر۔ موجودہ دنیا میں کامیابی صرف ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو ناخوش گوار مواقع پر صبر کا طریقہ اختیار کریں۔

سچ بولنا

مومن ایک سچا انسان ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں وہی بات کہتا ہے جو واقعہ کے مطابق ہو۔ مومن اس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ جھوٹ بولے اور جو چیز سچ ہے اس کا اظہار نہ کرے۔ سچ بولنا کیا ہے۔ سچ بولنا یہ ہے کہ آدمی کے علم اور اس کے بول میں تضاد نہ ہو۔ وہ جو کچھ جانتا ہے وہی بولے اور جو وہ بول رہا ہے وہ وہی ہو جو اس کے علم میں آیا ہو۔ اس کے برعکس جھوٹ یہ ہے کہ آدمی کا علم اس کو ایک بات بتاتا ہو مگر اپنی زبان سے وہ کسی دوسری بات کو بیان کرتا ہو۔

سچائی مومن کے کردار کا ایک اعلیٰ ترین پہلو ہے۔ مومن ایک بااصول انسان ہوتا ہے۔ اور بااصول انسان کے لیے اس کے سوا کوئی اور رویہ درست نہیں کہ وہ جب بھی بولے تو سچ بولے۔ سچائی کے خلاف بولنا اس کے لیے کسی حال میں ممکن نہیں۔

خدا کی دنیا پوری کی پوری سچائی پر قائم ہے۔ یہاں ہر چیز اپنے آپ کو اسی روپ میں ظاہر کرتی ہے جو کہ حقیقۃً اس کا روپ ہے۔ سورج، چاند، دریا، پہاڑ، درخت، ستارے اور سیارے سب کے سب سچ پر قائم ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ویسا ہی بتاتے ہیں جیسا کہ وہ حقیقۃً ہیں۔ خدا کی وسیع دنیا میں کوئی بھی چیز جھوٹ پر قائم نہیں۔ کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس کی حقیقت کچھ اور ہو اور وہ اپنے آپ کو کسی اور صورت میں ظاہر کرے۔

یہی فطرت کا کردار ہے جو آفاقی سطح پر پھیلا ہوا ہے۔ مومن بھی عین اسی کردار کا حامل ہوتا ہے وہ جھوٹ اور دوعملی سے مکمل طور پر پاک ہوتا ہے۔ مومن سراپا سچائی ہوتا ہے۔ اس کا پورا وجود سچائی میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ اندر سے باہر تک ایک سچا انسان ہے۔

سچ بولنا مومن کے لیے صرف ایک پالیسی نہیں بلکہ وہ اس کا دین ہے۔ سچائی کے معاملہ میں سمجھوتہ کرنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ وہ سچ بولتا ہے کیوں کہ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ سچ بولتا ہے اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ سچ نہ بولنا اپنی ذات کی نفی ہے، اور جو چیز خود اپنی ذات کی نفی ہے اس کا ارتکاب کسی بھی شخص کے لیے ممکن نہیں۔

وعدہ

اجتماعی زندگی میں باہمی معاملات کرتے ہوئے بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے کوئی وعدہ کرتا ہے۔ ایسا وعدہ بظاہر دو انسانوں یا دو گروہوں کے درمیان ہوتا ہے۔ مگر اس میں تیسرا فریق خدا ہوتا ہے جو گواہ کی حیثیت سے لازمی طور پر اس میں موجود رہتا ہے۔ اس لیے ہر وعدہ ایک خدائی وعدہ بن جاتا ہے۔

اسی لیے مومن وعدہ کے بارے میں نہایت حساس ہوتا ہے۔ اس کا یہ یقین کہ ہر وعدہ جو دو آدمیوں کے درمیان کیا جائے وہ خدا کی نگرانی میں ہوتا ہے اور خدا کے یہاں اس کا حساب ہوگا۔ یہ یقین اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ وعدہ کے بارے میں حد درجہ ذمہ دار ہو۔ جب وہ کسی سے ایک وعدہ کرلے تو لازماً وہ اس کو پورا کرے۔

جس سماج میں لوگ اس صفت کے حامل ہوں کہ وہ وعدہ ضرور پورا کریں۔ اس سماج کا ہر فرد قابل پیشین گوئی کردار کا حامل بن جاتا ہے۔ ایسے سماج میں وہ خاص صفت آجاتی ہے جو بقیہ کائنات میں وسیع پیمانہ پر موجود ہے۔ اس کائنات کا ہر جزء حد درجہ صحت کے ساتھ اپنا عمل کر رہا ہے۔ مثلاً سیاروں اور ستاروں کی گردش کے بارے میں پیشگی طور پر جانا جاسکتا ہے کہ وہ اگلے سو سال بعد یا ہزار سال بعد کہاں ہوں گے۔ اسی طرح پانی کے بارے میں پیشگی طور پر یہ معلوم ہے کہ وہ کتنے درجہ کی حرارت پر ابلنے لگے گا۔ اسی طرح پوری کائنات قابل پیشین گوئی کردار کی حامل بن گئی ہے۔

جس سماج میں لوگ وعدہ پورا کرنے والے بن گئے ہوں اس سماج میں اپنے آپ بہت سی دوسری خوبیاں پرورش پانے لگتی ہیں۔ مثلاً ایسے سماج میں لین دین کے جھگڑے نہیں ہوتے۔ ایسے سماج میں ایک دوسرے پر اعتماد کی فضا قائم ہوجاتی ہے۔ ایسے سماج میں ہر آدمی سکون کی حالت میں ہوتا ہے کیوں کہ اس کو یہ اندیشہ نہیں ہوتا ہے کہ اس کو دوسروں کے ساتھ وعدہ خلافی کا معاملہ پیش آئے گا

وعدہ پورا کرنا اعلیٰ ترین اخلاقی صفت ہے۔ اور ایمان آدمی کو اسی اعلیٰ ترین اخلاقی صفت کا حامل بناتا ہے۔

صفائی

مومن ایک پاکیزہ انسان ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ایمان اس کی روح کو پاکیزہ بناتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کا ظاہر بھی پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ اس کا ایمانی مزاج اس کو ایک صفائی پسند انسان بنا دیتا ہے۔

مومن اپنی نماز کے لیے روزانہ کم از کم پانچ وقت ہاتھ، پاؤں اور چہرہ کو دھوکر وضو کرتا ہے۔ وہ روزانہ ایک بار نہا کر اپنے پورے جسم کو پاک کرتا ہے۔ اس کا کپڑا خواہ سادہ ہو، مگر وہ ہمیشہ دھلا ہوا صاف ستھرا کپڑا پہننا پسند کرتا ہے۔

اسی کے ساتھ وہ پسند کرتا ہے کہ اس کا گھر صاف ستھرا رہے۔ چنانچہ روزانہ گھر کی صفائی، سامان کو قرینہ سے رکھنا، ہر اس چیز سے گھر کو پاک رکھنا جو بدبو یا گندگی پیدا کرنے والی ہو، یہ ساری چیزیں اس کی روزمرہ کی زندگی میں شامل ہو جاتی ہیں۔ مومن کو اس کے بغیر چین نہیں آتا کہ اس کے جسم سے لے کر اس کے گھر تک ہر چیز صاف ستھری رہے۔

صفائی کا یہ ذوق صرف اپنے جسم اور اپنے گھر تک محدود نہیں رہتا۔ اس کا یہ ذوق اس کے گھر کے باہر اس کے پڑوس تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ جہاں رہے اس کا پورا ماحول صاف ستھرا رہے۔ وہ اس کا پورا اہتمام کرتا ہے کہ وہ یا اس کے گھر والے آس پاس کے ماحول کو گندہ کرنے کا سبب نہ بنیں۔ یہی تربیت وہ دوسروں کو بھی دیتا ہے۔ اس کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک وہ اپنے پورے پڑوس میں صفائی ستھرائی کا ماحول قائم نہ کر لے۔

عام لوگوں کے لیے صفائی صرف صفائی ہے۔ مگر مومن کے لیے صفائی عام معنوں میں صفائی بھی ہے اور اسی کے ساتھ وہ ایک عبادت بھی ہے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ خدا صاف ستھرے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

مزید یہ کہ مومن کا ایمان اس بات کی ضمانت ہے کہ جب وہ اپنے جسم کو پاک صاف کرے تو اسی کے ساتھ اس کی روح بھی پاک صاف ہو جائے۔ اس لیے کہ جب وہ جسمانی پاکی کا عمل کرتا ہے تو عین اسی وقت اس کی یہ دعا کہ خدایا تو میرے ظاہر کے ساتھ میرے باطن کو بھی پاک کر دے، اس کی روح کی پاکی کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔

رواداری

رواداری (ٹالرنس) ایک اعلیٰ انسانی اور اسلامی صفت ہے۔ رواداری کا مطلب دوسروں کی رعایت کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں عدم رواداری یہ ہے کہ آدمی صرف اپنے آپ کو جانے، وہ دوسروں کے تقاضے سے بے خبر ہو جائے۔ رواداری ایک اعلیٰ انسانی اسپرٹ ہے۔ اس کو شریعت میں مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً — رِفق، تالیفِ قلب، شفقت علی الخلق، وغیرہ۔

آدمی کے اندر جب خدا پرستی اور سچی دین داری آتی ہے تو وہ خود غرضی کے تحت پیش آنے والی تمام برائیوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں جینے کے بجائے حقائق میں جینے لگتا ہے۔ ایسا انسان عین اپنے مزاج کے مطابق دوسروں کو محبت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ دوسروں سے کسی چیز کا امیدوار نہیں ہوتا اس لیے دوسرے اگر اس سے اختلاف رکھیں یا اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کریں تب بھی وہ دوسروں کا خیرخواہ بنا رہتا ہے۔ تب بھی وہ دوسروں کی رعایت کرتا ہے۔ تب بھی وہ دوسروں کے ساتھ اپنے روادارانہ سلوک کو باقی رکھتا ہے۔

رواداری یہ ہے کہ آدمی ہر حال میں دوسرے کی عزت کرے خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔ وہ ہر حال میں دوسرے کو اعلیٰ انسانی درجہ دے خواہ وہ اس کا اپنا ہو یا غیر۔ وہ دوسرے کے معاملہ کو ہر حال میں ہمدردی کا معاملہ سمجھے۔ خواہ دوسرے کی طرف سے بظاہر غیر ہمدردانہ سلوک کا اظہار کیوں نہ ہوا ہو۔

رواداری کا مطلب دراصل دوسروں کی رعایت کرنا ہے۔ اجتماعی زندگی میں لازمی طور پر ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات پیش آتے ہیں۔ مذہب، کلچر، رواج اور ذاتی ذوق کا فرق ہر سماج میں باقی رہتا ہے۔ ایسی حالت میں اعلیٰ انسانی طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اصول پر قائم رہتے ہوئے دوسرے کے ساتھ رعایت اور توسع کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ اپنی ذات کے معاملہ میں اصول پسند ہو مگر دوسرے کے معاملہ میں روادار۔ وہ اپنے آپ کو اپنے معیار کی روشنی میں جانچے۔ مگر جب دوسروں کا معاملہ ہو تو وہ رواداری اور وسعتِ ظرف کا طریقہ اختیار کرے۔ یہ رواداری انسانی شرافت کا لازمی تقاضا ہے۔ اسلام آدمی کے اندر یہی اعلیٰ شرافت پیدا کرتا ہے۔

اعراض

اسلام کا ایک اہم معاشرتی اصول اعراض (اوائڈنس) ہے۔ یعنی شکایت اور اختلاف کے موقع پر ٹکراؤ سے پرہیز کرنا۔ اشتعال کے موقع پر ردعمل کا طریقہ اختیار نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو مثبت رویہ پر قائم رکھنا۔

ہر مرد و عورت کا مزاج دوسرے مرد و عورت سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک اور دوسرے کے درمیان اور بہت سے فرق ہیں جس کی بنا پر بار بار ایک کو دوسرے سے ناخوش گواری کا تجربہ پیش آتا ہے۔ ایک اور دوسرے کے درمیان اختلاف کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اجتماعی زندگی میں خواہ وہ گھر کے اندر کی ہو یا گھر کے باہر کی، اس طرح کی ناپسندیدہ صورت حال کا پیش آنا بالکل فطری ہے۔ اس کو روکنا کسی حال میں ممکن نہیں۔

اب ایک طریقہ یہ ہے کہ ہر اختلاف سے ٹکراؤ کیا جائے۔ ہر ناخوش گواری سے براہ راست مقابلہ کر کے اس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح کی کوشش غیر فطری ہے۔ اس لیے کہ وہ مسئلہ کو صرف بڑھانے والی ہے۔ وہ ہرگز اس کو گھٹانے والی نہیں۔

اسلام میں ایسے مواقع پر اعراض کی تعلیم دی گئی ہے۔ یعنی ناخوش گوار صورت حال کو مٹانے کے بجائے اس کو برداشت کرنا، اشتعال انگیزی کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس کو نظر انداز کرنا، اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ متحد ہو کر رہنا۔

اسلام کے مطابق یہ صرف ایک معاشرتی طریقہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم ثواب بھی ہے۔ لوگوں کے درمیان اچھے طریقے سے رہنا عام حالات میں بھی ایک ثواب ہے۔ مگر جب کوئی شخص شکایت اور اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ اچھے رویہ پر قائم رہے، وہ اپنے منفی جذبات کو دبا کر مثبت روش کا ثبوت دے تو اس کا ثواب بہت بڑھ جاتا ہے۔ خدا کے یہاں ایسے لوگوں کا شمار محسنین میں کیا جائے گا یعنی وہ لوگ جنھوں نے دنیا کی زندگی میں برتر اخلاق اور اعلیٰ انسانیت کا ثبوت دیا۔

اعراض کے بغیر اعلیٰ انسانی کردار پر قائم رہنا ممکن نہیں۔

اختلاف کے وقت

اختلاف زندگی کا ایک حصہ ہے۔ مختلف اسباب سے لوگوں کے درمیان اختلاف ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح عام لوگوں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے، اسی طرح مخلص اور مومن کے درمیان بھی اختلاف پیش آتا ہے۔ اختلاف کے ہونے کو روکا نہیں جاسکتا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اختلاف کے باوجود آدمی اپنے آپ کو صحیح رویہ پر قائم رکھے۔

مومن وہ ہے جو اختلاف کو نیت کا مسئلہ نہ بنائے۔ اختلاف کو اسی دائرہ تک محدود رکھے جہاں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ ایک معاملہ میں اختلاف کی وجہ سے کسی کو ہر معاملہ میں غلط سمجھ لینا، ایک معاملہ میں اختلاف پیش آنے کے بعد اس کو منافق، بدنیت اور غیر مخلص کہنے لگنا، یہ سراسر غیر اسلامی طریقہ ہے۔

اختلاف پیش آنے کے وقت تعلقات ختم کرنا صحیح نہیں۔ اختلافی مسئلہ پر سنجیدہ بحث جاری رکھتے ہوئے باہمی تعلقات کو بدستور قائم رکھنا چاہیے۔ اختلاف والے شخص سے سلام وکلام بند کرنا یا اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دینا کسی بھی حال میں درست نہیں۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز برائے امتحان ہوتی ہے۔ اسی طرح اختلاف بھی امتحان کے لیے ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اختلاف کے وقت سخت محتاط رہے۔ وہ مسلسل کوشش کرے کہ اس سے کوئی ایسا غلط ردعمل ظاہر نہ ہو جو اللہ کو پسند نہیں۔

اختلاف کے وقت انصاف پر قائم رہنا بلاشبہ ایک مشکل کام ہے۔ مگر اس کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔ اسلام میں ہر درست کام عبادت ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک اعلیٰ عبادت ہے کہ اختلاف اور نزاع کی صورت پیش آنے کے باوجود آدمی اپنے دل کو دشمنی اور انتقام کی نفسیات سے بچائے، اختلاف کے باوجود وہ انصاف کی روش پر قائم رہے۔

اختلاف پیش آنا برا نہیں، برا یہ ہے کہ اختلاف پیش آنے کے بعد آدمی امتحان میں پورا نہ اترے۔ اختلاف کے وقت تقویٰ کی حد میں رہنا عظیم اسلامی عمل ہے، اور اختلاف کے وقت تقویٰ کی حد سے نکل جانا انتہائی سنگین قسم کا غیر اسلامی عمل۔

پڑوسی

پڑوسی کسی انسان کا سب سے قریبی ساتھی ہے۔ گھر کے افـراد کے بعد کسی انسان کا سابقہ سب سے پہلے جن لوگوں سے پیش آتا ہے، وہ اس کے پڑوسی ہیں۔ پڑوسی کو خوش رکھنا، اس سے اچھا تعلق قائم کرنا، خدا پرستانہ زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔

پڑوسی خواہ اپنے مذہب کا ہو یا غیر مذہب کا، خواہ اپنی قوم کا ہو یا دوسری قوم کا، وہ ہر حال میں قابل لحاظ ہے۔ ہر حال میں اس کا وہ حق ادا کیا جائے گا جو شریعت اور انسانیت کا تقاضا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کی برائیوں سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو۔ اس حدیث کے مطابق، کوئی مسلمان اگر اپنے پڑوسی کو ستائے وہ اس طرح رہے کہ اس کے پڑوسی کو اس سے تکلیف پہنچے۔ وہ اپنے پڑوسی کے لیے دلآزاری کا سبب بن جائے تو ایسے مسلمان کا ایمان و اسلام ہی مشتبہ ہو جائے گا۔

کسی آدمی کی انسانیت اور اس کے دینی جذبہ کی پہلی کسوٹی اس کا پڑوسی ہے۔ پڑوسی اس بات کی پہچان ہے کہ آدمی کے اندر انسانی جذبہ ہے یا نہیں اور یہ کہ وہ اسلامی احکام کے بارہ میں حساس ہے یا غیر حساس۔

کسی آدمی کا پڑوسی اس سے خوش ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ آدمی صحیح آدمی ہے۔ اور اگر اس سے اس کا پڑوسی ناخوش ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ آدمی صحیح نہیں۔

پڑوسی کے سلسلہ میں شریعت کے جو احکام ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کی یک طرفہ طور پر رعایت کرے۔ وہ پڑوسی کے رویہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے ساتھ حسن سلوک کی کوشش کرے۔

اچھا پڑوسی بننا خود آدمی کے اچھے انسان ہونے کا ثبوت ہے۔ ایسے ہی انسان کو خدا اپنی رحمتوں میں حصہ دار بنائے گا۔

حقوق العباد

مومن پر ایک ذمہ داری وہ ہے جو خدا کی طرف سے اس پر عاید ہوتی ہے۔ اس کو حق اللہ کہا جاتا ہے۔ یعنی اللہ کو اس کی تمام صفات کمال کے ساتھ ماننا، اس کی عبادت کرنا۔ اس کے آگے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھنا۔ اپنے آپ کو اس پر راضی کرنا کہ جب بھی خدا کا کوئی مطالبہ سامنے آئے گا تو وہ اس کو فوراً مان لے گا اور دل کی آمادگی کے ساتھ اس کی تعمیل کرے گا۔

مومن کی دوسری ذمہ داری وہ ہے جس کو حقوق العباد کہا جاتا ہے، یعنی بندوں کے حقوق۔ یہ وہ ذمہ داری ہے جو اس کے اوپر دوسرے انسانوں کی نسبت سے عائد ہوتی ہے۔ ہر مرد یا عورت جو اس کا رشتہ دار ہو یا جو اس کا پڑوسی ہو یا جو اس کا ہم وطن ہو یا اس کا معاملاتی شریک ہو۔ ہر ایک کا اس کے اوپر کچھ حق ہے۔ ان حقوق کو ادا کرنا مومن کی لازمی ذمہ داری ہے۔ ان حقوق کی ادائیگی کے بغیر وہ خدا کی نصرتوں کا مستحق نہیں بن سکتا۔

حقوق العباد سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی ایک مومن کا سابقہ دوسرے انسانوں کے ساتھ پیش آئے تو وہ اس کے ساتھ وہی سلوک کرے جو اسلامی تقاضے کے مطابق ہو، وہ اس کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہ کرے جو اسلام کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔

مثلاً دوسرے کا احترام کرنا اور اس کو کبھی بے عزت نہ کرنا۔ دوسرے کو نفع پہنچانا۔ اور اگر نفع پہنچانا ممکن نہ ہو تو کم از کم اپنے نقصان سے اس کو بچانا۔ دوسروں سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کرنا اور کبھی اس کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ دوسرے کے مال و جائداد پر ناجائز قبضہ کی کوشش نہ کرنا۔ دوسرے کے ساتھ ہر حال میں انصاف کرنا اور کبھی بے انصافی کا معاملہ نہ کرنا۔ ہر ایک کے ساتھ حسن ظن کا معاملہ کرنا اور کسی کے خلاف بلا دلیل بدگمانی میں مبتلا نہ ہونا۔ ہر ایک کو اس کے مفاد کے مطابق خیر خواہی کا مشورہ دینا اور کبھی کسی کو برا مشورہ نہ دینا، وغیرہ وغیرہ۔

ہر آدمی دوسرے کے بارہ میں اپنی انسانی ذمہ داریوں کو ادا کرے۔ اسی کا نام حقوق العباد ہے۔

تصورانسان

انسان خدا کا بندہ ہے۔ انسان کو خدا نے ایک منصوبہ کے تحت پیدا کیا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں ایک عرصہ تک رکھ کر اسے جانچے۔ پھر ان میں سے جو انسان جانچ میں پورا اترے اس کو قبولیت اور انعام دیا جائے۔ اور جو لوگ اس جانچ میں پورے نہ اتریں ان کو رد کر دیا جائے۔

اس جانچ کی مصلحت کی بنا پر دنیا کی زندگی میں انسان کو آزادی دی گئی ہے۔ یہاں انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے وہ اس کا حق نہیں ہے، وہ صرف اس کے امتحان کا پرچہ ہے۔ ہر صورت حال ایک امتحان ہے، اور ہر صورت حال میں انسان کو اس کے مطابق اپنا مطلوب عمل انجام دینا چاہیے۔

انسان کے لیے صحیح رویہ یہ نہیں ہے کہ اس کی خواہش اور اس کی عقل اس کو جس طرف لے جائے، وہ اس طرف چل پڑے۔ بلکہ صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے خدائی منصوبہ کو سمجھے اور اس پر یقین کرتے ہوئے اس کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔

انسان اپنی موجودہ آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے خدائی نقشہ سے انحراف کر سکتا ہے، مگر وہ اپنے آپ کو غلط روی کے انجام سے بچا نہیں سکتا۔

ایسی حالت میں ہر انسان کا یہ خود اپنا مفاد ہے کہ وہ اپنی زندگی کا رخ متعین کرنے میں بے حد محتاط ہو۔ اپنی مرضی کو رہنما بنانے کے بجائے وہ خدا کی مرضی کو اپنا رہنما بنائے۔ اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑنے کے بجائے وہ خدا کے حکموں کی پابندی میں اپنی زندگی گزارے۔

انسان خدائی تخلیق کا شاہکار ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ خدا کے تخلیقی منصوبہ کے ماتحت ہے۔ انھیں دونوں پہلوؤں کی رعایت میں انسانی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

انسان نے جدید صنعتی تمدن بنانے میں اس طرح کامیابی حاصل کی ہے کہ اس نے فطرت کے قانون کو دریافت کر کے اس کو استعمال کیا۔ اسی طرح اگلی دنیا کی وسیع تر کامیابی انسان کو صرف اس وقت ملے گی جبکہ وہ انسانیت کے بارے میں خدا کے تخلیقی نقشہ کو جانے اور اس کو درست طور پر اختیار کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔

خدمتِ خلق

مومن کے اندر جو اعلیٰ جذبات ہونے چاہئیں ان میں سے ایک خدمتِ خلق ہے۔ یعنی خدا کی مخلوق کے کام آنا۔ لوگوں کی ضروریات کو پوری کرنا۔ کسی صلہ کی امید نہ رکھتے ہوئے ہر ایک کی حاجتیں پوری کرنا۔

دوسروں کے کام آنا دراصل اپنے حق میں خدائی نعمت کا اعتراف کرنا ہے۔ وہی شخص دوسروں کے کام آتا ہے جس کے اندر دوسروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ صفات پائی جا رہی ہوں مثلاً آنکھ والے آدمی کا ایک بے آنکھ والے کے کام آنا، ایک تندرست آدمی کا کسی معذور کے کام آنا، ایک صاحب مال کا بے مال آدمی کے کام آنا۔ ایک صاحب حیثیت آدمی کا کسی بے حیثیت آدمی کے کام آنا۔

ایسے ہر موقع پر جب خدا کی دی ہوئی اپنی کسی حیثیت کی بنا پر آدمی کسی کی مدد کرتا ہے تو وہ ایسا کر کے خدا کے احسان کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ خاموش زبان میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ خدایا جو کچھ میرے پاس ہے وہ تیرا ہی دیا ہوا ہے اب میں دوبارہ اس کو تیری ہی راہ میں خرچ کر رہا ہوں۔ تو ہم دونوں کے لیے اپنی مزید رحمتیں اور برکتیں لکھ دے۔

خدمتِ خلق کا کام کر کے آدمی صرف دوسرے کی مدد نہیں کرتا بلکہ خود اپنی حیثیت کو بڑھاتا ہے۔ ملی ہوئی چیز کو صرف اپنے لیے استعمال کرنا گویا کہ حیوانی سطح پر جینا ہے۔ کیوں کہ حیوان بھی یہی کرتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے صرف اس کا ہے اس میں کسی اور حیوان کا حصہ نہیں۔

مگر انسان کی سطح اس سے بلند ہے۔ انسان تمام مخلوقات میں سب سے افضل ہے۔ انسان کی اعلیٰ سطح کے مطابق جو رویہ ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر نہ جیئے بلکہ ساری انسانیت کو اپنے اندر سمیٹ لے۔ وہ دنیا میں اس طرح زندگی گزارے کہ وہ دوسروں کا خیر خواہ بنا ہوا ہو۔ دوسروں کی خدمت کرنے کے لیے تیار رہتا ہو۔ وہ اپنے اثاثہ میں دوسروں کا حق بھی تسلیم کرے۔

خدمتِ خلق دوسرے لفظوں میں خدمتِ انسانیت ہے اور خدا کی عبادت کے بعد خدمتِ انسانیت سے بڑا کوئی اور کام نہیں۔

مساوات

اسلام کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان کیا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں۔ کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقوی ہے نہ کہ رنگ ونسل۔

انسانوں میں بظاہر رنگ ونسل وغیرہ کے اعتبار سے بہت سے فرق پائے جاتے ہیں مگر یہ فرق پہچان کے لیے ہیں نہ کہ فضیلت کے لیے۔ سماجی اور قومی زندگی کا نظام بنانے کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں میں ایسی خصوصیات ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں پہچانے جا سکیں۔ اس سماجی ضرورت کی بنا پر خدا نے انسانوں میں مختلف اعتبار سے ظاہری فرق رکھے ہیں تاکہ دنیا کا نظام اور آپس کا لین دین آسانی کے ساتھ جاری رہے۔

مگر یہ تمام ظاہری فرق صرف دنیوی پہچان کے لیے ہیں۔ جہاں تک انسان کی حقیقی فضیلت کا تعلق ہے وہ تمام تر داخلی صفات پر منحصر ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ خدا لوگوں کے دلوں کو دیکھتا ہے، وہ ان کے جسموں کو نہیں دیکھتا۔ یعنی جسمانی فرق کا تعلق انسانی معاملات سے ہے۔ خدا کے یہاں صرف ان لوگوں کو اونچا درجہ ملے گا جو اپنی اندرونی خصوصیات کے اعتبار سے قابل قدر ثابت ہوئے ہیں۔

اسلامی نظام کے ہر شعبہ میں اس انسانی برابری کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ نماز میں سارے انسان ایک ساتھ صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ حج میں دنیا بھر کے مسلمان یکساں قسم کے لباس پہن کر حج کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح اسلام کے اجتماعی نظام میں ہر ایک شخص کو وہی درجہ حاصل ہے جو دوسرے شخص کے لیے ہے۔ نہ کسی کے لیے کم اور نہ کسی کے لیے زیادہ۔

اسلام کے نزدیک ہر قسم کی بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہے۔ انسان، آپس کے ظاہری فرق کے باوجود، سب کے سب یکساں طور پر خدا کے بندے ہیں۔ انسان اور خدا کے درمیان یقینی طور پر فرق ہے مگر انسان اور انسان کے درمیان کسی بھی قسم کا کوئی فرق نہیں۔

انسانی برادری

اسلام کے مطابق تمام انسان ایک خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے تمام انسان ایک برادری ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان فرق کرنا خدا کی پسند کے مطابق نہیں۔

انسانیت کا آغاز ایک جوڑے سے ہوا جس کو آدم اور حوا کہا جاتا ہے۔ انسان خواہ کہیں بھی ہوں اور کسی بھی ملک میں ہوں سب کے سب اسی ایک ماں باپ کی نسل سے ہیں۔ رنگ اور زبان اور دوسری چیزوں کا فرق محض جغرافی اسباب سے ہوا ہے۔ جہاں تک اصل کا تعلق ہے تمام انسان آخر کار آدم و حوا کی اولاد ہیں اور انھیں سے نکل کر ساری دنیا میں پھیلے ہیں۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ رنگ اور زبان اور دوسری چیزوں کے فرق کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کو اجنبی نہ سمجھیں، اس کے برعکس یہ ہونا چاہیے کہ ہر ایک کے دل میں دوسرے کے لیے انس ہو۔ ہر ایک کو دوسرے سے محبت ہو۔ ہر ایک دوسرے کے کام آئے۔ سارے انسان وسیع تر معنوں میں مل جل کر اسی طرح رہیں جس طرح لوگ اپنے محدود خاندان میں رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان جو تعلق ہے وہ اجنبیت کا نہیں ہے بلکہ شناسائی کا ہے، دوری کا نہیں ہے بلکہ نزدیکی کا ہے۔ نفرت کا نہیں ہے بلکہ محبت کا ہے۔

جب تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ یہاں نہ کوئی چھوٹا انسان ہے اور نہ بڑا انسان۔ چھوٹے اور بڑے کا فرق انسان اور انسان کے درمیان نہیں ہے بلکہ انسان اور خدا کے درمیان ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، تمام انسان ایک دوسرے کے مقابلہ میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں البتہ خدا کے مقابلہ میں کوئی انسان بڑا نہیں۔ تمام انسان یکساں طور پر خدا کے بندے اور مخلوق ہیں۔ خدا سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ اپنی مخلوقات میں ایک اور دوسرے کے درمیان کسی قسم کا فرق نہیں کرتا۔

تعصب نہیں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے لوگ اسلام کے مخالف ہوگئے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے لگے۔ قرآن میں کئی جگہ اس واقعہ کا ذکر آیا ہے مگر قرآن میں اس کے مقابلہ میں جو تدبیر بتائی گئی وہ یہ نہیں تھی کہ تم ان کی سازشوں کو بے نقاب کرو۔ ان کے خلاف جوابی تحریک چلاؤ۔ ان کی سازش اور عداوت کو ختم کرنے کے لیے ان سے لڑائی کرو۔ اس کے برعکس قرآن میں رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کو صرف ایک ہدایت دی گئی اور وہ توکل علی اللہ تھی۔ یعنی سازشوں اور دشمنیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اللہ پر بھروسہ کرو۔ اس قسم کی باتوں سے بے نیاز ہوکر اپنی مثبت سرگرمیوں کو جاری رکھو۔

یہ ایک بے حد اہم ہدایت تھی۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ذہن کو منفی سوچ سے ہٹاکر مثبت سوچ کی طرف ڈال دیا۔ ایک لفظ میں اس قرآنی تعلیم کا مطلب یہ تھا کہ: دوسروں میں جینے کے بجائے اپنے آپ میں جیئو۔

اگر آپ کے ذہن میں یہ بات بھر جائے کہ دوسرے لوگ آپ کے خلاف سازش کر رہے ہیں تمام لوگ آپ کے دشمن ہوگئے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ہر ایک پر شبہ کرنے لگیں گے۔ حتیٰ کہ خود اپنے فرقہ کا کوئی فرد اگر کوئی رواداری کی بات کرے گا تو آپ اس کو الٹے مفہوم میں لے کر یہ سمجھیں گے کہ یہ دشمنوں کا ایجنٹ ہے۔ اور اس طرح آپ خود اپنے لوگوں کو اپنے سے دور کرکے اپنے آپ کو کمزور کر لیں گے۔

سازش یا عداوتی ذہن کا ایک نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگ موضوعی طرز فکر (آبجکٹیو تھنکنگ) کو کھو دیتے ہیں۔ ان کی ساری سوچ جانبدارانہ اور متعصبانہ بن جاتی ہے۔ وہ حقیقتوں کو ویسا ہی دیکھ نہیں پاتے جیسا کہ وہ ہیں۔ ان کی مثال اس انسان کی ہو جاتی ہے جو اپنی آنکھ میں کسی خرابی کی بنا پر باغ کے صرف کانٹوں کو دیکھ سکے۔ ایسا انسان گویا ایک پھول بلائنڈ انسان ہے۔ اس کو سارا باغ صرف کانٹوں سے بھرا ہوا دکھائی دے گا۔ عین اسی وقت باغ میں ہزاروں خوب صورت پھول کھلے ہوئے موجود ہوں گے مگر وہ ان کو دیکھنے سے محروم رہے گا۔

امن پسندی

مومن ایک امن پسند انسان ہوتا ہے۔ ایمان اور امن پسندی اتنا زیادہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں کہ مومن ہر حال میں امن کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ہر دوسری چیز کو کھونا گوارا کر لیتا ہے۔ مگر وہ امن کو کھونا گوارا نہیں کرتا۔

مومن موجودہ دنیا میں جو زندگی گزارنا چاہتا ہے وہ صرف امن کے حالات ہی میں گزاری جا سکتی ہے۔ امن کی حالت مومن کے لیے موافق ماحول فراہم کرتی ہے اور بے امنی کی حالت مومن کے لیے مخالف ماحول کی حیثیت رکھتی ہے۔

امن ہمیشہ ایک قربانی چاہتا ہے۔ وہ قربانی یہ کہ دوسری طرف سے بدامنی کے اسباب پیدا کیے جائیں تب بھی اس کو نظر انداز کرتے ہوئے امن کی حالت کو برقرار رکھا جائے۔ مومن ہمیشہ اس قربانی کو دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔ وہ ہر نقصان اور زیادتی کو برداشت کرتا ہے تاکہ امن کی حالت نہ ٹوٹے، تاکہ امن کا ماحول مسلسل طور پر قائم رہے۔

مومن اندر سے باہر تک ایک تعمیر پسند انسان ہوتا ہے۔ اس کی تعمیری سرگرمیاں صرف امن کی حالت میں جاری رہ سکتی ہیں۔ اس لیے وہ ہر قیمت دے کر امن کو برقرار رکھتا ہے تاکہ اس کی تعمیری سرگرمیاں بلا روک ٹوک جاری رہیں۔

مومن فطرت کے باغ کا ایک پھول ہے۔ پھول گرم ہوا میں جھلس جاتا ہے اور ٹھنڈی ہوا میں اپنے دلکش وجود کو باقی رکھتا ہے۔ یہی حال مومن کا ہے۔ امن مومن کی لازمی ضرورت ہے۔ امن مومن کی زندگی ہے۔ مومن حرص کی حد تک امن کا خواہش مند ہوتا ہے تاکہ اس کے انسانی درخت پر ایمان کا پھول کھلے اور کسی رکاوٹ کے بغیر فطرت کی فضا میں ظاہر ہو کر اپنی بہاریں دکھا سکے۔

امن کائنات کا دین ہے۔ امن فطرت کا عالمگیر قانون ہے۔ خدا کو امن کی حالت پسند ہے، اس کو بے امنی کی حالت پسند نہیں۔ یہی واقعہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ مومن امن کو پسند کرے۔ وہ کسی حال میں امن کے خاتمہ کو برداشت نہ کر سکے۔

خداپرستانہ زندگی

اسلام کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو ایسا بنایا جائے کہ وہ دنیا میں خداپرستانہ زندگی گزارنے لگے۔ وہ غیر خداپرستانہ زندگی کو مکمل طور پر چھوڑ دے۔ غیر خداپرستانہ زندگی یہ ہے کہ آدمی کی دل چسپیاں خدا کے سوا دوسری چیزوں میں لگی ہوئی ہوں۔ اس کی توجہ کا مرکز مخلوقات ہوں نہ کہ خالق۔ وہ دوستی کرے تو خدا کے لیے کرے اور دشمنی کرے تو خدا کے لیے کرے۔ اس کی سوچ اور جذبات کا مرکز پوری طرح خدا کی ذات بن جائے۔ جب آدمی کسی منزل پر پہنچنے کے لیے ایک راستہ کو اختیار کرتا ہے تو وہ اس کو ضروری سمجھتا ہے کہ وہ دائیں بائیں مڑے بغیر اپنے راستہ پر چلتا رہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر وہ منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہی معاملہ انسان اور خدا کا بھی ہے۔

موجودہ دنیا میں کوئی انسان جب اپنی زندگی شروع کرتا ہے تو ایک راستہ وہ ہوتا ہے جو خدا کی طرف جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسرے بہت سے راستے ہوتے ہیں جو ادھر اُدھر مڑ کر کسی اور منزل کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔ سچے طالب خدا کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اہتمام کے ساتھ خدا والے راستے پر چلتا رہے، وہ ہرگز دائیں اور بائیں جانے والے راستوں کی طرف نہ مڑے۔ جو آدمی خدا کی طرف جانے والے سیدھے راستے پر قائم رہے وہ بلاشبہہ خدا تک پہنچے گا۔ اس کے برعکس جو آدمی اِدھر اُدھر مڑ جائے وہ درمیان میں بھٹک کر رہ جائے گا۔ وہ کبھی خدا تک پہنچنے والا نہیں۔

اِدھر اُدھر کے راستوں پر بھٹکنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہش کا تابع بن جائے۔ وہ ظاہری مفاد کو اہمیت دینے لگے۔ وہ غصہ اور نفرت اور حسد اور انانیت جیسے جذبات کا شکار ہو جائے۔ وہ بے سوچے سمجھے ہر اس سمت میں دوڑ پڑے جو اسے اپنے سامنے کھلی ہوئی دکھائی دیتی ہوں۔

اس کے برعکس خدا والا راستہ یہ ہے کہ آدمی خدا کے احکام پر غور کرے۔ وہ سنجیدہ فیصلہ کے تحت اپنا رخ متعین کرے۔ وہ آخرت کی جواب دہی کی بنیاد پر اپنی زندگی کے معاملات طے کرے نہ کہ محض وقتی فائدہ یا وقتی محرکات کی بنیاد پر۔

صبح وشام

اسلام زندگی کا ایک مکمل پروگرام ہے۔ وہ آدمی کی پوری زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جو اسلام کے دائرہ سے باہر ہو۔

ایک مومن رات کو سو کر صبح سویرے اٹھتا ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنے جسم کو پاک کرتا ہے اور وضو کرکے فجر کی نماز ادا کرتا ہے۔ یہ گویا مومنانہ زندگی کا آغاز ہے جو پاکیزگی اور عبادت سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد صبح سے دوپہر تک کا وقت معاشی دوڑ دھوپ کا وقت ہے۔ تاہم اس دوڑ دھوپ کے دوران مومن مسلسل خدا کو یاد رکھتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں خدا کی مقرر کی ہوئی حد کی پابندی کرتا ہے۔ لین دین میں وہ دیانت داری کا انداز اختیار کرتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے میں وہ پوری طرح اسلامی اخلاق کو اپنائے ہوئے ہوتا ہے۔

اس طرح دوسری نماز کا وقت آجاتا ہے جو دوپہر بعد پڑھی جاتی ہے۔ یہ ظہر کی نماز ہے۔ ظہر کی نماز کی صورت میں وہ اللہ سے اپنے تعلق کو از سر نو زندہ کرتا ہے۔ اپنے جسم اور اپنے روح کو وہ پاک کرکے دوبارہ زندگی کی جدوجہد میں شریک ہو جاتا ہے۔ وہ ایک با اصول انسان کی مانند اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تیسری نماز کا وقت آجاتا ہے جس کو عصر کی نماز کہا جاتا ہے۔ اب وہ پھر نماز کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہ پھر خدا کی رحمتوں میں سے اپنا حصہ لیتا ہے تاکہ اگلے مرحلہ میں وہ اس کے کام آسکے۔

اس طرح مومن کے لمحات گزرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ سورج غروب ہوتا ہے اور چوتھی نماز کا وقت آجاتا ہے جس کو مغرب کی نماز کہا جاتا ہے۔ اب مومن اپنے کام کو چھوڑ کر پھر نماز کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ مقرر قاعدہ کے مطابق نماز ادا کرتا ہے اور اس سے دینی اور روحانی غذا لے کر باہر آتا ہے۔ اس کے بعد وہ نماز سے حاصل کیے ہوئے دینی ذہن کے تحت اپنی ضروریات پوری کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پانچویں نماز کا وقت آجاتا ہے جس کو عشاء کی نماز کہا جاتا ہے۔ عشاء سے فراغت کے بعد مومن اپنے بستر پر جاتا ہے۔ اور اپنے دن بھر کے کام کا احتساب کرتے ہوئے سو جاتا ہے تاکہ صبح سویرے اٹھ کر وہ زیادہ بہتر طور پر اپنے اگلے دن کا آغاز کرسکے۔

عبرت پذیری

مومن کا مزاج عبرت پذیری کا مزاج ہوتا ہے۔ اس کو قرآن میں توسم کہا گیا ہے یعنی واقعات سے نصیحت لینا۔ گردوپیش کی چیزوں سے سبق حاصل کرنا۔

ایمان عین اپنی فطرت کے نتیجہ میں آدمی کو حساس بنا دیتا ہے۔ وہ ہر معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ اس کا مزاج یہ بن جاتا ہے کہ وہ چیزوں کے سطحی پہلو سے گزر کر ان کی گہرائیوں میں اترے۔ جن چیزوں کو دیکھ کر لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں ان میں وہ حکمت کا خزانہ دریافت کر لیتا ہے۔ وہ بصارت سے گزر کر بصیرت کی نعمتوں کو پالیتا ہے۔

یہ ایک عظیم مومنانہ صفت ہے جو آدمی کی شخصیت کو بے پناہ بنا دیتی ہے۔ وہ ہر آن نئی نئی چیزیں دریافت کرتا ہے۔ پھیلی ہوئی کائنات اس کی روح کے لیے رزق کا ایک عظیم دستر خوان بن جاتی ہے۔

سورج کی روشنی میں اس کو معرفت کا نور دکھائی دیتا ہے۔ ہوا کے جھونکوں میں وہ لمس ربانی کے تجربے کرنے لگتا ہے۔ سرسبز درخت اور رنگین پھول اس کو عالم معنویت کی جھلکیاں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ ہر بہار میں ایک اور وسیع تر بہار اور ہر خزاں میں ایک اور بامعنی خزاں کا منظر دیکھنے لگتا ہے۔

اسی طرح تمام انسانی اور غیر انسانی واقعات اس کے لیے نصیحت کا خزانہ بن جاتے ہیں۔ وہ دوسروں کے علم سے اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ دوسروں کی غلطیاں اس کے لیے اپنی اصلاح کا سبب بن جاتی ہیں۔ چیونٹی سے لے کر اونٹ تک اور دریا سے لے کر پہاڑ تک ہر چیز میں وہ ایسے پہلو تلاش کر لیتا ہے جو اس کی بصیرت میں اضافہ کریں۔ جو اس کو نئے تجربات سے آشنا کر کے آخری حد تک بے پناہ بنا دیں۔

جس طرح مادی خوراک جسم کی صحت کے لیے ضروری ہے اسی طرح عبرت اور نصیحت انسان کی روحانی خوراک ہیں۔ مادی خوراک اگر جسمانی صحت کی ضمانت ہے تو نصیحت پذیری روحانی صحت کی ضمانت۔

گھریلو زندگی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سب سے زیادہ بہتر آدمی وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو (حدیث) یہ بات گھر کے ہر فرد کے لیے ہے خواہ وہ عورت ہو یا مرد خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ ہر ایک کو اپنے گھر کے اندر بہتر مرد یا بہتر عورت ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ ہر ایک کو اپنے خاندان کا اچھا ممبر بن کر رہنا ہے۔

گھر کیا ہے۔ گھر سماجی زندگی کا ابتدائی یونٹ ہے۔ بہت سے گھروں کے ملنے سے سماج بنتا ہے۔ گھر کا ماحول اچھا ہو تو سماج کا ماحول بھی اچھا ہوگا اور گھر کا ماحول بگڑ جائے تو سماج کا ماحول بھی یقینی طور پر بگڑ جائے گا۔ اچھے گھروں کے مجموعہ کا دوسرا نام اچھا سماج ہے۔ اس کے برعکس برے گھروں کے مجموعہ کا دوسرا نام برا سماج ہے۔

آدمی کے اچھے ہونے کا معیار سب سے پہلے اس کا گھر ہے۔ کوئی آدمی اگر سماج میں دوسروں کے ساتھ ملنساری دکھائے اور گھر کے اندر وہ سخت مزاجی کے ساتھ رہتا ہو تو اس کو اچھا انسان نہیں کہا جائے گا۔ کیوں کہ اچھی انسانیت کا اصل معیار آدمی کے گھر کی زندگی ہے نہ کہ باہر کی زندگی۔

گھر کی زندگی میں ہر ایک کو کس طرح رہنا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بڑا اپنے چھوٹے کا لحاظ کرے اور جو چھوٹا ہے وہ اپنے بڑے کا احترام کرے۔ مرد گھر کی خواتین کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں۔ اور خواتین مردوں کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ کریں۔ گھر کے تمام افراد کی نظر اپنی ڈیوٹی پر ہو نہ کہ اپنے حقوق پر۔ ہر ایک یہ چاہے کہ وہ اپنے حصہ کا کام کرنے کے ساتھ دوسرے کے کام میں بھی اس کا ہاتھ بٹائے۔ جب بھی گھر میں کوئی مسئلہ پیدا ہو تو ہر ایک کی یہ کوشش ہو کہ مسئلہ مزید نہ بڑھے بلکہ پیدا ہوتے ہی ختم ہو جائے۔

کامیاب گھریلو زندگی کا راز خدمت اور موافقت ہے۔ گھر کا ہر ممبر دوسرے کی خدمت کا جذبہ اپنے اندر رکھتا ہو اور اختلاف یا شکایت کا لحاظ کیے بغیر ہم آہنگی کے ساتھ رہنے کے لیے تیار رہتا ہو۔

عزتِ نفس

عزتِ نفس اور کبرِ نفس میں اتنا کم فرق ہے کہ یہ طے کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ کہاں عزتِ نفس کی حد ختم ہوتی ہے اور کہاں سے کبرِ نفس کی حد شروع ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں عزتِ نفس کو کوئی درجہ نہیں دیا گیا ہے۔

اکثر حالات میں عزتِ نفس دراصل کبرِ نفس ہی کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عزتِ نفس سرے سے کوئی پسندیدہ چیز نہیں۔ عزتِ نفس کی حقیقت اکثر حالات میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کبرِ نفس ہی کا ایک خوب صورت نام ہوتا ہے۔

اسلام میں اصل قابلِ قدر چیز عزتِ نفس نہیں بلکہ کسرِ نفس ہے۔ اسلام میں اعلیٰ اخلاقیات کا معیار تواضع ہے۔ دلیل کے آگے جھک جانا، اپنی غلطی کو مان لینا، اکڑ سے مکمل طور پر خالی ہونا، یہ مومن کی صفات ہیں، اور ان صفات کے ساتھ عزتِ نفس کا کوئی جوڑ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عزتِ نفس کا مزاج آدمی کے لیے تواضع، اعتراف اور حلم میں رکاوٹ بن جاتا ہے، جبکہ اسلام کی اعلیٰ اخلاقی قدر یہی ہے۔

جب دو آدمیوں یا دو گروپ میں نزاع ہو تو نزاع بہت جلد بڑھ کر وقار کا سوال بن جاتی ہے۔ اور جب کسی مسئلہ میں وقار کی صورت پیدا ہو جائے تو اپنے موقف سے ہٹنا آدمی کو بے عزتی معلوم ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ اپنے عزت و وقار کو بچانے کے نام پر وہ اپنے موقف پر اکڑ جاتا ہے۔ اسی اکڑ یا ضد کا خوب صورت نام عزتِ نفس ہے۔

صحیح اسلامی طریقہ یہ ہے کہ نزاع کو کسی بھی حال میں وقار کا سوال نہ بنایا جائے۔ بلکہ صلح جوئی کے ذہن کے تحت اس کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح کے معاملات میں جھکنا ہی اسلام کا مطلوب ہے نہ کہ ضد میں پڑکر اپنے موقف پر اکڑ جانا اور یہ کہہ کر اپنے کو فریب میں مبتلا کرنا کہ میں اپنی عزتِ نفس کو بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں۔

ضد ایک نفسیاتی برائی ہے، جبکہ تواضع اور فروتنی ایک عظیم عبادت ہے۔ خدا ضد اور اکڑ کو ناپسند کرتا ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں تواضع اور فروتنی کو پسند کرتا ہے اور جو لوگ حقیقی معنوں میں تواضع اور فروتنی کا ثبوت دیں ان کے درجات کو دنیا اور آخرت میں بلند کرتا ہے۔

سادگی

مومن وہ ہے جو خدا کو پالے۔ خدا کو پانے والا انسان فطری طور پر اعلیٰ حقیقتوں میں جینے لگتا ہے۔ وہ ظاہری چیزوں سے اوپر اٹھ کر معنوی دنیا میں اپنے لیے دل چسپی کا سامان پالیتا ہے۔

ایسا انسان عین اپنے مزاج کے مطابق سادگی پسند انسان بن جاتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہوجاتا ہے کہ ـــــ سادہ زندگی گزارو، البتہ اپنی سوچ کو اونچا رکھو۔

جو آدمی معنوی حقیقتوں کا ذوق آشنا ہوجائے اس کے لیے ظاہری اور مادی چیزوں میں کوئی لذت باقی نہیں رہتی۔ ایسے آدمی کو سادگی میں لذت ملنے لگتی ہے۔ بناوٹی تکلفات اس کی نظر میں اپنی کشش کھو دیتے ہیں۔ اس کی روح کو فطری چیزوں میں سکون ملتا ہے۔ غیر فطری اور مصنوعی رونقیں اس کو ایسی محسوس ہونے لگتی ہیں جیسے کہ وہ اس کی اندرونی دنیا کو بکھیر رہی ہیں جیسے کہ وہ اس کے روحانی سفر میں ایک رکاوٹ ڈال رہی ہیں۔

سادگی مومن کی طاقت ہے۔ وہ مومن کی مددگار ہے۔ سادگی کا طریقہ اختیار کرکے مومن اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کو غیر متعلق چیزوں میں ضائع نہ کرے۔ وہ اپنی توجہ کو غیر ضروری چیزوں میں الجھانے سے بچائے۔ اور اس طرح اپنے آپ کو کامل طور پر صرف اپنے مقصدِ اعلیٰ کے حصول میں لگا سکے۔

سادگی مومن کی غذا ہے۔ سادگی اس کی تواضع کے لیے ایک لباس بن جاتی ہے۔ سادگی کے ماحول میں اس کی شخصیت زیادہ بہتر طور پر پرورش پاتی ہے۔ سادگی مومن کا حسن ہے۔ سادگی مومن کے لیے زندگی ہے۔ مومن اگر اپنے آپ کو مصنوعی رونقوں میں پائے تو اس کو ایسا محسوس ہوگا جیسے اس کو کسی قید خانہ میں بند کردیا گیا ہے۔

مومن آخری حد تک اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھتا ہے۔ یہ چیز اس کو عبدیت کے احساس میں جینے والا بنا دیتی ہے اور جو انسان عبدیت کے احساس میں جی رہا ہو اس کا مزاج لازمی طور پر سادگی کا مزاج ہوتا ہے۔ غیر سادگی کا انداز اس کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا اس لیے وہ اس کو اختیار بھی نہیں کرسکتا۔

خدائی طریقہ

کائنات میں اَن گنت ستارے اور سیارے ہیں۔ یہ سب کے سب وسیع خلا کے اندر ہر لمحہ گھوم رہے ہیں۔ خلا گویا کہ لاتعداد متحرک اجسام کی دوڑ کا ایک اتھاہ میدان ہے۔ مگر حیرت ناک بات ہے کہ ان ستاروں اور سیاروں میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

اس کا راز کیا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ ہر ستارہ اور ہر سیارہ نہایت پابندی کے ساتھ اپنے اپنے مدار میں گھومتا ہے۔ وہ اپنے مدار سے ذرا بھی باہر نہیں جاتا۔ حرکت کا یہی قانون ہے جو ان ستاروں اور سیاروں کو آپس میں ٹکرانے سے مسلسل روکے ہوئے ہے۔

ٹھیک یہی طریقہ انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کی دوڑ کے لیے بھی خدا نے ایک دائرہ مقرر کر دیا ہے۔ ہر انسان کو اسی محدود دائرہ کے اندر حرکت کرنا ہے۔ جب تمام انسان اپنے اپنے دائرہ میں حرکت کریں تو سماج میں اپنے آپ امن کی حالت قائم ہو جاتی ہے۔ اور جب لوگ اپنی حد میں نہ رہیں بلکہ مقرر حد کو توڑ کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں تو ایسے سماج میں لازماً نزاع شروع ہو جائے گی۔ لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا کر اپنے آپ کو بھی تباہ کریں گے اور دوسرے کی تباہی کا بھی سامان فراہم کریں گے۔

انسان اجتماعی زندگی میں کس طرح رہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ کس طرح معاملہ کرے۔ دوسروں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہو۔ اپنے قول و عمل میں وہ کیا انداز اختیار کرے۔ ان سب باتوں کے لیے خدا نے واضح احکام دیے ہیں۔ اس نے بتا دیا ہے کہ انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ جو لوگ زندگی کے معاملات میں وہ کریں جس کی خدا نے ان کو اجازت دی ہے وہ گویا کہ اپنے مقرر دائرہ کے اندر حرکت کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ وہ کچھ کرنے لگیں جس سے خدا نے روکا ہے تو وہ گویا کہ اپنے مقرر دائرہ سے باہر آ گئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سماج میں ہر قسم کی خرابیاں پیدا کرتے ہیں۔ وہ خود بھی تباہ ہوتے ہیں اور سماج کی تباہی کا بھی سبب بنتے ہیں۔

سچا انسان وہ ہے جو خدا کے مقرر کیے ہوئے دائرہ میں رہتے ہوئے زندگی گزارے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو دنیا میں بھی خدا کی رحمتیں پائیں گے اور آخرت میں بھی خدا کی ابدی رحمتوں سے سرفراز کیے جائیں گے۔

مال

مال زندگی کی ضرورت ہے، مال زندگی کا مقصد نہیں، مال کو اگر اس لیے حاصل کیا جائے کہ اس سے زندگی کی ضروری حاجتیں پوری ہوں تو مال انسان کے لیے بہترین مددگار ہے۔ لیکن مال کو اگر زندگی کا مقصد بنالیا جائے اور بس زیادہ سے زیادہ مال کمانے ہی کو آدمی اپنا سب سے بڑا کام سمجھ لے تو ایسا مال ایک مصیبت ہے، وہ آدمی کو دنیا میں بھی تباہ کرے گا اور آخرت میں بھی۔

انسان کو دنیا میں ایک مدت تک جینا ہے۔ اس لیے اس کو کچھ مادی سامان درکار ہیں جو اس کے لیے جینے کا سہارا بن سکیں۔ یہ سامان مال کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کمائی کر کے مال حاصل کرنا ہر آدمی کے لیے ضروری ہے۔ اس اعتبار سے مال ہر انسان کے لیے ایک قیمتی مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

مگر انسانی زندگی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کو علم حاصل کرنا ہے۔ اس کو روحانی ترقی کے لیے کوشش کرنا ہے۔ اس کو انسانیت کی تعمیر و ترقی میں اپنا مثبت حصہ ادا کرنا ہے۔ اس کو اپنے آپ کو اس طرح بنانا ہے کہ اپنے سماج میں وہ اس کا ایک مفید جزء بن کر رہ سکے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو مقصد زندگی کہا جاتا ہے۔ اس مقصد کا حصول صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ آدمی اپنی طاقت کا ایک حصہ اس میں لگائے۔ مال کمانے کی سرگرمیوں کو ایک حد میں رکھ کر وہ ان کاموں کے لیے اپنے وقت کو فارغ کرے۔

مال انسان کی جسمانی یا مادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ مگر مال اس کی روحانی اور فکری ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کافی نہیں۔ جو آدمی مال ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے اس کا جسم تو مسلسل غذا پاتا رہے گا، مگر اس کی روح فاقہ کر رہی ہوگی، اس کی ذہنی ہستی اپنی خوراک سے محروم ہو کر ایسی ہو جائے گی جیسے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

اسی لیے مال کو فتنہ کہا گیا ہے۔ یعنی وہ انسان کے لیے آزمائش ہے مال کا صحیح استعمال انسان کو ہر قسم کی ترقیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ اور مال کا غلط استعمال انسان کو تباہی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔

کھونا، پانا

دنیا میں آدمی کبھی کھوتا ہے اور کبھی پاتا ہے۔ یہ دونوں تجربے ایسے ہیں جو ہر آدمی کو اور ہمیشہ پیش آتے ہیں۔ کوئی بھی اس سے بچا ہوا نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان تجربات کو آدمی کو کس طرح لینا چاہیے۔ اسلام بتاتا ہے کہ دونوں ہی تجربے آزمائش کے تجربے ہیں۔ یہاں پانا بذاتِ خود کامیابی نہیں۔ اسی طرح کھونے کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی آخری طور پر ناکام ہو گیا۔

کھونے یا پانے کے معاملہ میں اصل اہمیت خود کھونے یا پانے کی نہیں ہے۔ اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ آدمی پر جب یہ تجربات گزرے تو اس کے بعد اس نے کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔

جب آدمی پر کھونے کا تجربہ گزرے تو اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اپنے کو محروم اور ناکام سمجھ کر حوصلہ کھو بیٹھے یا فریاد و شکایت میں مشغول ہو جائے۔ اس کے بجائے آدمی کو چاہیے کہ وہ حوصلہ مندی کا ثبوت دے۔ وہ اس کو برداشت کرتے ہوئے اپنے ذہنی اعتدال کو برقرار رکھے۔ وہ یہ سوچے کہ دینے والا بھی خدا ہے اور لینے والا بھی خدا۔ اس لیے مجھے خدا کے فیصلہ پر راضی رہنا ہے۔ خدا کے فیصلہ پر راضی رہ کر ہی میں دوبارہ اس کی رحمت اور توجہ کا مستحق ہو سکتا ہوں۔

اسی طرح جب آدمی کو پانے کا تجربہ ہو تو اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ فخر و ناز کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے۔ وہ اپنے آپ کو اونچا سمجھنے لگے۔

اس کے برعکس اس کو ایسا کرنا چاہیے کہ کامیابی اس کی تواضع میں اضافہ کرے۔ خدا اور انسانیت کی نسبت سے اس کے اوپر جو فرائض آتے ہیں ان کو وہ اور زیادہ اہتمام کے ساتھ ادا کرنے لگے۔

اس دنیا میں کھونا بھی امتحان ہے اور پانا بھی امتحان۔ نہ کھونے والا ناکام ہے اور نہ پانے والا کامیاب۔ کامیابی اور ناکامی کا اصل معیار یہ ہے کہ ان تجربات کے بعد آدمی کیسا ثابت ہوتا ہے۔

کامیاب وہ ہے جو کھونے اور پانے کے تجربات کے باوجود اعتدال پر رہے۔ دونوں میں سے کوئی تجربہ اس کو اعتدال کی راہ سے ہٹانے والا ثابت نہ ہو۔ ایسے ہی لوگ خدا کی نظر میں کامیاب لوگ ہیں۔ کوئی بھی چیز ان کی کامیابی میں خلل ڈالنے والی نہیں۔

نجات

انسان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ موت کے بعد آنے والی زندگی میں اس کو نجات حاصل ہو۔ وہ خدا کی ابدی رحمتوں میں جگہ پائے۔

ہر انسان جو موجودہ دنیا میں پیدا ہوا ہے اس کو موت کے بعد ایک اور دنیا میں داخل ہونا ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی کو زندگی کے مواقع آزمائش کے لیے ملے ہوئے تھے۔ اگلی دنیا میں جو کچھ کسی کو ملے گا وہ اس کے عمل کے بدلہ کے طور پر ملے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت سے پہلے کی دنیا میں تو ہر آدمی کو تمام چیزیں لازمی طور پر ملی ہوئی ہیں، خواہ وہ اس کا مستحق ہو یا مستحق نہ ہو۔ مگر موت کے بعد کی دنیا میں یہ لزوم ختم ہو جائے گا۔ اس وقت چیزوں کو پانے کا معیار استحقاق ہو گا نہ کہ امتحان۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگلی دنیا میں جو لوگ مستحق قرار پائیں گے ان کو تو ہر قسم کی نعمتیں مزید اضافہ کے ساتھ دے دی جائیں گی۔ مگر جو لوگ غیر مستحق قرار پائیں گے وہاں ان کے لیے کچھ بھی نہ ہو گا۔ وہ مجبور ہوں گے کہ وہاں کامل محرومی کی زندگی گزاریں۔

یہی ہر آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہر آدمی کو سب سے زیادہ اس بات پر دھیان دینا چاہیے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ اگلی زندگی میں غیر مستحق قرار دیا جائے۔ اور نجات پائے ہوئے لوگوں میں شامل نہ ہو۔ ہر آدمی کو اپنی طاقت اور توجہ سب سے زیادہ جس کام میں لگانا ہے وہ یہ کہ موجودہ دنیا میں وہ اس طرح زندگی گزارے کہ اگلے مرحلۂ حیات میں وہ غیر مستحق نہ قرار دیا جائے بلکہ وہاں اس کو سعادت اور نجات حاصل ہو۔

اگلی دنیا زیادہ کامل اور ابدی دنیا ہے۔ وہاں ہر قسم کی لذتیں اور خوشیاں بھرپور طور پر اکٹھا کر دی گئی ہیں۔ یہی وہ دنیا ہے جس کے لیے انسان آرزو کرے اور یہی وہ دنیا ہے جس کے لیے انسان اپنی ساری محنتیں صرف کر دے۔ مگر اس نعمت بھری دنیا کے لیے عمل کرنے کا مقام موت سے پہلے کی دنیا ہے نہ کہ موت کے بعد آنے والی دنیا۔ آج کی دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور اگلی دنیا عمل کا انجام پانے کی جگہ۔ آخرت کی نجات صرف ان لوگوں کو ملے گی جو آخرت سے پہلے اپنے آپ کو نجات کا مستحق ثابت کریں۔

جہاد

جہاد کے معنی کوشش کے ہیں۔ دین کی راہ میں کسی بھی سچی کوشش کو جہاد کہا جائے گا۔

آدمی کا نفس اس کو برائی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اس وقت اپنے نفس سے لڑکر برائی سے رکنے کا نام جہاد ہے۔ دوست، ساتھی، سماجی دباؤ کوئی ایسا کام کرانا چاہتے ہیں جو حقیقت کے اعتبار سے صحیح نہیں، اس وقت لوگوں کے دباؤ کو قبول نہ کرنا اور اپنے درست رویہ پہ جمے رہنا جہاد ہے۔

لوگوں کو اچھی بات بتانا اور انھیں بری باتوں سے روکنا ایک مشقت والا عمل ہے۔ مگر مشقتوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنی دعوتی مہم کو جاری رکھنا جہاد ہے۔

پڑوسیوں یا تعلق والوں کی طرف سے کوئی کڑوی بات سننے کو ملے یا کسی قسم کا تلخ تجربہ ہو اور آدمی کے اندر اس کی وجہ سے اشتعال آجائے، مگر وہ اپنے آپ کو جوابی عمل سے روکے اور یک طرفہ طور پر لوگوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات برقرار رکھے تو یہ ایک جہاد ہوگا۔

جہاد کی ایک اور قسم ہے جس کا دوسرا نام قتال ہے۔ یعنی اللہ کے حکموں کی پیروی کرتے ہوئے دشمن سے لڑنا۔ یہ جہاد جارحیت کے مقابلہ میں اپنے بچاؤ کے لیے ہوتا ہے۔ جہاد کا لفظی مطلب جنگ نہیں ہے۔ مگر خدا کے حکموں کی پیروی میں اپنے بچاؤ کے لیے لڑنا بھی ایک کوشش کا معاملہ ہے، اس لیے اس کو بھی جہاد کہا جاتا ہے۔

لڑائی والا جہاد ایک وقتی اور اتفاقی معاملہ ہے۔ اگر کبھی واقعۃً بچاؤ کی ضرورت پیش آجائے تو اس وقت اس نوعیت کا جہاد کیا جائے گا۔ اور اگر اس قسم کی شدید ضرورت پیش نہ آئے تو جنگی جہاد عملاً رکا رہے گا۔

کسی عمل کا نام جہاد رکھنے سے وہ عمل جہاد نہیں ہو جائے گا۔ جہاد صرف وہ عمل ہے جو اسلام کے مطابق جہاد ہو۔ اور اسلامی جہاد اصلاً پرامن جدوجہد کا نام ہے۔ یہ پرامن جدوجہد کبھی داخلی اعتبار سے مطلوب ہوتی ہے اور کبھی خارجی اعتبار سے، کبھی وہ احساسات کی سطح پر جاری ہوتی ہے اور کبھی ظاہری اعضاء کی سطح پر۔

خدا کو پکارنا

دعا کا مطلب ہے پکارنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنی حاجات کے لیے یا اپنی بندگی کے اظہار کے لیے خدا کو پکارے۔ یہ پکار بذات خود ایک عبادت ہے۔

خدا ایک زندہ اور مستقل وجود ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور یہ طاقت رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے اور جس نہج پر چاہے واقعات کا کورس مقرر کرے۔

خدا کے بارے میں یہی یقین آدمی کے اندر دعا کا جذبہ ابھارتا ہے۔ جب آدمی کو خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو فطری طور پر اس کے اندر یہ جذبہ بھی ابھر آتا ہے کہ وہ اپنی حاجات کے لیے خدا کو پکارے وہ اس سے دنیا اور آخرت کی سعادتیں مانگے۔ وہ اس کو اپنا کارساز بنالے۔

دعا کا نہ کوئی وقت مقرر ہے اور نہ کوئی طریقہ اور نہ اس کی کوئی علاحدہ زبان ہے۔ آدمی ہر لمحہ، ہر صورت سے اور ہر زبان میں خدا سے دعا کر سکتا ہے۔ اگر دعا سچے دل سے نکلی ہے تو ضرور وہ خدا تک پہنچے گی۔ خدا اس کو فوراً سنے گا اور اس کے مطابق اس کی قبولیت کا فیصلہ فرمائے گا۔

کچھ دعائیں وہ ہیں جو مختلف عبادتوں کے ساتھ دہرائی جاتی ہیں۔ مگر زیادہ دعائیں وہ ہیں جو کسی دوسرے عمل سے جڑی ہوئی نہیں ہیں۔ مثلاً آدمی رات کو سونے کے لیے بستر پر جاتا ہے تو اس کی زبان پر رات کی مناسبت سے کچھ دعائیں آجاتی ہیں۔ اسی طرح جب وہ صبح کو سو کر اٹھتا ہے تو وہ نئے دن کے بہتر آغاز کے لیے دعا کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب وہ کسی سے ملتا ہے یا کھاتا پیتا ہے یا سواری پر بیٹھتا ہے یا سفر پر ہوتا ہے، یا اپنے معاشی مشاغل میں مصروف ہوتا ہے۔ یا اور کسی حالت میں ہوتا ہے تو اس کی مناسبت سے اس کی زبان سے ایسی دعائیں نکلتی ہیں جن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدایا تو اس معاملہ میں میرے ساتھ بہتری کا فیصلہ فرمادے۔ دعا کا یہ عمل مومن کی زندگی میں ہر آن مختلف صورتوں میں جاری رہتا ہے۔

دعا کا مطلب خدا سے مانگنا ہے۔ اور خدا سے مانگنا کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں مسلسل جاری رہتا ہے۔ دُعا اپنے رب کے ساتھ کبھی نہ ختم ہونے والے قلبی تعلق کا اظہار ہے۔ مومن کی زندگی کا کوئی لمحہ دعا سے خالی نہیں ہو سکتا۔

دعائیں

اسلام میں جو باتیں سکھائی گئی ہیں ان میں سے ایک دعا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں کثرت سے دعائیں نقل کی گئی ہیں۔ یہ دعائیں بتاتی ہیں کہ مختلف مواقع پر ایک مومن کی زبان سے کس طرح کے دعائیہ کلمات اور احساسات ظاہر ہونے چاہئیں۔

مثلاً ایک آدمی کی ملاقات دوسرے آدمی سے ہو تو چاہیے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہیں۔ یعنی یہ کہ تمہارے اوپر اللہ کی سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔ اسی طرح مومن کو چاہیے کہ جب وہ کھانا کھائے تو وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر اپنا کھانا کھائے اور جب وہ کھانے کو ختم کرے تو الحمد للہ اور اسی طرح کے دوسرے کلمات اپنی زبان سے ادا کرے۔ گویا کہ ایک مومن اپنے کھانے پینے کا آغاز اللہ کا نام لے کر کرتا ہے اور جب وہ اپنا کھانا پینا ختم کرتا ہے تو دوبارہ وہ اللہ کا شکر ادا کر کے اس کی نعمتوں کا اعتراف کرتا ہے۔

ایک مومن کے دل میں جب کوئی برا خیال آتا ہے تو وہ اس کے مقابلہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہے اور یہ کلمہ اپنی زبان سے ادا کرتا ہے: اللّٰھم انی اعوذ بک من الشیطان الرجیم۔ وہ جب کسی مسئلہ سے دوچار ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ: اللّٰھم علیک توکلنا یعنی اے اللہ ہم نے تیرے اوپر بھروسہ کیا۔ اسی طرح جب اس کو مال کا کوئی حصہ ملتا ہے تو وہ کہتا ہے: اللّٰھم بارک لنا فی اموالنا یعنی اے اللہ ہمارے مالوں میں ہمیں برکت عطا فرما۔ ایک مومن جب سفر کرتا ہے تو اس کی زبان پر یہ کلمات ہوتے ہیں: اللّٰھم انت الصاحب فی السفر وانت الخلیفۃ فی الاھل یعنی اے اللہ تو اس سفر میں میرا ساتھی ہے اور تو ہی میرے بعد میرے گھر والوں کا نگہبان ہے۔

جب اس کو کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو وہ کہتا ہے: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یعنی ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہمیں لوٹ کر اللہ ہی کی طرف جانا ہے۔ اسی طرح زندگی کے ہر موڑ اور ہر مرحلہ کے لیے اسلام میں دعائیں بتائی گئی ہیں۔ یہ دعائیں ہر موقع پر مومن کے ایمان کو تازہ کرتی ہیں۔ وہ موجودہ دنیا میں اس کے ہر تجربہ کو ربانی تجربہ بناتی رہتی ہیں۔ مومن اسی طرح ذکر اور دعا کے سایہ میں زندگی گزارتا ہے یہاں تک کہ وہ مر کر اپنے رب سے جا ملتا ہے۔

ایّھا الانِسَانُ

قرآن کا پیغام انسانیت کے نام

اصل کوتاہی

قرآن کی سورہ نمبر۲ میں ارشاد ہوا ہے ـــــ اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تاکہ تم دوزخ سے بچ جاؤ۔ وہ ذات جس نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت بنایا۔ اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل، تمہاری غذا کے لیے۔ پس تم کسی کو اللہ کے برابر نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو (البقرہ ۲۲-۲۱)

انسان اور انسان کے سوا جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب کا پیدا کرنے والا صرف خدا ہے۔ اس نے پوری کائنات کو نہایت حکمت کے ساتھ قائم کیا ہے۔ وہ ہر آن ان کی نگہبانی کر رہا ہے۔ اس لیے انسان کے لیے صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ خدا کو بغیر کسی شرکت کے خالق، مالک اور رازق تسلیم کر لے، وہ اس کو اپنا سب کچھ بنا لے۔

مگر خدا چونکہ نظر نہیں آتا اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی نظر آنے والی چیز کو اہم سمجھ کر اس کو خدائی مقام پر بٹھا لیتا ہے۔ وہ ایک مخلوق کو جزئی یا کلی طور پر خالق کے برابر ٹھہرا لیتا ہے۔ کبھی اس کو خدا کا نام دے کر اور کبھی خدا کا نام دیے بغیر۔

یہی انسان کی اصل کوتاہی ہے۔ پیغمبر کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ آدمی صرف ایک خدا کو بڑائی کا مقام دے۔ اس کے علاوہ جس جس کو اس نے خدائی عظمت کے مقام پر بٹھا رکھا ہے اس کو عظمت کے مقام سے اتار دے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے آپ پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس کو ہر لمحہ مختلف چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جس کے سہارے وہ زمین پر اپنا وجود قائم رکھ سکے۔ انسان کو ایک ایسی زمین چاہیے جس کے اندر کشش ہو تاکہ وہ اس کے اوپر ٹھہر سکے۔ انسان کو ایک ایسی فضا چاہیے جس میں ہر لمحہ اس کے لیے آکسیجن کی سپلائی کا انتظام ہو۔ اس کو ایک ایسا سورج چاہیے جو مسلسل اس کو روشنی اور حرارت پہنچا رہا ہو۔ اس کی یہ ضرورت ہے کہ اس کی دنیا میں پانی کی نہایت وافر مقدار موجود ہو کیوں کہ پانی کے بغیر کسی قسم کی زندگی ممکن نہیں۔ اس کو مختلف قسم کی غذا درکار ہے جو اس کو مسلسل طاقت دیتی رہے۔

اس طرح کی بے شمار چیزیں خدا نے دنیا میں بھرپور مقداروں میں فراہم کر دی ہیں۔ یہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ انسان صرف ایک خدا کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

کائنات کی گواہی

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے آنے اور جانے میں، اور ان کشتیوں میں جو انسانوں کے کام آنے والی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں۔ اور اس پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس سے مُردہ زمین کو زندگی بخشی۔ اور اس سے زمین میں سب قسم کے جانور پھیلا دیے۔ اور ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان حکم کے تابع ہیں۔ ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں (البقرہ ۱۶۳-۱۶۴)

ہمارے سامنے پھیلی ہوئی کائنات اللہ کا ایک عظیم الشان تعارف ہے۔ زمین و آسمان کی صورت میں ایک اتھاہ کارخانہ کا موجود ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ضرور اس کا کوئی بنانے والا ہے۔ طرح طرح کے ظاہری اختلاف اور تضاد کے باوجود تمام چیزوں کا حد درجہ ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنا ثابت کرتا ہے کہ اس کا خالق و مالک صرف ایک ہے۔ کائنات کی چیزوں میں نفع بخشی کی صلاحیت ہونا گویا اس بات کا اعلان ہے کہ اس کی منصوبہ بندی کامل شعور کے تحت بالارادہ کی گئی ہے۔

بے جان چیزوں میں قدرتی عمل سے جان اور تازگی کا آجانا بتاتا ہے کہ کائنات میں موت محض عارضی ہے۔ یہاں ہر موت کے بعد لازماً دوسری زندگی آتی ہے۔ ایک ہی پانی اور ایک ہی خوراک سے قسم قسم کے جانداروں کا ان گنت تعداد میں پایا جانا اللہ کی بے حساب قدرت کا پتا دیتا ہے۔ ہوا کا مکمل طور پر انسان کو اپنے گھیرے میں لیے رہنا بتاتا ہے کہ انسان پوری طرح اپنے خالق کے قبضے میں ہے۔ کائنات کی تمام چیزوں کا انسانی ضرورت کے تحت سدھا ہوا ہونا ثابت کرتا ہے کہ انسان کا خالق ایک بے حد مہربان ہستی ہے۔ وہ اس کی ضروریات کا اہتمام اس وقت سے کر رہا ہوتا ہے جب کہ اس کا وجود بھی نہیں ہوتا۔

انسان کا خدا ایک ہی خدا ہے۔ وہی اس قابل ہے کہ وہ انسان کی توجہات کا مرکز بنے۔ ہمارا وجود اور وہ سب کچھ جو ہم کو زمین پر حاصل ہے اس لیے ہے کہ ہمارا یہ خدا رحمتوں کا خزانہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اس کو حقیقی معنوں میں اپنا معبود بنائے اور اپنی تمام امیدوں اور تمناؤں کو ہمیشہ کے لیے اسی کے ساتھ وابستہ کر دے۔

عقل والے

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، اور رات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہہ اٹھتے ہیں اے ہمارے رب تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے۔ پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب تو نے جس کو آگ میں ڈالا اس کو تو نے واقعی رسوا کر دیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک خاموش اعلان ہے۔ آدمی جب اپنے کان اور آنکھ سے مصنوعی پردوں کو ہٹاتا ہے۔ تو وہ اس خاموش اعلان کو سننے لگتا ہے۔ اس کو ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسی کائنات جس کے ستارے اور سیارے کھربوں سال تک بھی ختم نہیں ہوتے وہاں انسان اپنی تمام تمناؤں کو لیے ہوئے محدود مدت میں ختم ہو جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں درختوں کا حسن اور پھولوں کی لطافت ہے۔ جہاں ہوا، اور پانی اور سورج جیسی بے شمار بامعنیٰ چیزوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ وہاں انسان کے لیے غم کے سوا کوئی انجام نہ ہو۔ پھر یہ بھی اس کو ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسی دنیا جہاں یہ انتہاء امکان رکھا گیا ہے کہ یہاں ایک چھوٹا سا بیج زمین میں ڈالا جائے تو اس کے اندر سے ہرے بھرے درخت کی ایک پوری کائنات نکل آئے وہاں آدمی نیکی کی زندگی اختیار کر کے بھی اس کا کوئی پھل نہ پاتا ہو۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر روز تاریک رات کے بعد روشن دن آتا ہے، وہاں صدیاں گزر جائیں اور عدل و انصاف کا اجالا اپنی چمک نہ دکھائے۔ ایک ایسی دنیا جس کی گود میں زلزلے اور طوفان سو رہے ہیں، وہاں انسان ظلم پر ظلم کرتا رہے، مگر کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہو۔

جو لوگ گہرائیوں میں اتر کر سوچتے ہیں۔ ان کے لیے ناقابل یقین ہو جاتا ہے کہ ایک بامعنیٰ کائنات بے معنیٰ انجام پر ختم ہو جائے۔ وہ حق کے داعی کو اس یقین کے ساتھ مان لیتے ہیں کہ اس کا پیغام نطق کی زبان میں عین اس بات کا اعلان ہے جو خاموش زبان میں پوری کائنات میں نشر ہو رہا ہے۔

حقیقت کی دریافت

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، اور رات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہہ اٹھتے ہیں اے ہمارے رب تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے۔ پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب تو نے جس کو آگ میں ڈالا اس کو تو نے واقعی رسوا کر دیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اے ہمارے رب ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ۔ پس ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ اے ہمارے رب تو نے جو وعدے اپنے رسولوں کی معرفت ہم سے کیے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہم کو رسوائی میں نہ ڈال۔ بیشک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے (آل عمران ۱۹۴-۱۹۰)

انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں اس کے چاروں طرف بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ جو لوگ ان نشانیوں پر غور کریں اور یکسو ہو کر اس کے پیغام کو سننے کی کوشش کریں وہ یقینی طور پر مخلوقات کی اس جلوہ گاہ میں اس کے خالق کو پالیں گے۔

کائنات کی معنویت کو دریافت کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ مخلوق کا اپنے خالق کو دریافت کرنا ہے، یہ طالب کا اپنے مطلوب کو پالینا ہے۔ اس دریافت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اس کے بارہ میں سنجیدہ ہو جاتا ہے، وہ اس کو اپنی عملی زندگی میں شامل کر لیتا ہے، وہ ان لوگوں کا ساتھی بن جاتا ہے جو اس کی طرح حقیقت کے طالب تھے اور اس کو دریافت کر کے اس کے اوپر چل پڑے۔

حقیقت کی دریافت کوئی فلسفیانہ دریافت نہیں ہے، وہ اپنی ذمہ داریوں کی دریافت ہے۔ وہ اپنے آغاز اور انجام کی دریافت ہے۔ جو آدمی اس دریافت تک پہنچ جائے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا فراموشی کو چھوڑ کر خدا پرستی کی زندگی اختیار کر لیتا ہے، وہ جہنم کے راستوں میں بھٹکنے کے بجائے اس صراط مستقیم پر چل پڑتا ہے جو اس کو جنت کی طرف لے جانے والی ہے۔

روحانی زندگی

قرآن کی سورہ نمبر ۶ میں ارشاد ہوا ہے کہ — کیا وہ انسان جو مُردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندگی دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے۔ وہ اس انسان کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے۔ اس سے نکلنے والا نہیں۔ اسی طرح منکروں کی نظر میں ان کے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں (الانعام ۱۲۳)

ایک شخص وہ ہے جس کو حق نہیں ملا یا حق اس کے سامنے آیا اور اس نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسا آدمی گویا کہ ذہنی اور فکری اعتبار سے مرا ہوا ہے۔ حق سے محرومی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اندرونی شخصیت صحیح رخ پر حرکت میں نہیں آئی۔ اس کے ذہن کو اس کی مطلوب فکری غذا نہیں ملی۔ اس کی روح کے اندر سچائی کو پانے کی جو طلب پیدائشی طور پر موجود تھی وہ اپنے مطلوب کو نہ پاسکی۔

ایسا انسان بظاہر جسمانی اعتبار سے زندہ ہوگا، مگر روحانی اعتبار سے وہ ایک مرا ہوا انسان ہوگا۔ مادی خوراک سے محرومی جس طرح جسم کو بے جان کر دیتی ہے اسی طرح ایسے انسان کی اندرونی شخصیت بے جان حالت میں ہوگی۔ وہ جسمانی اعتبار سے زندہ انسان ہوگا لیکن روحانی اعتبار سے وہ ایک مُردہ انسان بنا ہوا ہوگا۔

اس کے برعکس جس آدمی نے حق کو پالیا جس کا حال یہ ہوا کہ جب اس کے سامنے حق آیا تو اس نے کھلے ذہن کے ساتھ اس کو قبول کر لیا ایسے انسان کا اندرونی وجود اچانک زندہ اور متحرک ہوجائے گا۔ حق اس کی آنکھ کی روشنی بن جائے گا جس کے ذریعے وہ دنیا کے راستوں کو دیکھے۔ وہ اس کے پاؤں کی طاقت بن جائے گا جس کے ذریعے وہ سچائی کے راستے پر چلے۔ اس کے قول اور اس کے کردار میں حق کی جھلک دکھائی دے گی۔ اس کا جینا سچائی کا جینا ہوگا اور اس کا مرنا بھی سچائی کا مرنا۔

حقیقت کو پایا ہوا انسان اور حقیقت سے محروم انسان کے درمیان موت اور حیات کا فرق ہے۔ ایک اگر مُردہ وجود ہے تو دوسرا پورے معنوں میں ایک زندہ وجود۔

قیامت میں

قرآن کی سورہ نمبر۶ میں ارشاد ہوا ہے —— اے جنوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے جو تم کو میری آیتیں سناتے اور تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے۔ وہ کہیں گے ہم خود اپنے خلاف گواہ ہیں۔ اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکہ میں رکھا۔ اور وہ اپنے خلاف خود گواہی دیں گے کہ بے شک ہم منکر تھے۔ یہ اس وجہ سے کہ تمہارا رب بستیوں کو ان کے ظلم پر اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں کہ وہاں کے لوگ بے خبر ہوں (الانعام ۱۳۲ – ۱۳۱)

شیطان جب آدمی کو خوشنما ترغیبات کے ذریعہ اپنی طرف لے جاتا ہے تو وہ اپنے اس چیلنج کو صحیح ثابت کرنا چاہتا ہے جو اس نے آغاز تخلیق میں خدا کو دیا تھا کہ میں تیری مخلوق کے بڑے حصہ کو اپنا ہمنوا بنا لوں گا (بنی اسرائیل ۶۱) اسی طرح جو لوگ اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کرتے ہیں، ان کے سامنے بھی واضح مفادات ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ جنوں کے نام پر اپنے سحر کے کاروبار کو فروغ دیتے ہیں۔ یا اپنی شاعری اور کہانت کا رشتہ کسی جنی اسناد سے جوڑ کر عوام کے اوپر اپنی برتری قائم کرتے ہیں۔

قیامت میں جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا تو یہ بات کھل جائے گی کہ جو لوگ بے راہ ہوئے یا جنھوں نے دوسروں کو بے راہ کیا انھوں نے کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ حق کو نظرانداز کرنا تھا نہ کہ حق سے بے خبر رہنا۔ وہ دنیوی رونقوں سے اوپر نہ اٹھ سکے۔ وہ وقتی فائدوں کو قربان نہ کر سکے۔ ورنہ خدا نے اپنے خاص بندوں کے ذریعہ جو ہدایت کھولی تھی وہ اتنی واضح تھی کہ کوئی شخص حقیقت حال سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر ان کی دنیا پرستی ان کی آنکھوں کا پردہ بن گئی۔ جاننے کے باوجود انھوں نے نہ جانا۔ سننے کے باوجود انھوں نے نہ سنا۔

آخرت میں وہ مصنوعی سہارے ان سے چھن جائیں گے جن کے بل پر وہ حقیقت سے بے پروا بنے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کو نظر آجائے گا کہ کس طرح ایسا ہوا کہ حق ان کے سامنے آیا مگر انھوں نے جھوٹے الفاظ بول کر اس کو رد کر دیا۔ کس طرح ان کی غلطی ان پر واضح کی گئی مگر خوب صورت تاویل کر کے انھوں نے سمجھا کہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔

خدا کے یہاں بھول کی معافی ہے مگر خدا کے یہاں سرکشی کی کوئی معافی نہیں۔

انسان کی جانچ

قرآن کی سورہ نمبر، میں ارشاد ہوا ہے کہ ——— (اے لوگو) ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم نے تمہاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ پس انھوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ خدا نے کہا کہ تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔ ابلیس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ خدا نے کہا کہ تو اُتر یہاں سے۔ تجھے یہ حق نہیں کہ تو اس میں گھمنڈ کرے پس نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے۔ ابلیس نے کہا کہ اس دن تک کے لیے تو مجھ کو مہلت دے جب کہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ خدا نے کہا کہ تجھ کو مہلت دی گئی۔ ابلیس نے کہا کہ چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں بھی لوگوں کے لیے تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا، پھر ان پر آؤں گا، ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے۔ اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے۔ اور تو ان میں سے اکثر کو شکرگزار نہیں پائے گا۔ خدا نے کہا نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا (الاعراف ۱۱ – ۱۸)

امتحان کی اس دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص دولت و عزت میں دوسرے سے زیادہ حصہ پالیتا ہے۔ کبھی دو آدمیوں کے درمیان ایسا معاملہ پڑتا ہے کہ ایک شخص کے لیے دوسرے کو اس کا جائز حق دینا اپنے کو نیچے گرانا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کسی شخص کی زبان سے خدا ایک سچائی کا اعلان کراتا ہے اور وہ ان لوگوں کو اپنے سے برتر دکھائی دینے لگتا ہے جو اس سچائی تک پہنچنے میں ناکام رہے تھے۔ ایسے مواقع پر شیطان آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جگا دیتا ہے۔ "میں بہتر ہوں" کے جذبے سے مغلوب ہو کر وہ اپنے بھائی کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہی خدا کی نظر میں شیطان کے راستے پر چلنا ہے۔ جس شخص نے ایسے مواقع پر حسد اور گھمنڈ کا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے گویا کہ شیطان کی پیروی کی۔ اور جس نے ایسے مواقع پر شیطان کے پیدا کیے ہوئے جذبات کو اپنے اندر کچل ڈالا۔ اس نے صراطِ مستقیم کو پکڑ لیا جو اسے جنت تک پہنچا دے۔

روحانی لباس

قرآن کی سورہ نمبر۷ میں ارشاد ہوا ہے —— اے بنی آدم، ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہارے بدن کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور زینت بھی۔ اور تقویٰ کا لباس اس سے بھی بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ لوگ غور کریں۔ اے آدم کی اولاد، شیطان تم کو بہکا نہ دے جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا دیا، اس نے ان کے لباس اتروائے تاکہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کر دے۔ وہ اور اس کے ساتھی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے (الاعراف ۲۷ - ۲۶)

ظاہری لباس کی طرح انسان کو ایک اندرونی لباس بھی درکار ہے۔ یہ تقویٰ کا لباس ہے۔ تقویٰ کا لباس کیا ہے۔ یہ ہے —— اللہ کا خوف، حق کا اعتراف، اپنے لیے اور دوسروں کے لیے صرف ایک معیار رکھنا، اپنے کو بندہ سمجھنا۔ تواضع کو اپنا شعار بنانا، دنیا میں گم ہونے کے بجائے آخرت کی طرف متوجہ رہنا۔ آدمی جب ان چیزوں کو اپنائے تو گویا کہ وہ اپنے اندرونی وجود کو لباس پہناتا ہے اور اگر وہ اس کے خلاف رویہ اختیار کرے تو وہ اپنے اندرون کو ننگا کر دیتا ہے۔ ظاہری جسم کو کپڑے کا بنا ہوا لباس ڈھانکتا ہے اور باطنی جسم کو تقویٰ کا لباس۔

شیطان آدمی کو بہکاتا ہے۔ وہ خدا کے ممنوعہ درخت کو ہر قسم کے خیر کا سرچشمہ بتاتا ہے۔ وہ ایسے معصوم راستوں سے اس کی طرف آتا ہے کہ آدمی کا گمان بھی نہیں جاتا کہ ادھر سے اس کی طرف گمراہی آرہی ہوگی۔ شیطان آدمی کے نازک مقامات سے اس پر حملہ کرتا ہے۔ کبھی ایک بے حقیقت نظریہ کو خوبصورت الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ کبھی ایک جزئی حقیقت کو کلی حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے لاتا ہے۔ کبھی معمولی چیزوں میں فوائد کا خزانہ بتا کر سارے لوگوں کو اس کی طرف دوڑا دیتا ہے۔ کبھی ایک بے فائدہ حرکت میں ترقی کا راز بتاتا ہے۔ کبھی ایک تخریبی عمل کو تعمیر کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

شیطان ان لوگوں پر کامیاب ہوتا ہے جو خدا کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے۔ جو دلائل کی زبان میں بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ جنھیں اپنے ذاتی رجحانات کے مقابلہ میں حق کے تقاضے کو ترجیح دینا گوارا نہیں ہوتا۔ جن کو ایسی سچائی، سچائی نظر نہیں آتی جس میں ان کے فائدوں اور مصلحتوں کی رعایت شامل نہ ہو۔

آنے والا وقت

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں ارشاد ہوا ہے —— اور ہر قوم کے لیے ایک مقررہ مدت ہے۔ پھر جب ان کی مدت آجائے گی تو وہ نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ اے بنی آدم، اگر تمہارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیات سنائیں تو جو شخص ڈرا اور جس نے اصلاح کرلی ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔ اور جو لوگ میری آیات کو جھٹلائیں اور ان سے تکبر کریں وہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے یا اس کی نشانیوں کو جھٹلائے۔ ان کے نصیب کا جو حصہ لکھا ہوا ہے وہ انھیں مل کر رہے گا۔ یہاں تک کہ جب ہمارے بھیجے ہوئے ان کی جان لینے کے لیے ان کے پاس پہنچیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے کہاں ہیں۔ وہ کہیں گے کہ وہ سب ہم سے کھوئے گئے۔ اور وہ اپنے اوپر اقرار کریں گے کہ بیشک وہ انکار کرنے والے تھے (الاعراف ۳۷-۳۴)

انسان کے لیے جنت یا دوزخ کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ اس کے سامنے جب حق آیا تو اس نے اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ جب بھی کوئی حق ایسے دلائل کے ساتھ سامنے آجائے جس کی صداقت پر آدمی کی عقل گواہی دے رہی ہو تو اس کے اوپر گویا خدا کی حجت پوری ہو گئی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اس حق کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو وہ یقیناً کبر کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے۔ اپنے آپ کو بڑا رکھنے کی نفسیات اس کے لیے رکاوٹ بن گئی کہ وہ حق کو بڑا بنا کر اس کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا بنانے پر راضی کرلے۔ ایسے آدمی کے لیے خدا کے یہاں جہنم کے سوا کوئی انجام نہیں۔

انسان جب بھی حق کا انکار کرتا ہے تو وہ کسی اعتماد کے اوپر کرتا ہے۔ کسی کو دولت و اقتدار کا اعتماد ہوتا ہے۔ کوئی اپنی عزت و مقبولیت پر بھروسہ کیے ہوئے ہوتا ہے۔ مگر یہ انسان کی بہت بڑی بھول ہے۔ وہ آزمائش کی چیزوں کو اعتماد کی چیز سمجھے ہوئے ہے۔ قیامت کے دن جب یہ بے بنیاد سہارے اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے تو اس وقت اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ وہ محض سرکشی کی بنا پر حق کا انکار کرتا رہا۔ اگرچہ اپنے انکار کو جائز ثابت کرنے کے لیے وہ بہت سے اصولی الفاظ بولتا تھا۔

اصلاحی رویہ

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ ــــــ تم لوگ زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد برپا نہ کرو (الاعراف ۵۶)

زمین کی اصلاح سے مراد اللہ کا وہ نظام ہے جو انسان کے سوا بقیہ دنیا میں قائم ہے۔ انسان کو خدا کے اس قائم کردہ نظام سے مطابقت کر کے رہنا ہے۔ اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کے خلاف روش اختیار کرے۔

زمین کو خدا نے خاموش عمل کی دنیا بنایا ہے۔ اس لیے یہاں شور وغل نہ مچاؤ۔ یہاں خدا نے صاف ہوا میں سانس لینے کا انتظام کیا ہے تم اپنی کثافت سے خدا کی ہوا کو خراب نہ کرو۔ نباتات اور حیوانات اپنے اپنے دائرہ میں کام کرتے ہیں، تم بھی اپنے دائرہ میں کام کرو، دوسرے کے دائرہ میں مداخلت نہ کرو۔ یہاں سارا کام حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا ہے، تم بھی ایسا ہی کرو اور جذباتیت یا جلد بازی کا رویہ نہ اختیار کرو۔

اس دنیا کی تمام چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی کر کے اپنا اپنا کام کر رہی ہیں تم بھی دوسروں سے ہم آہنگی کر کے زمین پر زندگی گزارو۔ اس دنیا میں ہر چیز دوسرے کے لیے نفع بخش بنی ہوئی ہے۔ تم بھی اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے نفع بخشی کی حد تک خیر خواہ بن جاؤ۔

زمین کی اصلاح خدا کی طرف سے ہو چکی ہے۔ انسان کو اس کی اصلاح نہیں کرنا ہے۔ انسان کو صرف اس اصلاحی نقشہ کی پیروی کرنا ہے۔ اصلاح شدہ زمین کی طرح اس کو بھی اپنے معاشرہ کو اصلاح یافتہ بنا لینا ہے۔

خدا کی زمین پر انسان کے لیے دو ممکن رویے ہیں ـــ اصلاحی رویہ اور مفسدانہ رویہ۔ اصلاحی رویہ یہ ہے کہ انسان شعوری طور پر اس درست نظام کی پیروی کرے جس کی پیروی بقیہ کائنات غیر شعوری طور پر کر رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں مفسدانہ رویہ یہ ہے کہ آدمی کائناتی نظام سے منحرف ہو جائے۔ وہ کائنات میں خدا کے قائم کردہ نظام اصلاح کو چھوڑ کر کوئی خود ساختہ رویہ اختیار کر لے۔ خدا کی اصلاح یافتہ زمین انسانی رہائش کے لیے بہترین جگہ بھی ہے اور اسی کے ساتھ انسانی عمل کے لیے بہترین نمونہ بھی۔

خدائی آواز

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں ارشاد ہوا ہے ——— اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں۔ یہ اس لیے ہوا کہ کہیں تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی یا کہو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے شرک کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے۔ تو کیا تو ہم کو اس کام پر ہلاک کرے گا جو غلط کار لوگوں نے کیا، اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ رجوع کریں (الاعراف ۱۷۲-۱۷۴)

یہ اس معاملہ کا ذکر ہے جب کہ انسان کی فطرت میں خالق و مالک کا شعور اس طرح داخل کر دیا گیا کہ وہ اس سے جدا نہ ہو سکے۔ موجودہ زمانے میں ایک اعتبار سے روس اور دوسرے اعتبار سے ترکی کا تجربہ بتاتا ہے کہ مکمل طور پر مخالف مذہب ماحول میں بھی انسان کی فطرت نہیں بدلتی۔

جانوروں میں جو چیز جبلّت کی صورت میں ہے وہی چیز انسان کے اندر فطرت کی صورت میں ہے۔ لیکن جانور مجبور ہیں، جب کہ انسان مجبور نہیں۔ جانور کے برعکس انسان کا حال یہ ہے کہ شعور فطرت کی حد تک پابند ہونے کے باوجود عمل کے معاملہ میں وہ پوری طرح آزاد ہے۔ جب بھی کوئی بات سامنے آتی ہے تو اس کی عقل اور اس کا ضمیر اندر سے اشارہ کرتے ہیں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ مگر اس کے باوجود انسان کو اختیار ہے کہ وہ چاہے اپنی اندرونی آواز کی پیروی کرے چاہے اس کو نظرانداز کرکے من مانی کارروائی کرنے لگے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا امتحان ہو رہا ہے اور اسی پر جنت اور جہنم کا فیصلہ ہونا ہے۔ جو شخص خدائی آواز پر کان لگائے اور وہی کرے جو خدا فطرت کی خاموش زبان میں اس سے کہہ رہا ہے وہ امتحان میں پورا اترا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

فطرت کی یہ آواز ہر آدمی کے اوپر خدا کی دلیل ہے۔ اب کسی کے پاس نہ تو بے خبری کا عذر ہے اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ماضی سے جو ہوتا چلا آرہا ہے وہی ہم بھی کرنے لگے۔ جب انسان پیدائش ہی سے خدا کا شعور لے کر آتا ہے اور ماحول کے علی الرغم اس کو ہمیشہ باقی رکھتا ہے تو اب کسی شخص کے پاس بے راہ ہونے کا کیا عذر ہے۔

خدا کی نعمتیں

قرآن کی سورہ نمبر۱۴ میں ارشاد ہوا ہے —— اللہ وہ ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس سے مختلف پھل نکالے تمہاری روزی کے لیے۔ اور کشتی کو تمہارے لیے مسخر کر دیا کہ سمندر میں اسی کے حکم سے چلے۔ اور اس نے دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ اور اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کر دیا کہ برابر چلے جا رہے ہیں۔ اور اس نے رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کر دیا اور اس نے تم کو ہر چیز میں سے دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم گن نہیں سکتے۔ بیشک انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے (ابراہیم ۳۴-۳۲)

موجودہ دنیا انتہائی حیرت ناک حد تک خدا کی گواہی دے رہی ہے۔ وسیع خلا میں ستاروں اور سیاروں کی گردش، پانی کے ذریعہ زمین پر زندگی اور رزق کی فراہمی، خشکی اور تری اور فضا پر انسان کو یہ قدرت ہونا کہ وہ ان میں اپنی سواریاں دوڑائے، دریاؤں اور پہاڑوں کے ذریعہ زمین کا انسان کے موافق ہو جانا۔ سورج اور چاند کے ذریعہ موسموں کا اور رات دن کا انتظام، سب کچھ اس سے زیادہ عظیم ہے کہ ان کو لفظوں میں بیان کیا جا سکے۔ انسان اور کائنات میں اتنی کامل مطابقت ہے کہ انسان کی ہر قابل قیاس یا ناقابل قیاس ضرورت پیشگی طور پر یہاں بافراط موجود ہے۔

یہ تمام چیزیں اتنی زیادہ عجیب ہیں کہ آدمی کو ہلا دیں اور اس کو عبدیت کے جذبہ سے سرشار کر دیں۔ اس کے باوجود ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ کائنات کو دیکھ کر آدمی کے اندر استعجاب کی کیفیت پیدا ہو۔ خالقِ کائنات کے تصور سے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی پیدا ہوتے ہی کائنات کو دیکھتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ اس کو ایک عام چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس میں اسے کوئی انوکھا پن نظر نہیں آتا۔

مزید یہ کہ اس دنیا میں آدمی کو جب کوئی چیز ملتی ہے تو وہ بظاہر اس کو اسباب کے تحت ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس بنا پر وہ سمجھ لیتا ہے کہ جو چیز اس کو ملی ہے وہ اس کی اپنی محنت اور صلاحیت کی بنا پر ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کے اندر دینے والے خدا کے لیے شکر کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

انسان کی یہی وہ غفلت ہے جس کو یہاں بے انصافی اور ناشکر گزاری سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مخلص بندے

قرآن کی سورہ نمبر ۱۵ میں وہ مکالمہ درج ہوا ہے جو انسان اول کی تخلیق کے وقت خدا اور ابلیس کے درمیان ہوا تھا۔ ابلیس اول دن ہی سے انسان کا دشمن بن گیا۔ چنانچہ اس نے چیلنج دیتے ہوئے کہا کہ —— اے میرے رب، جیسا تو نے مجھ کو گمراہ کیا ہے۔ اسی طرح میں زمین میں ان کے لیے مزین کروں گا اور سب کو گمراہ کر دوں گا۔ سوا ان کے جو تیرے چنے ہوئے (مخلص) بندے ہیں۔ اللہ نے فرمایا، یہ ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے۔ بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا زور نہیں چلے گا۔ سوا ان کے جو گمراہوں میں سے تیری پیروی کریں۔ اور ان سب کے لیے جہنم کا وعدہ ہے (الحجر ۴۲ — ۴۰)

دنیا میں انسان ہر لمحہ شیطان کی زد میں ہے۔ شیطان آدمی کے دماغ میں داخل ہو کر مسلسل اس کو بہکاتا رہتا ہے۔ اس کا طریقہ تزئین ہے۔ یعنی برے کام کو اچھا بنا کر پیش کرنا۔ غلط کام کے لیے خوش نما تاویل فراہم کرنا۔

یہ بے حد مشکل امتحان ہے۔ ابلیس کے اس فتنہ سے صرف وہ لوگ بچیں گے جو خدا کے مخلص بندے ہوں، یعنی وہ چنے ہوئے لوگ جو خدا کی مدد سے اپنی فکری سطح کو اتنا زیادہ ترقی یافتہ بنالیں کہ وہ ابلیس کی تزئین کا توڑ کر سکیں۔ جب ابلیس کسی غلط کام کو خوب صورت الفاظ میں ان کے ذہن میں ڈالے تو وہ الفاظ کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو دیکھ سکیں، وہ ظاہری تزئین سے گزر کر باطنی حقیقت کو سمجھ لیں۔

حق کو قبول کرنے میں یا حق پر چلنے میں یہی شیطانی تزئین ہمیشہ رکاوٹ بنتی ہے۔ شیطان یہ کرتا ہے کہ وہ حق کو باطل کے روپ میں اور باطل کو حق کے روپ میں دکھاتا ہے۔ وہ ایسی خوشنما تاویلات آدمی کے ذہن میں ڈالتا ہے کہ وہ سچائی کی روش پر شبہ کرنے لگے اور جو روش غلط ہے اس کو درست مان لے۔ شیطان کی اس قسم کی تزئینات سے بچنا ذہنی بیداری کے بغیر ممکن نہیں۔ جو لوگ خدا کی مدد سے اپنے آپ کو اس طرح باشعور بنالیں وہ گویا خدا کے خاص بندے ہیں۔ اور ایسے ہی لوگ اپنے آپ کو شیطان کے بہکاوؤں سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوں گے۔

خدا کا حکم

قرآن کی سورہ نمبر ۱۶ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— (اے لوگو) بے شک خدا حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا۔ اور قرابت داروں کو دینے کا۔ اور خدا روکتا ہے فحشاء سے اور منکر سے اور سرکشی سے۔ خدا تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ اور تم خدا کے عہد کو پورا کرو۔ جبکہ تم آپس میں عہد کرلو۔ اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد نہ توڑو۔ اور تم خدا کو ضامن بھی بنا چکے ہو۔ بے شک خدا جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو (النحل ۹۰ - ۹۱)

خدا کے نزدیک پہلی چیز جس کا انسان کو اہتمام کرنا چاہیے وہ عدل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا حق جو دوسرے پر آتا ہے وہ اس کو پوری طرح ادا کرے۔ خواہ صاحبِ حق کمزور ہو یا طاقتور۔ اور خواہ وہ پسندیدہ شخص ہو یا ناپسندیدہ۔ حقوق کی ادائیگی میں صرف حق کا لحاظ کیا جائے نہ کہ دوسرے اعتبارات کا۔

دوسری چیز احسان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں عالی ظرفی کا طریقہ اپنایا جائے۔ انصاف کے ساتھ مروّت کو جمع کیا جائے۔ قانونی دائرہ سے آگے بڑھ کر لوگوں کے ساتھ فیاضی اور ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ آدمی کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ حتی الامکان وہ اپنے لیے اپنے حق سے کم پر راضی ہو جائے اور دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینے کی کوشش کرے۔

تیسری چیز ایتاء ذی القربیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے علاوہ اپنے رشتہ داروں کی ضرورت کے بارے میں بھی حساس ہو۔ ہر صاحبِ استعداد شخص اپنے مال پر صرف اپنا اور اپنے گھر والوں ہی کا حق نہ سمجھے۔ بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کو بھی وہ اپنی ذمہ داری میں شامل کرے۔

اس کے بعد آیت میں تین چیزوں سے منع فرمایا گیا ہے —— فحشاء سے مراد کھلی ہوئی اخلاقی برائیاں ہیں۔ یعنی وہ برائیاں جن کا برا ہونا خود اپنے ضمیر کے تحت ہر آدمی کو معلوم ہوتا ہے —— منکر معروف کا الٹا ہے۔ معروف ان اچھی باتوں کو کہتے ہیں جن کو ہر معاشرے میں اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس منکر سے مراد وہ ناپسندیدہ کام ہیں جو عام اخلاقی معیار کے خلاف ہیں —— "بغی" کے معنیٰ مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کرنا ہے۔

پاکیزہ زندگی

قرآن کی سورہ نمبر۱۶ میں ارشاد ہوا ہے کہ ــــــ جو شخص کوئی نیک عمل کرے گا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو زندگی دیں گے ایک اچھی زندگی اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا ہم ان کو بہترین بدلہ دیں گے (النحل ۹۷)

پاکیزہ زندگی کا آغاز یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کا اقرار کرے، وہ اس حقیقت کو مانے کہ ایک پیدا کرنے والے نے اس کو پیدا کیا ہے، وہی اس کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اور ہر آن وہ اس کی نگرانی میں ہے۔ یہ عقیدہ ہی موجودہ دنیا میں صالح زندگی کی واحد بنیاد ہے۔

جو آدمی سچے دل کے ساتھ اس حقیقت کو مان لے وہ ماننے کے بعد ایسا نہیں رہتا جیسا کہ وہ ماننے سے پہلے تھا۔ اب اس کی زندگی میں ایک نیا انقلاب آجاتا ہے۔ اس کا کردار ربانی کردار بن جاتا ہے۔ اس کی پوری زندگی میں ایک نیا نکھار آجاتا ہے۔ وہ عمل غیر صالح کو چھوڑ کر عمل صالح کا نمونہ بن جاتا ہے۔

یہ ایمان اور عمل صالح اس کی زندگی کو پاکیزہ زندگی بنا دیتے ہیں۔ اس کی سوچ تعمیری سوچ بن جاتی ہے۔ اس کی نیتیں اور ارادے مثبت رخ پر چلنے لگتے ہیں۔ وہ ہر اعتبار سے صحت مند روش پر قائم ہو جاتا ہے۔ جب بھی کسی انسان کو اس سے سابقہ پیش آتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے انسان سے مل رہا ہے جو اپنے سینے میں خدا کا نور لیے ہوئے ہے۔

یہ بات مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔ جس ایمان اور عمل صالح میں مرد کی ترقی کا راز ہے اسی میں عورت کی ترقی کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے ایک میں اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں۔

جن مردوں اور عورتوں نے اپنی زندگی اس طرح صحت مند بنیاد پر قائم کی وہی خدا کے پسندیدہ بندے ہیں۔ انھی کو خدا اپنے خصوصی انعامات کے لیے چنے گا۔ موجودہ زندگی میں بھی اور موت کے بعد آنے والی دوسری مستقل زندگی میں بھی۔

دنیا میں اچھی زندگی (حیات طیبہ) کسی کو خدا کی توفیق سے ملتی ہے۔ مگر خدا کی توفیق اسی شخص کو ملتی ہے جو خدا کے نقشہ کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو۔

رات اور دن

قرآن کی سورہ نمبر ۱۷ میں ارشاد ہوا ہے — اور انسان برائی مانگتا ہے جس طرح اس کو بھلائی مانگنا چاہیے۔ اور انسان بڑا جلد باز ہے۔ اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو ہم نے روشن کر دیا۔ تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔ اور ہم نے ہر چیز کو خوب کھول کر بیان کیا ہے (بنی اسرائیل ۱۲-۱۱)

رات اور دن کا نظام بتاتا ہے کہ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تاریکی ہو اور اس کے بعد روشنی آئے۔ خدائی نقشہ میں دونوں یکساں طور پر ضروری ہیں۔ جس طرح روشنی میں فائدے ہیں اسی طرح تاریکی میں بھی فائدے ہیں۔ دنیا میں اگر رات اور دن کا فرق نہ ہو تو آدمی اپنے اوقات کی تقسیم کس طرح کرے۔ وہ اپنے کام اور آرام کا نظام کس طرح بنائے۔

آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ تاریکی سے گھبرائے اور صرف "روشنی" کا طالب بن جائے۔ کیوں کہ خدا کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ جو آدمی ایسا چاہتا ہو اس کو خدا کی دنیا چھوڑ کر اپنے لیے دوسری دنیا تلاش کرنی پڑے گی۔

مگر یہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اس کو تاریکی کا مرحلہ پیش نہ آئے اور فوراً ہی اس کو روشنی حاصل ہو جائے۔ اسی کمزوری کا نتیجہ وہ چیز ہے جس کو عجلت کہا جاتا ہے۔ عجلت در اصل خداوندی منصوبہ پر راضی نہ ہونے کا دوسرا نام ہے۔ اور خداوندی منصوبہ پر راضی نہ ہونا ہی تمام انسانی بربادیوں کا اصل سبب ہے۔

خدا چاہتا ہے کہ انسان دنیا کی فوری لذتوں پر صبر کرے تاکہ وہ آخرت کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھ سکے، مگر انسان اپنی عجلت کی وجہ سے دنیا کی وقتی لذتوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ آگے کی طرف اپنا سفر طے نہیں کر پاتا۔ آدمی کی عاجلہ پسندی اس کو آخرت کی نعمتوں سے محروم کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔

یہی دنیا کا معاملہ بھی ہے۔ دنیا میں حقیقی کامیابی صبر سے ملتی ہے نہ کہ جلد بازی سے۔

تجربہ کی زبان سے

قرآن کی سورہ نمبر ۱۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— (اے لوگو) تمہارا رب وہ ہے جو تمہارے لیے سمندر میں کشتی چلاتا ہے۔ تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ بے شک وہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔ اور جب سمندر میں تم پر آفت آتی ہے تو تم ان معبودوں کو بھول جاتے ہو۔ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے تھے۔ پھر جب وہ تم کو خشکی کی طرف بچالاتا ہے۔ تو تم پھر جاتے ہو۔ اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے (بنی اسرائیل ۶۷ - ۶۶)

خدا نے موجودہ دنیا کو خاص قوانین کا پابند بنا دیا ہے، اس بنا پر انسان کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ سمندر میں اور خشکی اور فضا میں اپنی سواریاں دوڑائے۔ یہ سب اس لیے تھا کہ انسان اپنے حق میں اپنے خدا کی نعمتوں کو پہچانے اور اس کا شکر گزار بنے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ جو کچھ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ ایسا ہی ہونا ہے۔ ارادے کے تحت ہونے والے واقعے کو وہ اپنے آپ ہونے والا واقعہ فرض کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان واقعات کو دیکھ کر اس کے اندر کوئی خدائی احساس نہیں جاگتا۔

خدا کی معرفت اتنی حقیقی ہے کہ وہ انسان کی فطرت کے اندر آخری گہرائی تک اتری ہوئی ہے۔ اس کا ایک مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس پر کوئی آفت آپڑے جس کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرے۔ مثلاً اتھاہ سمندر میں طوفان کا آنا اور جہاز کا اس کے اندر پھنس جانا۔ اس طرح کے لمحات میں انسان کے اوپر سے اس کے تمام مصنوعی پردے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ ایک خدا کو پہچان کر اسے پکارنے لگتا ہے۔

یہ وقتی تجربہ انسان کو اس لیے کرایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی پوری زندگی کو اس پر ڈھال لے۔ وہ وقتی اعتراف کو اپنا مستقل ایمان بنا لے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ طوفان میں وہ جس حقیقت کو یاد کرتا ہے طوفان سے نکلنے کے بعد وہ اس کو بھول جاتا ہے۔

خدا کی خدائی کو ماننے کا نام توحید ہے۔ اور خدا کی خدائی کو نہ ماننے کا نام شرک۔ اس اعتبار سے توحید کی اصل حقیقت اعتراف ہے اور شرک کی اصل حقیقت عدم اعتراف۔

ذہنی خول

قرآن کی سورہ نمبر ۱۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— آدمی پر جب ہم انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا ہے۔ اور پیٹھ موڑ لیتا ہے۔ اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ناامید ہو جاتا ہے۔ کہو کہ ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کر رہا ہے۔ اب تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے (بنی اسرائیل ۸۴-۸۳)

ہر انسان پر یہ کیفیت گزرتی ہے کہ جب اس کو راحت اور فراوانی حاصل ہوتی ہے تو وہ برخود غلط نفسیات کا شکار ہو جاتا ہے۔ کسی بات کو ماننے کے لیے وہ اتنا کڑا بن جاتا ہے جیسے کہ وہ ایسا لوہا ہے جو جھکنا نہیں جانتا۔ مگر جب اس کے اسباب چھن جاتے ہیں اور اس کو عجز کا تجربہ ہوتا ہے تو اچانک وہ بے ہمت ہو جاتا ہے اور مایوسی سے نڈھال ہو جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی اپنے بارہ میں اس تجربہ سے گزرتا ہے۔ مگر ایسے لوگ کم ہیں جو اس تجربہ کے درمیان اپنی حقیقت کو دریافت کر لیں۔ وہ یہ سوچیں کہ دنیا میں جب کہ انھیں آزادی حاصل ہے وہ حق کے مقابلے میں اتنی سرکشی دکھا رہے ہیں مگر اس وقت ان کا کیا حال ہوگا جبکہ قیامت آئے گی۔ اور ان سے ان کا سارا اختیار چھین لے گی۔ انسان کتنا زیادہ کمزور ہے مگر وہ کتنا زیادہ اپنے کو طاقت ور سمجھتا ہے۔

شاکلہ سے مراد ذہنی سانچہ ہے۔ ہر آدمی کے حالات اور رجحانات کے تحت دھیرے دھیرے اس کا ایک خاص ذہنی سانچہ بن جاتا ہے۔ وہ اسی کے زیر اثر سوچتا ہے۔ اور اسی کے مطابق اس کا نقطۂ نظر بنتا ہے۔ مگر صحیح نقطۂ نظر وہ ہے جو علمِ الٰہی کے مطابق صحیح ہو اور غلط وہ ہے جو علمِ الٰہی کے مطابق غلط ہو۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہے۔ آدمی کو یہ کرنا ہے کہ اس کے شاکلہ نے جو اس کا ذہنی خول بنا دیا ہے۔ وہ اس خول کو توڑے تاکہ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھ سکے جیسی کہ وہ ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ چیزوں کو ربانی نگاہ سے دیکھنے لگے —— جو لوگ اپنے ذہنی خول میں گم ہوں، وہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں اور جو لوگ اپنے ذہنی خول سے نکل کر خدائی نقطۂ نظر کو پالیں وہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت پائی۔

امتحان

قرآن کی سورہ نمبر ۲۰ میں ارشاد ہوا ہے —— اور ہم نے آدم کو اس سے پہلے حکم دیا تھا تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس کہ اس نے انکار کیا۔ پھر ہم نے کہا کہ اے آدم، یہ بلاشبہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے تو کہیں وہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا نہ دے پھر تم محروم ہو کر رہ جاؤ (طٰہٰ ۱۱۷-۱۱۵)

خدا کے حکم پر قائم رہنے کے لیے مضبوط ارادہ انتہائی طور پر ضروری ہے۔ آدمی اگر غیر متعلق چیزوں سے متاثر ہو جایا کرے تو وہ یقیناً خدا کے راستہ سے ہٹ جائے گا۔ خدا کے راستہ پر قائم رہنے کے لیے صرف خدا کے حکم کو جاننا کافی نہیں، بلکہ یہ عزم بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ آدمی حکم خداوندی کے خلاف باتوں سے مزاحمت کرے اور ان کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دے۔

خدا نے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو فرشتے فوراً سجدہ میں گر گئے۔ مگر شیطان نے سجدہ نہیں کیا۔ اس فرق کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرشتوں نے اس معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھا۔ اس کے برعکس ابلیس نے اس کو انسان کا معاملہ سمجھا۔ جب معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھا جائے تو آدمی کے لیے ایک ہی ممکن صورت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔ مگر جب معاملہ کو انسان کا معاملہ سمجھ لیا جائے تو آدمی یہ کرے گا کہ وہ سامنے کے انسان کو دیکھے گا۔ اگر وہ اس سے طاقت ور ہے تو وہ جھک جائے گا اور اگر وہ اس سے طاقتور نہیں ہے تو وہ جھکنے سے انکار کر دے گا، خواہ حق کا واضح تقاضا یہی ہو کہ وہ اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔

آدم اور ابلیس کی یہ کہانی ہر انسان کی زندگی میں بار بار دہرائی جا رہی ہے۔ ہر آدمی کی زندگی میں یہ صورت پیش آتی ہے کہ زندگی کی سرگرمیوں میں اس کا سابقہ کسی صاحب حق انسان سے پڑتا ہے، یہ حق خواہ لین دین کی صورت میں ہو یا ایک سچی بات کی صورت میں۔ ہر ایسے موقع پر آدمی دوبارہ اسی امتحان میں کھڑا ہو جاتا ہے جو انسان اول کے ساتھ پیش آیا تھا۔ ایسے موقع پر جو آدمی حق کے آگے جھک جائے وہ گویا خدا کے آگے جھکا اور جو آدمی حق کے آگے نہ جھکے اس نے گویا شیطان کی پیروی کی۔

کائناتی نشانیاں

قرآن کی سورہ نمبر۲۲ میں ارشاد ہوا ہے۔ (اے انسان) کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے زمین کی چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔ اور کشتی کو بھی، وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے۔ اور وہ آسمان کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہے، مگر یہ کہ اسی کے حکم سے، بے شک اللہ لوگوں پر نرمی کرنے والا مہربان ہے۔ اور وہی ہے جس نے تم کو زندگی دی۔ پھر وہ تم کو موت دیتا ہے۔ پھر وہ تم کو زندہ کرے گا۔ بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے (الحج ۶۶ - ۶۵)

زمین کی تمام چیزیں ایک خاص توازن کو مسلسل اپنے اندر قائم رکھتی ہیں۔ اگر ان کا توازن بگڑ جائے تو چیزیں مفید بننے کے بجائے ہمارے لیے سخت مضر بن جائیں۔ پانی میں دھات کا ایک ٹکڑا ڈالیں تو وہ فوراً ڈوب جائے گا۔ مگر پانی کو خدا نے ایک خاص قانون کا پابند بنا رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ لکڑی یا لوہے کو کشتی کی صورت دے دی جائے تو وہ پانی میں نہیں ڈوبے گا۔ خلا میں بے شمار کرے ہیں۔ ان کو بظاہر گر پڑنا چاہیے مگر وہ خاص قانون کے تحت نہایت صحت کے ساتھ اپنے مدار پر ٹکے ہوئے ہیں۔

انسان نے اپنے آپ کو خود نہیں بنایا۔ اس کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ پھر اس کو ایسی دنیا میں رکھا جو اس کے لیے سراپا رحمت ہے۔ مگر آزادی پاکر انسان ایسا سرکش ہو گیا کہ وہ اپنے سب سے بڑے محسن کے احسان کا اعتراف نہیں کرتا۔

کائنات خود اپنی ذات میں ایک مکمل دلیل ہے۔ وہ ان تمام حقیقتوں کا عملی مظاہرہ ہے جن کے ماننے کا مطالبہ انسان سے نظری طور پر کیا گیا ہے۔ انسان اگر کائنات کے نظام پر غور کرے، وہ اس کی خاموش آوازوں پر کان لگائے، وہ اس کی حکمتوں سے اپنے لیے نصیحت حاصل کرے تو کائنات کی کھلی ہوئی کتاب ہی میں وہ تمام خدائی حقیقتوں کو پڑھ لے گا۔ مخلوقات کے آئینے میں وہ کامل طور پر خالق کو دیکھ لے گا۔

خدا کو پانا انتہائی حد تک ممکن ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ مطالعے کی استعداد اپنے اندر پیدا کرے۔

وصیت انسان

قرآن کی سورہ نمبر ۳۱ میں ارشاد ہوا ہے —— اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے معاملہ میں تاکید کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا۔ اور دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا۔ کہ تو میرا شکر کر اور اپنے والدین کا۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جو تجھ کو معلوم نہیں تو ان کی بات نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا۔ اور تم اس شخص کے راستہ کی پیروی کرنا جس نے میری طرف رجوع کیا۔ پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے۔ پھر میں تم کو بتا دوں گا جو کچھ تم کرتے رہے (لقمان ۱۵-۱۴)

خدا کے بعد انسان کے اوپر سب سے زیادہ حق ماں باپ کا ہے۔ البتہ اگر ماں باپ کا حکم خدا کے حکم سے ٹکرائے تو اس وقت خدا کا حکم لینا ہے اور ماں باپ کا حکم چھوڑ دینا ہے۔ تاہم اس وقت بھی یہ ضروری ہے کہ ماں باپ کی خدمت کو بدستور جاری رکھا جائے۔

خدا کے سلسلہ میں انسان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس کا شکر کرے۔ وہ دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ، خدا کی خدائی کا اعتراف کرے۔ اس کے تمام جذبات اور احساسات خدا کی نعمتوں کے اعتراف میں سرشار ہو جائیں۔ یہاں تک کہ وہ ہر لمحہ خدا کی یاد کرنے لگے، اس کا وجود سراپا خداوند ذوالجلال کا تذکرہ بن جائے۔

ماں باپ کے سلسلہ میں انسان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان کے حقوق ادا کرے۔ وہ ان کو عزت دے۔ وہ ہمیشہ ان کے مقابلہ میں نرمی کے ساتھ بولے۔ وہ ان کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ وہ کامل معنوں میں ان کا خدمت گزار بن جائے۔

اگر والدین کے حکم اور خدا کے تقاضوں میں ٹکراؤ ہو تو اس وقت انسان پر لازم ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آنے والے تقاضوں کو پورا کرے۔ ایسے وقت میں انسان پر والدین کے حکم کی پیروی ضروری نہیں، تاہم اس وقت بھی والدین کے ساتھ نرمی ہی کا معاملہ کرنا ضروری ہوگا۔ اخلاقی ذمہ داری کسی بھی حال میں انسان سے ساقط نہیں ہوتی۔

اختیارانہ اطاعت

قرآن کی سورہ نمبر۳۳ میں ارشاد ہوا ہے —— ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔ تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے۔ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں پر توجہ فرمائے۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے (الاحزاب ۷۲-۷۳)

انسان اور کائنات دونوں ہی خدا کی مخلوق ہیں۔ دونوں ہی سے یہ مطلوب ہے کہ وہ کامل طور پر خدا کی ماتحتی میں رہیں۔ تاہم دونوں میں ایک فرق ہے۔ کائنات مجبورانہ طور پر خدا کی ماتحتی کو قبول کیے ہوئے ہے۔ انسان سے مطلوب ہے کہ وہ اسی ماتحتی کو خود اپنے آزاد فیصلہ کے تحت اختیار کرے۔

"امانت" سے مراد یہی اختیار ہے۔ اختیار کو امانت اس لیے فرمایا کہ وہ اللہ کی ایک چیز ہے جس کو اس نے عارضی مدت کے لیے انسان کو بطور آزمائش دیا ہے۔ تاکہ انسان خود اپنے ارادہ سے خدا کا تابعدار بنے۔ امانت، دوسرے لفظوں میں، اپنے اوپر خدا کا قائم مقام بننا ہے۔ اپنے آپ پر وہ کرنا ہے جو خدا ستاروں اور سیاروں پر کر رہا ہے۔ یعنی اپنے اختیار سے اپنے آپ کو خدا کے کنٹرول میں دے دینا۔

اس کائنات میں صرف اللہ حاکم ہے اور تمام چیزیں اس کی محکوم ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوئی کہ وہ ایک ایسی آزاد مخلوق پیدا کرے جو کسی جبر کے بغیر خود اپنے اختیار سے وہی کرے جو خدا اس سے کروانا چاہتا ہے۔ یہ اختیاری اطاعت بڑی نازک آزمائش تھی۔ آسمان اور زمین اور پہاڑ بھی اس کا تحمل نہیں کر سکتے۔ تاہم انسان نے شدید اندیشہ کے باوجود اس کو قبول کر لیا۔ اب انسان موجودہ دنیا میں خدا کی ایک امانت کا امین ہے۔ اس کو اپنے اوپر وہی کرنا ہے جو خدا دوسری چیزوں پر کر رہا ہے۔ انسان کو اپنے اوپر خدا کا حکم چلانا ہے۔ انسان حالت امتحان میں ہے۔ اور موجودہ دنیا اس کے لیے وسیع امتحان گاہ۔

یہ "امانت" ایک بے حد نازک ذمہ داری ہے۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے جزا و سزا کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری مخلوقات مجبور و مقہور ہیں۔ اس لیے ان کے واسطے جزا و سزا کا مسئلہ نہیں۔ انسان آزاد ہے، اس لیے وہ جزا و سزا کا مستحق بنتا ہے۔

تزئین عمل

قرآن کی سورہ نمبر ۳۵ میں ارشاد ہوا ہے —— اے لوگو، بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ تو دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور نہ وہ بڑا دھوکہ باز تم کو اللہ کے باب میں دھوکہ دینے پائے۔ بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم اس کو دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے گروہ کو اسی لیے بلاتا ہے کہ وہ دوزخ والوں میں سے ہو جائیں۔ جن لوگوں نے انکار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کیا ان کے لیے معافی ہے اور بڑا اجر ہے۔ کیا ایسا شخص جس کو اس کا برا عمل اچھا کر کے دکھایا گیا، پھر وہ اس کو اچھا سمجھنے لگا۔ پس اللہ جس کو چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ پس ان پر افسوس کر کے تم اپنے کو ہلکان نہ کرو۔ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں (فاطر ۸-۵)

خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ زندگی کی نوعیت کے بارے میں جو خبر دی ہے آدمی فوراً اس سے دوچار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو دنیا کی چیزیں ہیں آدمی آج ہی ان سے دوچار ہو رہا ہے۔ موت اور زلزلہ اور حادثات گویا قیامت سے پہلے قیامت کی اطلاع ہیں۔ مگر شیطان فوراً ہی لوگوں کے ذہن کو یہ کہہ کر پھیر دیتا ہے کہ یہ سب اسباب کے تحت پیش آنے والے واقعات ہیں۔ نہ کہ خدائی مداخلت کے تحت۔ لیکن اس قسم کا ہر خیال شیطان کا فریب ہے۔ وہ دن آنا لازمی ہے جب کہ جھوٹ اور سچ میں تفریق ہو۔ جبکہ اچھے لوگوں کو ان کی اچھائی کا انعام ملے اور برے لوگوں کو ان کی برائی کی سزا دی جائے۔

خدا نے ہر آدمی کو یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ سوچے اور حق اور ناحق کے درمیان تمیز کر سکے۔ جو آدمی اپنی اس فطری صلاحیت کو استعمال کرتا ہے وہ ہدایت پاتا ہے۔ اور جو شخص اس فطری صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا وہ ہدایت نہیں پاتا۔

آدمی کے سامنے جب حق آئے تو فوراً اس کے ذہن کو جھٹکا لگتا ہے۔ اس وقت اس کے لیے دو راستے ہوتے ہیں۔ اگر وہ حق کا اعتراف کر لے تو اس کا ذہن صحیح سمت میں چل پڑتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ کوئی مصلحت یا کوئی نفسیاتی پیچیدگی اس کے سامنے آئے اور وہ اس سے متاثر ہو کر حق کا اعتراف کرنے سے رک جائے تو اس کا ذہن اپنے عدم اعتراف کو جائز ثابت کرنے کے لیے باتیں گھڑنا شروع کرتا ہے، وہ اپنے برے عمل کو اچھا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عہد فطرت

قرآن کی سورہ نمبر ۳۶ میں ارشاد ہوا ہے —— اور اے مجرمو، آج تم الگ ہو جاؤ۔ اے اولاد آدم، کیا میں نے تم کو تاکید نہیں کر دی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور یہ کہ تم میری ہی عبادت کرنا، یہی سیدھا راستہ ہے اور اس نے تم میں سے ایک کثیر گروہ کو گمراہ کر دیا۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں تھے۔ یہ ہے جہنم جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ اب اپنے کفر کے بدلے میں اس میں داخل ہو جاؤ۔ آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو کچھ یہ لوگ کرتے تھے (یٰس ۶۵ - ۵۹)

موجودہ زندگی میں اچھے لوگ اور برے لوگ ایک ہی دنیا میں رہتے ہیں۔ اگلی زندگی میں دونوں کی دنیائیں الگ الگ کر دی جائیں گی۔ شیطان کے بندے شیطان کے ساتھ اور رحمٰن کے بندے رحمٰن کے ساتھ۔

کوئی آدمی شیطان کے نام پر شیطان کی پرستش نہیں کرتا۔ مگر بالواسطہ طور پر غیر اللہ کا ہر پرستار دراصل شیطان کا پرستار ہے۔ کیونکہ وہ شیطان ہی کی تزئین کے تحت ایسا کر رہا ہے۔ مثلاً فرشتوں اور قومی بزرگوں کی پرستش اس طرح شروع ہوئی کہ شیطان نے ان کے بارے میں بے اصل عقیدے لوگوں کے ذہن میں ڈالے اور لوگ ان شیطانی ترغیبات سے متاثر ہو کر ان کی پرستش کرنے لگے۔

جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ انسان کی کھال ایک قسم کا ریکارڈ ہے جس پر آدمی کی بولی ہوئی آوازیں مرتسم ہو جاتی ہیں اور ان کو دہرایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک نشانی ہے جو اس بات کو قابل فہم بنا رہی ہے کہ کس طرح آخرت میں آدمی کے ہاتھ اور پاؤں آدمی کے احوال سنانے لگیں گے۔

ہر انسان کی فطرت یا اس کے لاشعور میں خدا کا تصور پیدائشی طور پر موجود ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر یہ مزاج رکھتا ہے کہ وہ خدا کو اپنا بڑا مان کر اس کے آگے جھک جائے۔ یہ گویا عہد فطرت ہے اور تمام انسان اس عہد فطری کے ذریعہ اپنے خدا سے بندھے ہوئے ہیں۔ انسان جب اس فطری رہنمائی کو کام میں لا کر خدا کی فرماں برداری کے راستہ پر چلتا ہے تو وہ خدا کی مقرر کی ہوئی صراط مستقیم کا مسافر بن جاتا ہے جو اس کو ابدی سعادت کی منزل تک پہنچا دے۔

علم اور بے علمی

قرآن کی سورہ نمبر ۳۹ میں ارشاد ہوا ہے ـــــ اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے۔ اس کی طرف رجوع ہو کر۔ پھر جب وہ اس کو اپنے پاس سے نعمت دے دیتا ہے تو وہ اس چیز کو بھول جاتا ہے جس کے لیے وہ پہلے پکار رہا تھا۔ اور وہ دوسروں کو خدا کا برابر ٹھہرانے لگتا ہے۔ تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کر دے۔ کہو کہ اپنے کفر سے تھوڑے دن فائدہ اٹھالے۔ بے شک تو آگ والوں میں سے ہے۔ بھلا جو شخص رات کی گھڑیوں میں سجدہ اور قیام کی حالت میں عاجزی کر رہا ہو۔ آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہو، کہو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ نصیحت تو وہی لوگ پکڑتے ہیں جو عقل والے ہیں (الزمر ۹ - ۸)

ہر آدمی پر ایسے لمحات آتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ جن چیزوں کو اپنا سہارا سمجھ رہا تھا وہ بھی اس نازک لمحہ میں اس کے مددگار نہیں بنتے۔ اس وقت آدمی سب کچھ بھول کر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اس طرح مصیبت کی گھڑیوں میں ہر آدمی جان لیتا ہے کہ ایک خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ مگر مصیبت دور ہوتے ہی وہ دوبارہ پہلے کی طرح بن جاتا ہے۔ انسان کی مزید کوتاہی یہ ہے کہ وہ اپنی نجات کو خدا کے سوا دوسری چیزوں کی طرف منسوب کرے۔ وہ اس کو اسباب کا کرشمہ بتائے یا فرضی معبودوں کا کرشمہ۔

ایک انسان وہ ہے جس کو صرف مادی غم بے قرار کرے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کو خدا کی یاد بے قرار کر دیتی ہو۔ یہی دوسرا انسان دراصل خدا والا انسان ہے۔ اس کا اقرارِ خدا حالات کا پیداوار نہیں ہوتا۔ وہ اس کی شعوری دریافت ہوتا ہے۔ وہ خدا کو ایک ایسی برتر ہستی کی حیثیت سے پاتا ہے کہ اس کی امیدیں اور اس کے اندیشے سب ایک خدا کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی بیقراریاں رات کے لمحات میں بھی اس کو بستر سے جدا کر دیتی ہیں۔ اس کی تنہائی غفلت کی تنہائی نہیں ہوتی بلکہ خدا کی یاد کی تنہائی بن جاتی ہے۔

علم والا وہ ہے جس کی نفسیات میں خدا کی یاد سے ہلچل پیدا ہوتی ہو۔ اور بے علم والا وہ ہے جس کی نفسیات کو صرف مادی حالات بیدار کریں۔ وہ مادی جھٹکوں سے جاگے اور اس کے بعد دوبارہ غفلت کی نیند سو جائے۔

ایک نصیحت

قرآن کی سورہ نمبر ۳۹ میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ (اے لوگو) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس کو زمین کے چشموں میں جاری کر دیا۔ پھر وہ اس سے مختلف قسم کی کھیتیاں نکالتا ہے۔ پھر یہ کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ تو تم ان کو زرد دیکھتے ہو۔ پھر وہ ان کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ بے شک اس میں نصیحت ہے عقل والوں کے لیے۔ کیا وہ شخص جس کا سینہ خدا نے اطاعتِ الٰہی کے لیے کھول دیا۔ پس وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر ہے۔ تو خرابی ہے ان کے لیے جن کے دل خدا کی نصیحت کے معاملہ میں سخت ہو گئے۔ یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں (الزمر ۲۱-۲۲)

زمین پر بارش کا حیرت انگیز نظام، پھر اس سے سبزہ کا اگنا، پھر فصل کی تیاری، ان مادی واقعات میں بے شمار معنوی نصیحتیں ہیں۔ مگر ان نصیحتوں کو وہی لوگ پاتے ہیں جو باتوں کی گہرائی میں اترنے کا مزاج رکھتے ہوں۔

ایک طرف خدا نے خارجی دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا کہ اس کی ہر چیز حقیقتِ اعلیٰ کی نشانی بن گئی۔ دوسری طرف انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں رکھ دیں کہ وہ ان نشانیوں کو پڑھے اور ان کو سمجھ سکے۔ اب وہ لوگ جو اپنی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھیں اور ان سے کام لے کر دنیا کی چیزوں پر غور کریں ان کے سینے میں معرفت کے دروازے کھل جائیں گے۔ اور جو لوگ اپنی فطری صلاحیتوں کو زندہ نہ رکھ سکیں وہ نصیحتوں کے ہجوم میں بھی نصیحت لینے سے محروم رہیں گے۔ وہ دیکھ کر بھی کچھ نہ دیکھیں گے اور سن کر بھی کچھ نہ سنیں گے۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آغاز سے تکمیل کی طرف جاتی ہے۔ مثلاً ایک بیج پودے سے شروع ہو کر مکمل درخت بنتا ہے۔ اسی طرح کھیتی کی ایک ابتدا ہے اور دوسری اس کی انتہا۔ یہی حال موجودہ دنیا میں تمام چیزوں کا ہے۔

یہ واقعہ انسان کے لیے خدائی سبق ہے۔ اس طرح خدا انسان کو بتاتا ہے کہ تم بھی آغاز سے تکمیل کی طرف جا رہے ہو۔ بچپن کے بعد جوانی اور بڑھاپا، اور پھر مر کر ایک نئی اور ابدی زندگی کی منزل میں داخل ہو جانا۔

اچھا عمل

قرآن کی سورہ نمبر ۴۶ میں ارشاد ہوا ہے ——— اور ہم نے انسان کو حکم دیا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے۔ اس کی ماں نے تکلیف کے ساتھ اس کو پیٹ میں رکھا۔ اور تکلیف کے ساتھ اس کو جنا۔ اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہوا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا اور چالیس برس کو پہنچ گیا تو وہ کہنے لگا کہ اے میرے رب، مجھے توفیق دے کہ میں تیرے احسان کا شکر کروں جو تونے مجھ پر کیا اور میرے ماں باپ پر کیا اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو۔ اور میری اولاد میں بھی مجھ کو نیک اولاد دے۔ میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ یہ لوگ ہیں جن کے اچھے اعمال کو ہم قبول کریں گے اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے۔ وہ اہلِ جنّت میں سے ہوں گے، سچا وعدہ جو ان سے کیا جاتا تھا (الاحقاف ۱۶-۱۵)

انسانی نسل کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی ایک ماں اور ایک باپ کے ذریعہ وجود میں آتا ہے جو اس کی پرورش کرکے اس کو بڑا بناتے ہیں۔ یہ گویا انسان کی تربیت کا فطری نظام ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اس کے ذریعہ سے انسان کے اندر حقوق و فرائض کا شعور پیدا ہو۔ اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو کہ اسے اپنے محسن کا احسان ماننا ہے اور اس کا حق ادا کرنا ہے۔ یہ جذبہ بیک وقت انسان کو دوسرے انسانوں کے حقوق ادا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ خالق و مالک خدا کے عظیم تر حقوق کو ادا کرنے کی تعلیم بھی۔

جو لوگ فطرت کے معلم سے سبق لیں، جو لوگ اپنے شعور کو اس طرح بیدار کریں کہ وہ اپنے والدین سے لے کر اپنے خدا تک، ہر ایک کے حقوق کو پہچانیں اور ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کریں، وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں خدا کی ابدی رحمتوں کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔

ہر آدمی کا گھر اس کی پہلی تربیت گاہ ہے۔ یہ تربیت ماں اور باپ سے شروع ہوتی ہے اور پھر پورے سماج تک پھیل جاتی ہے۔ آدمی اگر اس ابتدائی تربیت گاہ کی تربیت بھرپور طور پر قبول کرلے تو وہ نہ صرف بندوں کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہو جائے بلکہ خدا کے وسیع تر حقوق بھی۔

انسانی امتیاز

قرآن کی سورہ نمبر ۴۹ میں ارشاد ہوا ہے —— اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے (الحجرات ۱۳)

انسان بظاہر ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دیتے ہیں مگر سب کے سب ایک ہی ابتدائی باپ اور ماں کی اولاد ہیں جن کو آدم اور حوّا کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسان جیسی ایک مخلوق کو پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا تو سب سے پہلے اس نے ایک ابتدائی جوڑا پیدا کیا، ایک مرد اور ایک عورت۔ اسی ابتدائی جوڑے سے انسانی نسل کا آغاز ہوا۔ جیسے جیسے انسانوں کی تعداد بڑھتی گئی وہ زمین کے مختلف حصوں میں پھیلنے لگے یہاں تک کہ لمبی مدت کے بعد پوری زمین مردوں اور عورتوں سے آباد ہو گئی۔

زمین پر جغرافی حالات ہر جگہ یکساں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک حصہ اور دوسرے حصہ میں فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً کسی حصہ میں سخت گرمی ہے اور کسی حصہ میں سخت سردی۔ کسی حصہ میں خوراک کا زیادہ بڑا ذریعہ گوشت ہے اور کسی حصہ میں خوراک کا زیادہ بڑا ذریعہ زرعی پیداوار، وغیرہ۔

اس جغرافی فرق سے لوگوں کے رنگ اور حلیہ اور قد اور مزاج میں بھی فرق آتا چلا گیا۔ اس طرح کوئی سفید ہو گیا کوئی کالا، کوئی ایک نسل سے ہے اور کوئی دوسری نسل سے، یہ تمام فرق اضافی ہیں نہ کہ حقیقی۔ وہ صرف تعارف کے لیے ہیں نہ کہ امتیاز کے لیے۔ اکثر خرابیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس ظاہری فرق کو حقیقی فرق سمجھنے لگتے ہیں اور اس کی بنا پر ایک دوسرے کے درمیان فرق کرنے لگتے ہیں۔ اس سے وہ تفریق اور تعصب وجود میں آتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

انسان اپنے آغاز کے اعتبار سے سب کے سب ایک ہیں۔ ان میں امتیاز کی اگر کوئی بنیاد ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کون اللہ سے ڈرنے والا ہے اور کون اللہ سے ڈرنے والا نہیں۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق ان کی حقیقی صفات کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ ان کی ظاہری خصوصیات کی بنیاد پر۔

خدائی نگرانی

قرآن کی سورہ نمبر ۵۰ میں ارشاد ہوا ہے —— اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں ان باتوں کو جو اس کے دل میں آتی ہیں۔ اور ہم رگ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ جب دو لینے والے لیتے رہتے ہیں جو کہ دائیں اور بائیں طرف بیٹھے ہیں۔ کوئی لفظ وہ نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک مستعد نگراں موجود ہے۔ اور موت کی بے ہوشی حق کے ساتھ آپہنچی۔ یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔ اور صور پھونکا جائے گا۔ یہ ڈرانے کا دن ہوگا۔ ہر شخص اس طرح آگیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔ تم اس سے غفلت میں رہے۔ پس ہم نے تمہارے اوپر سے پردہ ہٹا دیا۔ پس آج تمہاری نگاہ تیز ہے۔ اور اس کے ساتھ کا فرشتہ کہے گا۔ یہ جو میرے پاس تھا حاضر ہے۔ جہنم میں ڈال دو ناشکر، مخالف کو۔ نیکی سے روکنے والا، حد سے بڑھنے والا، شبہہ ڈالنے والا۔ جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بنائے۔ پس اس کو ڈال دو سخت عذاب میں۔ اس کا ساتھی شیطان کہے گا کہ اے ہمارے رب میں نے اسے سرکش نہیں بنایا بلکہ وہ خود راہ بھولا ہوا، دور پڑا تھا۔ ارشاد ہوگا، میرے سامنے جھگڑا نہ کرو اور میں نے پہلے ہی تم کو عذاب سے ڈرا دیا تھا۔ میرے یہاں بات بدلی نہیں جاتی۔ اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں (ق ۲۹ - ۱۶)

دنیا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں "ریکارڈنگ" کا ناقابل خطا نظام موجود ہے۔ انسان کی سوچ اس کے ذہنی پردہ پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو رہی ہے۔ انسان کا ہر بول ہوائی لہروں کی صورت میں مستقل طور پر باقی رہتا ہے۔ انسان کا عمل حرارتی لہروں کے ذریعہ خارجی دنیا میں اس طرح محفوظ ہو جاتا ہے کہ اس کو کسی بھی وقت دہرایا جا سکے۔ یہ سب آج کی معلوم حقیقتیں ہیں۔ اور یہ معلوم حقیقتیں قرآن کی اس خبر کو قابل فہم بنا رہی ہیں کہ انسان کی نیت، اس کا قول اور اس کا عمل سب کچھ خالق کے علم میں ہے۔ انسان کی ہر چیز فرشتوں کے رجسٹر میں درج کی جا رہی ہے۔

ان آیتوں میں موت اور اس کے بعد آنے والی قیامت کا منظر کھینچا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وہاں ان لوگوں پر کیا بیتے گی جو موجودہ امتحان کی دنیا میں اپنے کو آزاد پا کر سرکش بنے ہوئے تھے۔ یہ منظر کشی بجائے خود اتنی واضح ہے کہ اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

مقصدِ حیات

قرآن کی سورہ نمبر۵۱ میں ارشاد ہوا ہے —— اور میں نے جن اور انسان کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں ان سے رزق نہیں چاہتا۔ اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلائیں۔ بیشک اللہ ہی روزی دینے والا ہے، زور آور، زبردست ہے۔ پس جن لوگوں نے ظلم کیا ان کا ڈول بھر چکا ہے جیسے ان کے ساتھیوں کے ڈول بھرے تھے۔ پس وہ جلدی نہ کریں۔ پس منکروں کے لیے خرابی ہے ان کے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے (الذاریات ۶۰-۵۶)

خدا ہر قسم کا ذاتی اختیار رکھتا ہے۔ تاہم فرشتوں کو اس نے اپنی وسیع سلطنت کا انتظام کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ مگر انسانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انسان اس لیے پیدا نہیں کیے گئے کہ وہ خدا کی کسی شخصی یا انتظامی ضرورت کو پورا کریں۔ ان کی پیدائش کا واحد مقصد خدا کی عبادت ہے۔ عبادت کا مطلب اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکانا ہے۔ اپنے آپ کو پوری طرح خدا کا پرستار بنا دینا ہے۔

اس عبادت کا خلاصہ معرفت ہے۔ چنانچہ ابن جُریج نے الا لیعبدون کی تشریح الا لیعرفون کی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) یعنی انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کو بطور دریافت کے پائے۔ وہ بن دیکھے خدا کو پہچانے۔ اسی کا نام معرفت ہے۔ اس معرفت کے نتیجہ میں آدمی کی جو زندگی بنتی ہے اسی کو عبادت و بندگی کہا جاتا ہے۔

پانی کا ڈول بھرنے کے بعد ڈوب جاتا ہے۔ اسی طرح آدمی کی مہلتِ عمل پوری ہونے کے بعد فوراً اس کی موت آجاتی ہے۔ جو شخص ڈول بھرنے سے پہلے اپنی اصلاح کر لے اس نے اپنے آپ کو بچایا۔ اور جو شخص آخر وقت تک غافل رہا وہ ہلاک ہوگیا۔

ظالم لوگ اگر پکڑے نہ جا رہے ہوں تو انھیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ چھوڑ دیے گئے ہیں، وہ اس لیے آزاد ہیں کہ خدا کا طریقہ جلدی پکڑنے کا طریقہ نہیں، نہ کہ اس لئے کہ خدا انہیں پکڑنے والا نہیں۔

خدا نے انسان کو اپنی ذات کی تکمیل کے لیے نہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ اس طرح خود انسان کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ موجودہ امتحان کی دنیا میں اپنے آپ کو خدا کا سچا بندہ ثابت کرے تاکہ وہ خدا کی ابدی نعمتوں کا حق دار بن سکے۔

پیغمبرانہ رہنمائی

قرآن کی سورہ نمبر ۵۳ میں ارشاد ہوا ہے —— کیا انسان کو خبر نہیں پہنچی اس بات کی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے۔ اور ابراہیم کے، جس نے اپنا قول پورا کر دیا۔ کہ کوئی اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور یہ کہ انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کمایا۔ اور یہ کہ اس کی کمائی عنقریب دیکھی جائے گی۔ پھر اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور یہ کہ سب کو تمہارے رب تک پہنچنا ہے (النجم ۴۲ - ۳۶)

اللہ تعالےٰ نے جب انسان کو پیدا کیا تو اسی کے ساتھ اس کی ہدایت کے لیے پیغمبروں کا سلسلہ قائم فرمایا۔ ہر دور میں اور ہر قوم میں پیغمبر آتے رہے اور وہ انسانوں تک خدا کی ہدایت پہنچاتے رہے۔ زندگی گزارنے کا سامان لوگوں کو خود اسی دنیا سے ملتا رہا۔ لیکن زندگی کے اصول اس کے پاس بار بار آسمان سے بھیجے جاتے رہے۔

ہر پیغمبر یکساں طور پر خدا کا سچا نمائندہ تھا۔ مگر زمانہ گزرنے کے ساتھ پچھلے پیغمبروں کی کتابیں اور ان کی ہدایات یا تو مٹتی رہیں یا بدلتی رہیں۔ یہاں تک کہ آخر میں خدا نے پیغمبر عربی کو قرآن کے ساتھ بھیجا اور آپ کی لائی ہوئی ہدایت کو کامل طور پر محفوظ کر دیا تاکہ ہر دور کے انسانوں کے لیے وہ مستند رہنمائی کا ذریعہ بنی رہے۔

پیغمبروں کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے جو حقیقت کھولی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر آدمی کو لازماً اپنے عمل کا بدلہ پانا ہے۔ نہ کوئی شخص اپنے عمل کے انجام سے بچ سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا شخص کسی کو بچانے والا بن سکتا ہے۔ جو لوگ اس پیغمبرانہ چیتاونی سے متنبہ نہ ہوں ان سے بڑا نادان خدا کی اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

خدا کی نسبت سے انسان کا جو معاملہ ہے اس میں ہر آدمی اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے۔ کوئی بھی آدمی نہ دوسرے کے انجام میں شریک ہو سکتا ہے اور نہ کوئی آدمی کسی بھی اعتبار سے دوسرے شخص کا مددگار بن سکتا ہے۔ خدا کی دنیا میں ہر آدمی کے لیے صرف وہی ہے جس کے لیے اس نے خود محنت کی ہو، ایک کی محنت کسی بھی حال میں دوسرے کے کام آنے والی نہیں۔

ٹھیک تول

قرآن کی سورہ نمبر ۵۵ میں ارشاد ہوا ہے —— خدائے رحمٰن، اس نے قرآن کی تعلیم دی، اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کو بولنا سکھایا۔ سورج اور چاند کے لیے ایک حساب ہے۔ اور ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔ اور اس نے آسمان کو اونچا کیا۔ اور اس نے ترازو رکھ دی۔ کہ تم تولنے میں زیادتی نہ کرو۔ اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو۔ اور تول میں نہ گھٹاؤ (الرحمٰن ۹-۱)

انسان کو پیدا کرنا اور اس کے لیے آسمانی ہدایت اتارنا دونوں ہی خدا کی صفتِ رحمت کا ظہور ہیں۔ انسان کو پیدا کر کے خدا نے اس کو یہ موقع دیا کہ وہ زمین و آسمان میں اعلیٰ ترقی کا مقام حاصل کرے۔ وہ خوشیوں اور لذتوں کی ایک ابدی دنیا اپنے لیے پالے۔

اس کے بعد پیغمبر کی بعثت اور آسمانی کتاب کا نزول گویا اس نعمتِ الٰہی کا اتمام ہے۔ اس طرح انسان کو یہ موقع فراہم کیا گیا کہ وہ صحیح رہنمائی کے ساتھ یہاں اپنی زندگی کا آغاز کرے۔ وہ اِدھر اُدھر بھٹکے بغیر اس سیدھی شاہراہ پر اپنا سفر جاری رکھے جو اس کو منزلِ مقصود تک پہنچانے والی ہے۔

خدا نے انسان کو بنایا۔ اس کو نطق کی انوکھی صلاحیت دی جو ساری معلوم کائنات میں کسی کو حاصل نہیں۔ پھر انسان سے جو عادلانہ روش مطلوب تھی اس کا عملی نمونہ اس نے کائنات میں قائم کر دیا۔

انسان کے گرد و پیش کی پوری دنیا عین اسی اصولِ عدل پر قائم ہے جو انسان سے خدا کو مطلوب ہے۔ اور قرآن میں اسی عدل کو لفظی طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ قرآن خدائی عدل کا لفظی اظہار ہے اور کائنات خدائی عدل کا عملی اظہار۔ بندوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے قول و عمل کو اسی ترازو سے ناپتے رہیں۔ وہ نہ لینے میں بے انصافی کریں اور نہ دینے میں۔

ترازو عدل کی علامت ہے۔ وہ کسی چیز کو ٹھیک معیاری وزن کے مطابق تول دیتا ہے۔ یہ ترازو بتاتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں لینے اور دینے کے معاملہ میں کیا اصول اختیار کرنا چاہیے۔ اس کو چاہیے کہ اپنے قول و عمل میں یکسانیت پیدا کرے۔ اس کی ہر روش اس معیار کے مطابق ہو جو حق و صداقت کا معیار ہے۔

ہار جیت کا دن

قرآن کی سورہ نمبر ۶۴ میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ (اے لوگو) خدا ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کوئی ماننے والا ہے۔ اور کوئی نہ ماننے والا، اور خدا دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر پیدا کیا۔ اور اس نے تمہاری صورت بنائی تو نہایت اچھی صورت بنائی اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور خدا دلوں تک کی باتوں کا جاننے والا ہے ۔۔۔ انکار کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ہرگز دوبارہ اٹھائے نہ جائیں گے۔ کہو کہ ہاں میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔ پھر تم کو بتایا جائے گا۔ جو کچھ تم نے کیا ہے۔ اور یہ خدا کے لیے بہت آسان ہے۔ پس خدا پر ایمان لاؤ۔ اور اس کے پیغمبر پر اور اس نور پر جس کو ہم نے اتارا ہے۔ وہ خدا جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ جس دن وہ تم سب کو ایک جمع ہونے کے دن جمع کرے گا۔ یہی دن ہار جیت کا دن ہوگا اور جو شخص خدا پر ایمان لایا ہوگا۔ اور اس نے نیک عمل کیا ہوگا۔ خدا اس کے گناہ اس سے دور کر دے گا۔ اور اس کو باغوں میں داخل کرے گا۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی (التغابن ۲-۹)

کسی شخص کو دنیا میں کامیابی مل جائے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور جو شخص یہاں ناکامی سے دوچار ہو وہ لوگوں کی نظر میں حقیر بن کر رہ جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں کی ہار بھی بے قیمت ہے اور جیت بھی۔

ہار جیت کا اصل مقام آخرت ہے۔ ہارنے والا وہ ہے جو آخرت میں ہارے۔ اور جیتنے والا وہ ہے جو آخرت میں جیتے۔ اور وہاں کی ہار جیت کا معیار بالکل مختلف ہے۔ دنیا میں ہار جیت ظاہری مادیات کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اور آخرت کی ہار جیت خدائی معیار کی بنیاد پر ہوگی۔ اس وقت دیکھنے والے یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ یہاں سارا معاملہ بالکل بدل گیا ہے۔ جس پانے کو لوگ پانا سمجھ رہے تھے وہ دراصل کھونا تھا۔ اور جس کھونے کو لوگوں نے کھونا سمجھ رکھا تھا وہی دراصل وہ چیز تھی جس کو پانا کہا جائے۔

تخلیقی منصوبہ

قرآن کی سورہ نمبر۶۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ (اے لوگو) بڑا بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے۔ اور وہ زبردست ہے۔ بخشنے والا ہے۔ جس نے بنائے سات آسمان۔ اوپر تلے، تم رحمٰن کے بنانے میں کوئی خلل نہیں دیکھو گے۔ پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو۔ کیا تم کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو۔ نگاہ ناکام تھک کر تمہاری طرف واپس آجائے گی۔ اور ہم نے قریب کے آسمانوں کو چراغوں سے سجایا ہے۔ اور ہم نے ان کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور ہم نے ان کے لیے دوزخ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جن لوگوں نے اپنے رب کا انکار کیا۔ ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ اور وہ بُرا ٹھکانا ہے (الملک ۱ - ۶)

جب ایک شخص موجودہ دنیا کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کو یہاں بظاہر ایک تضاد نظر آتا ہے۔ انسان کے سوا جو بقیہ کائنات ہے وہ انتہائی حد تک منظم اور کامل ہے۔ اس میں کہیں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس انسانی زندگی میں ظلم و فساد نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ انسان کی علاحدہ نوعیت ہے۔ انسان اس دنیا میں حالتِ امتحان میں ہے۔ امتحان لازمی طور پر عمل کی آزادی چاہتا ہے۔ اس عمل کی آزادی نے انسان کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ دنیا میں ظلم و فساد کر سکے۔

انسانی دنیا کا ظلم انسانی آزادی کی قیمت ہے۔ اگر یہ حالات نہ ہوں تو ان قیمتی انسانوں کا انتخاب کیسے کیا جائے گا جنھوں نے ظلم کے مواقع پاتے ہوئے ظلم نہیں کیا، جنھوں نے سرکشی کی طاقت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو سرکشی سے بچایا۔

انسان کے سوا کائنات میں جو دوسری چیزیں ہیں ان کے لیے نہ جنّت ہے اور نہ جہنم مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔ انسان کو استثنائی طور پر حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت دی گئی ہے۔ حال کا یہ فرق مستقبل کے فرق کی ایک علامت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار انسان کا جائزہ لیا جائے گا۔ اور اس کے بعد امتحان میں کامیاب ہونے والوں کو انعام ملے گا۔ اور جو لوگ ناکام ہوں گے وہ سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔

اندرونی شہادت

قرآن کی سورہ نمبر ۷۵ میں ارشاد ہوا ہے ـــــــ نہیں، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔ اور نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔ کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کریں گے۔ کیوں نہیں، ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کی پور پور تک درست کر دیں۔ بلکہ انسان چاہتا ہے کہ ڈھٹائی کرے اس کے سامنے۔ وہ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا۔ پس جب آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ اور چاند بے نور ہو جائے گا۔ اور سورج اور چاند اکٹھا کر دیے جائیں گے۔ اس دن انسان کہے گا کہ کہاں بھاگوں۔ ہرگز نہیں، کہیں پناہ نہیں۔ اس دن تیرے رب ہی کے پاس ٹھکانا ہے۔ اس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ بلکہ انسان خود اپنے آپ کو جانتا ہے، چاہے وہ کتنے ہی بہانے پیش کرے (القیامہ ۱۵-۱)

ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر ایک صلاحیت موجود ہے۔ اس کو نفس لوّامہ یا ضمیر کہا جاتا ہے۔ یہ صلاحیت آدمی کے اندر آزادانہ طور پر کام کرتی ہے۔ وہ اس کی عقل اور اس کی خواہش دونوں سے غیر متاثر رہ کر بار بار اس کو یہ بتاتی ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

یہ ضمیر گویا خدا کی عدالت ہے۔ وہ پیشگی طور پر انسان کو اس کی غلطیوں سے خبردار کرتی ہے۔ وہ بار بار اس کو بتاتی ہے کہ اس کے لیے درست رویہ کیا ہے اور غلط رویہ کیا ہے۔ اس کے باوجود انسان خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح زندگی گزارتا ہے جیسے کہ قیامت کا دن آنے والا نہیں ہے جب کہ اس سے اس کے قول و عمل کا حساب لیا جائے گا۔

جو آدمی اس قسم کا رویہ اختیار کرے وہ گویا خود اپنی فطرت کا انکار کر رہا ہے۔ خود اس کا اندرون اس کو آواز دیتا ہے مگر وہ اس کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا ضمیر پیشگی طور پر اس کے حق میں خدائی فیصلہ کا اعلان ہے۔ آدمی اگر اس آواز پر کان لگائے تو وہ موت سے پہلے ہی یہ جان لے گا کہ موت کے بعد اس کے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے۔

دو راستے

قرآن کی سورہ نمبر ۷۶ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— کبھی انسان پر زمانہ میں ایک وقت گزرا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ ہم نے انسان کو ایک مخلوط بوند سے پیدا کیا، ہم اس کو پلٹتے رہے۔ پھر ہم نے اس کو سننے والا، دیکھنے والا بنا دیا۔ ہم نے اس کو راہ سجھائی چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا انکار کرنے والا۔ ہم نے منکروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ نیک لوگ ایسے پیالے سے پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی، اس چشمہ سے خدا کے بندے پئیں گے۔ وہ اس کی شاخیں نکالیں گے۔ وہ لوگ واجبات کو پورا کرتے ہیں۔ اور ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی عام ہوگی۔ اور اس کی محبت پر کھانا کھلاتے ہیں۔ محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو۔ ہم جو تم کو کھلاتے ہیں۔ تو خدا کی خوشی چاہنے کے لیے ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکر گزاری۔ ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ پس خدا نے ان کو اس دن کی سختی سے بچا لیا۔ اور ان کو تازگی اور خوشی عطا فرمائی اور ان کے صبر کے بدلہ میں ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا کیا (الدھر ۱-۱۲)

دنیا میں انسان کو آزاد پیدا کیا گیا۔ اور پھر اس کو راہ دکھا دی گئی۔ ناشکری کی راہ اور شکر گزار زندگی کی راہ۔ اب یہ انسان کے اپنے اوپر ہے کہ وہ دونوں میں سے کون سی راہ اختیار کرتا ہے۔ جو شخص ناشکری کا طریقہ اختیار کرے اس کے لیے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہے۔ اور جو شخص شکر گزاری کا طریقہ اختیار کرے اس کے لیے جنت کی نعمتیں۔

جو آدمی خدا کو پہچان لے، اسی کے ساتھ وہ تمام حقیقتوں کو بھی پہچان لیتا ہے۔ خدا کا علم اس کے اوپر دوسرے تمام علوم کے دروازے کھول دیتا ہے۔ وہ اگر ایک طرف خداشناس بنتا ہے تو دوسری طرف وہ پورے معنوں میں حقیقت شناس بھی بن جاتا ہے۔ اس کی یہ معرفت اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ خدا کے حقوق بھی ادا کرے اور اسی کے ساتھ دوسرے انسانوں کے حقوق بھی۔

فطرت اور شریعت میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

نظامِ خداوندی

قرآن کی سورہ نمبر۷۹، میں ارشاد ہوا ہے ـــــــ کیا تمہارا بنانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا، اللہ نے اس کو بنایا۔ اس کی چھت کو بلند کیا۔ پھر اس کو درست بنایا۔ اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو ظاہر کیا۔ اور زمین کو اس کے بعد پھیلایا۔ اس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔ اور پہاڑوں کو قائم کر دیا، سامانِ حیات کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے۔ پھر جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا۔ جس دن انسان اپنے کیے کو یاد کرے گا۔ اور دیکھنے والوں کے سامنے دوزخ ظاہر کر دی جائے گی۔ پس جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی، تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہوگا اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا، تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا۔ وہ قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب کھڑی ہوگی۔ تم کو کیا کام اس کے ذکر سے۔ یہ معاملہ تیرے رب کے حوالے ہے تم تو بس ڈرانے والے ہو اس شخص کو جو ڈرے۔ جس روز یہ اس کو دیکھیں گے تو گویا وہ دنیا میں نہیں ٹھہرے مگر ایک شام یا اس کی صبح (النازعات ۴۶-۲۷)

کائنات کی صورت میں جو واقعہ ہمارے سامنے موجود ہے وہ اتنا زیادہ بڑا ہے کہ اس کے بعد ہر دوسرا واقعہ اس سے چھوٹا ہو جاتا ہے۔ پھر جس دنیا میں بڑے واقعہ کا ظہور ممکن ہو وہاں چھوٹے چھوٹے واقعہ کا ظہور کیوں ممکن نہ ہوگا۔ ایسی حالت میں قرآن کی یہ خبر کہ انسان کو دوبارہ پیدا ہونا ہے ایک ایسی خبر ہے جس کو قابلِ فہم بنانے کے لیے پہلے ہی سے بہت بڑے پیمانے پر معلوم اسباب موجود ہیں۔

آدمی دو چیزوں کے درمیان ہے۔ ایک موجودہ دنیا جو سامنے ہے۔ اور دوسرے، آخرت کی دنیا جو غیب میں ہے۔ آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دے۔ مگر یہ کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے نفس کی خواہشوں پر کنٹرول کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

انسان کو موجودہ دنیا میں آزمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔ آزمائش لازمی طور پر آزادی چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو کائنات کے بقیہ اجزاء کی طرح مجبور نہیں کیا گیا۔ اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو اپنے آپ کو نظامِ خداوندی کے مطابق بنائے۔ اور چاہے تو اس سے منحرف ہو جائے۔ مگر یہ آزادی صرف عمل کے لیے ہے نہ کہ انجام کے لیے۔ انسان کا آخری انجام بہرحال وہی ہونا ہے جو خدا کے محکم قانون کے مطابق اس کا ہونا چاہیے۔

نعمتِ طعام

قرآن کی سورہ نمبر ۸۰ میں ارشاد ہوا ہے ——— پس انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے کھانے کو دیکھے۔ ہم نے پانی برسایا اچھی طرح۔ پھر ہم نے زمین کو اچھی طرح پھاڑا۔ پھر اگائے اس میں غلّے اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغ اور پھل اور سبزہ، تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان حیات کے طور پر۔ پس جب وہ کانوں کو بہرہ کر دینے والا شور برپا ہوگا۔ جس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ ان میں سے ہر شخص کو اس دن ایسا فکر لگا ہوگا جو اس کو کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔ کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہنستے ہوئے، خوشی کرتے ہوئے۔ اور کچھ چہروں پر اس دن خاک اڑ رہی ہوگی۔ ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی لوگ منکر ہیں، ڈھیٹ ہیں (عبس ۴۲ - ۲۴)

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کو زندہ رہنے کے لیے مسلسل خوراک کی ضرورت ہے۔ اس خوراک کا انتظام ہماری زمین پر نہایت وسیع پیمانہ پر کیا گیا ہے، جب کہ اس انتظام میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔ اس خوراک کا ایک انتظام وہ ہے جو ہمارے لیے زرعی پیداوار کی صورت میں کیا گیا ہے، زمین پر پانی کا انتظام اور پانی کے ذریعہ طرح طرح کے غلّے اور میوے کا پیدا ہونا۔ اس زرعی پیداوار کی حیثیت ہمارے لیے براہ راست خوراک کی ہے۔ دوسری خوراک وہ ہے جس کو بالواسطہ طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ یعنی حیوانات کا زمینی پیداوار کو کھا کر اس کو گوشت کی صورت میں تبدیل کرنا۔

اس نعمت کا تقاضا ہے کہ انسان دنیا میں خدا پرست بن کر رہے۔ یہ خدا پرستی جو انسان سے مطلوب ہے اس کا محرک اصلاً شکر ہے۔ انسان اپنی تخلیق کو سوچے اور اپنے گردوپیش کے قدرتی انتظامات پر غور کرے تو لازماً اس کے اندر اپنے رب کے بارہ میں شکر کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس شکر اور احسان مندی کے جذبہ کے تحت جس عمل کا ظہور ہوتا ہے اسی کا نام خدا پرستی ہے۔

آخرت کی عزتیں اور کامیابیاں صرف ایسے ہی لوگوں کا حصہ ہوں گی۔

ایھا الانسان

قرآن کی سورہ نمبر ۸۲ میں انسان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے ـــــ اے انسان، تجھ کو کس چیز نے اپنے رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ جس نے تجھ کو پیدا کیا۔ پھر تیرے اعضاء کو درست کیا۔ پھر تجھ کو متناسب بنایا۔ جس صورت میں چاہا تم کو ترتیب دے دیا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہو۔ حالاں کہ تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔ بے شک نیک لوگ عیش میں ہوں گے۔ اور بے شک گنہ گار دوزخ میں۔ انصاف کے دن وہ اس میں ڈالے جائیں گے۔ وہ اس سے جدا ہونے والے نہیں۔ اور تم کو کیا خبر کہ انصاف کا دن کیا ہے۔ پھر تم کو کیا خبر انصاف کا دن کیا ہے۔ اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے لیے کچھ نہ کر سکے گی۔ اور معاملہ اس دن اللہ ہی کے اختیار میں ہوگا (الانفطار ۱۹-۶)

انسان معلوم کائنات کی سب سے زیادہ بامعنی مخلوق ہے۔ انسان کو ایک ایسا جسم دیا گیا ہے، جو انتہائی حد تک موزوں ہے۔ اس کو ایک ایسا دماغ دیا گیا ہے، جس سے بہتر عطیہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کے ساتھ جس دنیا میں انسان کو رکھا گیا ہے، وہ بھی ناقابلِ بیان حد تک انسانی ضروریات کے مطابق ہے۔

عطیہ ہمیشہ اپنے ساتھ ذمہ داری لاتا ہے۔ یہی فطری اصول انسان کے معاملہ میں بھی ہے۔ انسان کو جو غیر معمولی عطیہ ملا ہے وہ خود اس بات کا اعلان ہے کہ اس کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی جڑی ہوئی ہیں۔

وہ ذمہ داری یہ ہے کہ انسان خدا کی نعمتوں کو خدا کی امانت سمجھے۔ وہ خدا کے عطیات میں خدا کی مرضی کے مطابق تصرف کرے۔

انسان کی بامعنی تخلیق ایک انتہائی بامعنی مقصد کے لیے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک دن اس کو انصاف کی عدالت میں کھڑا کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کس نے خدا کی دی ہوئی چیزوں میں صحیح تصرف کیا۔ اور وہ کون ہے جو اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔ یہ انصاف کا دن جو موت کے بعد آنے والا ہے، اس دن خدا تمام انسانوں کو اپنے ریکارڈ کے مطابق جانچے گا، اس جانچ میں جو لوگ پورے اتریں ان کے لیے جنت ہے، اور جو لوگ اس جانچ میں پورے نہ اتریں ان کے لیے جہنم۔

اے انسان

قرآن کی سورہ نمبر ۸۴ میں ارشاد ہوا ہے —— جب آسمان پھٹ جائے گا اور وہ اپنے رب کا حکم سن لے گا اور وہ اسی لائق ہے۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔ اور وہ اپنے اندر کی چیزوں کو اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔ اور وہ اپنے رب کا حکم سن لے گی اور وہ اسی لائق ہے۔ اے انسان تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف جا رہا ہے۔ پھر اس سے ملنے والا ہے۔ تو جس کو اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ اور وہ اپنے لوگوں کے پاس خوش خوش آئے گا اور جس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا، وہ موت کو پکارے گا اور جہنم میں داخل ہوگا۔ وہ اپنے لوگوں میں بے غم رہتا تھا۔ اس نے خیال کیا تھا کہ اس کو لوٹنا نہیں ہے۔ کیوں نہیں۔ اس کا رب اس کو دیکھ رہا تھا۔ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی۔ اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ سمیٹ لیتی ہے۔ اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔ کہ تم کو ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے۔ تو انھیں کیا ہو گیا کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ خدا کی طرف نہیں جھکتے۔ بلکہ منکرین جھٹلا رہے ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں۔ پس ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے (الانشقاق ۲۵-۱)

یہاں قیامت سے متعلق جو بات کہی گئی ہے وہ بظاہر نامعلوم دنیا کے بارہ میں ایک خبر کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم ایسے شواہد موجود ہیں جو اس کی صداقت کا قرینہ پیدا کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال موجودہ دنیا ہے۔ ایک دنیا کی موجودگی خود اس بات کا ثبوت ہے کہ دوسری ایسی ہی یا اس سے بہتر دنیا وجود میں آسکتی ہے۔ دوسرے، قرآن میں ایسے غیر معمولی پہلوؤں کا موجود ہونا جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔

ان واضح قرائن کے بعد جو لوگ آخرت پر یقین نہ کریں اور آخرت فراموشی کی زندگی گزاریں وہ بلاشبہ ایک ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

مہلت کا لمحہ

قرآن کی سورہ نمبر ۸۶ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔ اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے۔ چمکتا ہوا تارہ۔ کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اوپر نگہبان نہ ہو۔ تو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ جو نکلتا ہے پیٹھ اور سینے کے درمیان سے، بے شک وہ اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ جس دن چھپی باتیں پرکھی جائیں گی۔ اس وقت انسان کے پاس کوئی زور نہ ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ قسم ہے آسمان چکر مارنے والے کی۔ اور پھوٹ نکلنے والی زمین کی۔ بے شک یہ دو ٹوک بات ہے۔ اور وہ ہنسی کی بات نہیں۔ وہ تدبیر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور میں بھی تدبیر کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ پس منکروں کو ڈھیل دے، ان کو ڈھیل دے تھوڑے دنوں (الطارق ۱۔۱۷)

انسان کے اوپر ستارہ کا چمکنا تمثیل کی زبان میں اس واقعہ کی ایک یاد دہانی ہے کہ کوئی دیکھنے والا اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہ دیکھنے والا انسان کے اعمال کو ریکارڈ کر رہا ہے۔ وہ موت کے بعد دوبارہ انسان کو پیدا کرے گا۔ اور اس سے اس کے تمام اعمال کا حساب لے گا۔ یہ صرف امتحان کی مہلت ہے۔ جو انسان کے درمیان اور آنے والے وقت کے درمیان حد فاصل بنی ہوئی ہے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اس کا وہ انجام سامنے آجائے گا جس سے آج وہ بظاہر بہت دور نظر آتا ہے۔

کائنات کا خالق اپنی ذات کے اعتبار سے غیب میں ہے۔ مگر اپنے تخلیقی عمل کے اعتبار سے وہ کائنات کی ہر چیز میں نمایاں ہے۔ انسان اگر سنجیدگی کے ساتھ کائنات پر غور کرے تو وہ یقینی طور پر خدا کو پالے گا۔ وہ اس حقیقت کو جان لے گا کہ موجودہ کائنات میں اس کے لیے صرف خدا کی اطاعت کا رویہ درست ہے۔ خدا کے ساتھ سرکشی کرنے والے کے لیے خدا کی اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ مصنوع صانع کا تعارف ہے۔ اسی طرح مخلوقات میں دیکھنے والے کے لیے خالق کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

پرچۂ امتحان

قرآن کی سورہ الفجر نمبر ۸۹ میں ارشاد ہوا ہے ــــــ پس انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اس کو آزماتا ہے اور اس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دی۔ اور جب وہ اس کو آزماتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے۔ اور تم مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے۔ اور تم وراثت کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور تم مال سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہو۔ ہرگز نہیں، جب زمین کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔ اور تمہارا رب آئے گا اور فرشتے آئیں گے قطار در قطار۔ اور اس دن جہنم لائی جائے گی، اس دن انسان کو سمجھ آئے گی۔ اور اب سمجھ آنے کا موقع کہاں۔ وہ کہے گا۔ کاش میں اپنی زندگی میں کچھ آگے بھیجتا۔ پس اس دن نہ تو خدا کے برابر کوئی عذاب دے گا اور نہ اس کے باندھنے کے برابر کوئی باندھے گا۔ اے نفس مطمئن، چل اپنے رب کی طرف۔ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری جنت میں (الفجر ۳۰ - ۱۵)

دنیا میں آدمی کو دو قسم کے احوال پیش آتے ہیں۔ کبھی پانا اور کبھی محروم ہو جانا۔ یہ دونوں حالتیں امتحان کے لیے ہیں۔ وہ اس جانچ کے لیے ہیں کہ آدمی کس حالت میں کون سا ردعمل پیش کرتا ہے۔ جس شخص کا معاملہ یہ ہو کہ جب اس کو کچھ ملے تو وہ فخر کرنے لگے اور جب اس سے چھینا جائے تو وہ منفی نفسیات میں مبتلا ہو جائے، ایسا شخص امتحان میں ناکام ہو گیا۔

دوسرا انسان وہ ہے کہ جب اس کو ملا تو اس نے خدا کے سامنے جھک کر اس کا شکر ادا کیا، اور جب اس سے چھینا گیا تو دوبارہ اس نے خدا کے آگے جھک کر اپنے عجز کا اقرار کیا۔ یہی دوسرا انسان ہے جس کو یہاں نفس مطمئنہ کہا گیا ہے۔ یعنی مطمئن روح۔

دنیا میں آدمی کو مال کی صورت میں یا کسی اور صورت میں جو چیزیں ملتی ہیں وہ سب اس کے لیے امتحان کا پرچہ ہیں۔ وہ بذات خود مطلوب نہیں ہیں بلکہ ایک اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ وہ مقصد یہ ہے کہ انسان ان چیزوں کو اس طرح استعمال کرے کہ وہ آئندہ آنے والی ابدی زندگی میں اس کی نجات کا ذریعہ بن سکیں۔

دو بلندیاں

قرآن کی سورہ نمبر ۹۰ میں ارشاد ہوا ہے ——— نہیں میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ اور تم اس میں مقیم ہو۔ اور قسم ہے باپ کی اور اس کی اولاد کی۔ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا زور نہیں۔ کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال خرچ کر دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔ کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں۔ اور ایک زبان اور دو ہونٹ۔ اور ہم نے اس کو دونوں راستے بتا دیے۔ پھر وہ گھاٹی پر نہیں چڑھا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ گھاٹی۔ گردن کو چھڑانا۔ یا بھوک کے زمانہ میں کھلانا، قرابت دار یتیم کو، یا خاک نشیں محتاج کو۔ پھر وہ ان لوگوں میں سے ہو جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو ہمدردی کی نصیحت کی۔ یہی لوگ نصیب والے ہیں۔ اور جو ہماری آیتوں کے منکر ہوئے وہ بدبختی والے ہیں، ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی (البلد ۲۰-۱)

انسان کسی حال میں اپنے آپ کو مشقتوں سے آزاد نہیں کر پاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کسی بالاتر قوت کے ماتحت ہے۔ اسی طرح انسان کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ کوئی برتر آنکھ بھی ہے جو اس کو دیکھ رہی ہے۔ انسان کی قوتِ نطق اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اوپر بھی ایک صاحبِ نطق موجود ہے جس نے اس کو نطق کی صلاحیت دی۔ اور اس کو ہدایت کا راستہ دکھایا۔ آدمی اگر حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو پہچان لے تو یقیناً وہ خدا کو بھی پہچان لے گا۔

خدا نے انسان کو دو قسم کی بلندیوں پر چڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ایک انسان کے ساتھ منصفانہ سلوک اور انسان کی ضرورتوں میں اس کے کام آنا۔ دوسری چیز اللہ پر ایمان و یقین ہے۔ یہ ایمان و یقین جب آدمی کے اندر گہرائی کے ساتھ اترتا ہے تو وہ آدمی کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ متعدی بن جاتا ہے۔ ایسا انسان دوسروں کو بھی اسی حق پر لانے کی کوشش کرنے لگتا ہے جس کو وہ خود اختیار کیے ہوئے ہے۔

خدائی اصولوں کے تحت زندگی گزارنا انسان کو مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بظاہر مشکل اپنے اندر آسانی لیے ہوئے ہے کیونکہ وہ انسان کو ابدی نجات کی طرف لے جانے والی ہے۔

احسن تقویم

قرآن کی سورہ نمبر ۹۵ میں ارشاد ہوا ہے ـــــ قسم ہے تین کی اور زیتون کی۔ اور طور سینا کی۔ اور اس امن والے شہر کی۔ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے تو ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ تو اب کیا ہے جس سے تم بدلہ ملنے کو جھٹلاتے ہو۔ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں (التین ۸-۱)

تین اور زیتون دو پہاڑوں کے نام ہیں جو بیت المقدس کے قریب واقع ہیں۔ یعنی وہ مقام جہاں حضرت مسیح آئے اور لوگوں کے سامنے خدائی ہدایت کا اعلان کیا۔ طور سینین سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ پر خدا نے اپنا کلام نازل فرمایا۔ بلد امین سے مراد مکہ ہے جہاں پیغمبر اسلام مبعوث ہوئے اور آپ پر خدا نے اپنا آخری ہدایت نامہ اتارا۔

یہ مقامات اس حقیقت کی تاریخی یادگار ہیں کہ خدا انسان کی نگرانی کر رہا ہے۔ وہ اپنی پسند اور ناپسند کا علم مستند ذریعہ سے اس کے پاس بھیجتا ہے۔ اس طرح خدا ہر ایک کو پیشگی طور پر بتا رہا ہے کہ وہ اس دنیا میں کس قسم کی زندگی گزارے تاکہ وہ برے انجام سے بچ جائے۔ اور خدا کی ابدی نعمتوں میں اپنا حصہ پا سکے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ صلاحیتیں اس لیے ہیں کہ انسان پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر کیے جانے والے حق کو پہچانے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنائے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ عزت اور بلندی کا ابدی مقام پائیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنی خداداد صلاحیتوں کو خدا کی مرضی کے تابع نہ کریں، ان سے موجودہ نعمتیں بھی چھین لی جائیں گی اور کامل محرومی کے سوا کوئی جگہ نہ ہوگی جہاں ان کو ٹھکانا مل سکے ـــــ پیغمبروں کی بعثت اور پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر ہونے والے نتائج اس کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔

صرف اعلیٰ مقصد ہی انسان کی زندگی کا مقصد ہو سکتا ہے۔ وہ اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنی صلاحیتوں کے صحیح استعمال کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کرے اور خدا کی پسند والی زندگی گزارے۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا کے یہاں بہت بڑا انعام ہے۔ جو لوگ اس معیار پر پورے نہ اتریں ان کا انجام کامل گھاٹے کے سوا اور کچھ نہیں۔

کتاب ہدایت

قرآن کی سورہ نمبر۹۶ میں ارشاد ہوا ہے ـــــــ پڑھ اپنے رب کے نام سے ۔جس نے پیدا کیا ۔ پیدا کیا انسان کو علق سے ۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا۔ ہرگز نہیں ، انسان سرکشی کرتا ہے ۔ اس بنا پر کہ وہ اپنے کو بے نیاز دیکھتا ہے ۔ بے شک تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے (العلق ۸ -۱)

یہ قرآن کی وہ آیتیں ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے اتاری گئیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے پیغمبروں پر وحی بھیجنے کا جو طریقہ اختیار فرمایا اس کا مقصد کیا تھا۔اس کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو وہ بات بتائی جائے جس سے انسان عام حالات میں باخبر نہیں ہو سکتا تھا۔

موجودہ دنیا میں انسان بظاہر آزاد ہے ۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ انسان کی کوئی پکڑ نہیں ۔موجودہ دنیا میں انسان کچھ دن زندہ رہ کر مر جاتا ہے ۔ اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ انسان کی زندگی ، بس پیدائش سے موت تک ہے ، اس کے آگے اور کچھ نہیں ۔

اسی بے خبری کو توڑنے کے لیے خدا نے وحی اور رسالت کا سلسلہ قائم کیا۔ ہر دور میں اور ہر قوم میں خدا کی طرف سے پیغمبر آتے رہے ۔یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے جو آخری نبی ہیں۔ اور اب وہی قیامت تک کے لوگوں کے لیے ہدایت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں ۔

یہ پیغمبرانہ خبر، یہ ہے کہ انسان موجودہ دنیا میں آزاد نہیں ہے کہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرے ۔اس کو اپنے تمام معاملات میں خدا کے ان حکموں کی پابندی کرنی ہے جو پیغمبر کے ذریعہ اس کو دیے گئے ہیں ۔

خدا نے صرف خبر دے کر انسان کو چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ وہ اس کی نگرانی کر رہا ہے ۔موت کے بعد تمام انسان خدا کی طرف لوٹائے جائیں گے ۔ اور پھر ہر ایک کے لیے اس کے دنیوی ریکارڈ کے مطابق سزا یا انعام کا فیصلہ سنایا جائے گا ۔ انسان کی ہدایت کے لیے اصل اہمیت نبی کی ذاتی موجودگی نہیں ہے بلکہ اس کی لائی ہوئی کتاب کی موجودگی ہے ۔ خدا کی کتاب ، قرآن چونکہ محفوظ حالت میں موجود ہے اور پیغمبر کی سنت بھی مدون حالت میں موجود ہے اس لیے اب کسی انسان کے لیے کوئی عذر نہیں ۔ انسان کو چاہیے کہ وہ کتاب وسنت سے ہدایت لے کر اپنی زندگی کی تعمیر کرے ۔ اور خدا کی ابدی رحمتوں کا مستحق بن جائے ۔

ایک بھونچال

قرآن کی سورہ نمبر ۹۹ میں ارشاد ہوا ہے —— جب زمین شدت سے ہلادی جائے گی۔ اور زمین اپنا بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہوا۔ اس دن وہ اپنے حالات بیان کرے گی۔ کیوں کہ تمہارے رب کا اس کو یہی حکم ہوگا۔ اس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے۔ تاکہ ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ پس جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا (الزلزال ۸-۱)

قیامت کا زلزلہ مدت امتحان کے ختم ہونے کا اعلان ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب لوگوں سے وہ آزادی چھن گئی جو امتحان کی مصلحت کی بنا پر انھیں حاصل تھی۔ اب وہ وقت آگیا جب لوگوں کو ان کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔ آج خدا کی دنیا بظاہر خاموش ہے۔ مگر جب حالات بدلیں گے تو یہاں کی ہر چیز بولنے لگے گی۔ موجودہ زمانہ کی ایجادات نے ثابت کیا ہے کہ بے جان چیزیں بھی "بولنے" کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسٹوڈیو میں کیے ہوئے عمل کو فلم اور ریکارڈ پوری طرح دہرا دیتے ہیں۔ اسی طرح موجودہ دنیا گویا بہت بڑا خدائی اسٹوڈیو ہے۔ اس کے اندر انسان جو کچھ کرتا ہے یا جو کچھ بولتا ہے وہ سب ہر لمحہ محفوظ ہو رہا ہے۔ اور جب وقت آئے گا تو ہر ایک کی کہانی کو یہ دنیا اس طرح دہرا دے گی کہ اس کی کوئی بھی بات اس سے بچی ہوئی نہ ہوگی، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔

دنیا میں انسان کے رویہ کو درست کرنے کے لیے صرف ایک ہی چیز کافی ہے۔ آدمی کو اس بات کا پختہ شعور ہو جائے کہ وہ ہر لمحہ خدا کی نگرانی میں ہے۔ اس کا پورا کارنامۂ حیات خدا کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ چھوٹا عمل ہو یا بڑا عمل، چھپ کر کیا ہوا کام یا اعلانیہ کیا ہوا کام، سب کا سب وہاں سامنے آجائے گا۔

آدمی کو اس حقیقت کا پورا یقین ہو جائے تو زمین کے ہلائے جانے سے پہلے وہ خود ہل جائے گا۔ قیامت کے عام زلزلہ سے پہلے خود اس کی اپنی روح میں ایک ایسا زلزلہ آجائے گا جو اس کو آخری حد تک بدل کر رکھ دے۔ اس کے بعد آدمی خود اپنا نگراں بن جائے گا۔ وہ آزاد زندگی کے بجائے پابند زندگی اختیار کرے گا۔ وہ اپنے اختیار کو خدا کے حکم کے تحت استعمال کرے گا نہ کہ آزادانہ طور پر۔

موت کے بعد

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۰ میں ارشاد ہوا ہے —— قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ پھر ٹاپ مار کر چنگاری نکالنے والے۔ پھر صبح کے وقت چھاپہ مارنے والے۔ پھر اس میں غبار اڑانے والے۔ پھر اس وقت فوج میں گھس جانے والے۔ بے شک انسان اپنے رب کا شکر نہیں کرتا۔ اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔ اور وہ مال کی محبت میں بہت شدید ہے۔ کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب وہ قبروں سے نکالا جائے گا۔ اور نکالا جائے گا جو کچھ دلوں میں ہے۔ بے شک اس دن ان کا رب ان سے خوب باخبر ہوگا (العٰدیٰت ۱-۱۱)

گھوڑا ایک نہایت وفادار جانور ہے۔ وہ اپنے مالک کے لیے اپنے آپ کو آخری حد تک قربان کر دیتا ہے، حتیٰ کہ جنگ کے میدان میں بھی وہ اپنے مالک کا ساتھ نہیں چھوڑتا خواہ اس میں اس کی جان چلی جائے۔

یہ گویا ایک علامتی مثال ہے جو انسان کو بتاتی ہے کہ اسے کیسا بننا چاہیے۔ انسان کو بھی اپنے رب کا اسی طرح وفادار بننا چاہیے جیسا کہ گھوڑا انسان کا وفادار ہوتا ہے۔ مگر عملاً ایسا نہیں۔

اس دنیا میں جانور اپنے مالک کا شکر گزار ہے۔ مگر انسان اپنے رب کا شکر گزار نہیں۔ یہاں جانور اپنے مالک کا حق پہچانتا ہے۔ مگر انسان اپنے رب کا حق نہیں پہچانتا۔ یہاں جانور اپنے مالک کی اطاعت میں سرگرم ہے۔ مگر انسان اپنے رب کی اطاعت میں سرگرم نہیں۔

انسان اسی جانور کی قدر کرتا ہے جو اس کا وفادار ہو۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ اس راز کو نہ جانے کہ خدا کے یہاں وہی انسان قابل قدر ٹھہرے گا جو خدا کی نظر میں اس کا وفادار ثابت ہو۔ مگر مال کی محبت انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ وہ ایک ایسی حقیقت کو جاننے سے محروم رہتا ہے۔ جس کا وہ خود اپنے قریبی حالات میں تجربہ کر چکا تھا۔

یہ صورت حال اسی طرح باقی رہنے والی نہیں۔ انسان کی موت اس بات کا الارم ہے کہ وہ مکمل طور پر خدا کی پکڑ میں ہے۔ موت دراصل، حساب و کتاب کی دنیا میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ وہاں انسان کو اس خدا کی عدالت کے سامنے کھڑا ہونا ہے جس سے انسان کی کوئی بھی بات چھپی ہوئی نہیں۔

باوزن عمل

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— (اے لوگو) کھڑکھڑانے والی۔ کیا ہے کھڑکھڑانے والی۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی۔ جس دن لوگ پتنگوں کی طرح بکھرے ہوئے ہوں گے۔ اور پہاڑ دھنے ہوئے رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔ پھر جس شخص کا پلّہ بھاری ہوگا وہ دل پسند آرام میں ہوگا۔ اور جس شخص کا پلہ ہلکا ہوگا تو اس کا ٹھکانا گڑھا ہے۔ اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے۔ بھڑکتی ہوئی آگ (القارعہ ۱-۱۱)

قیامت کا بھونچال ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔ لوگوں کے تمام استحکامات درہم برہم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ایک نیا عالم بنے گا۔ جہاں سارا وزن صرف حق میں ہوگا۔ بقیہ تمام چیزیں اپنا وزن کھو دیں گی۔ موجودہ دنیا میں انسانوں کی پسند کا رواج ہے۔ یہاں انسانوں کی نسبت سے چیزوں کا وزن قائم ہوتا ہے۔ آخرت کی دنیا خدا کی دنیا ہے۔ وہاں خدا کی پسند کے اعتبار سے ایک چیز وزن دار ہوگی اور دوسری چیز بالکل بے وزن ہو کر رہ جائے گی۔

دنیا میں اعمال کا وزن ظاہر کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ آخرت میں اعمال کا وزن ان کی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے ہوگا۔ جس آدمی کے عمل میں جتنا زیادہ اخلاص ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ وزنی قرار پائے گا۔ جو عمل اخلاص سے خالی ہو وہ آخرت میں بالکل بے وزن ہو کر رہ جائے گا۔ خواہ موجودہ دنیا میں ظاہر بینوں کو وہ کتنا ہی زیادہ باوزن دکھائی دے رہا ہو۔

موجودہ دنیا میں وہ عمل وزنی بنتا ہے جس میں دنیوی حالات کی رعایت شامل ہو، جو وقت کے رواج سے مطابقت رکھتا ہو، جو وقت کی سماجی روایات میں قابل لحاظ بن گیا ہو، جو لوگ اس طرح کے عمل کا ثبوت دیں وہ دنیا کے ماحول میں عظمت اور وقار کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

آخرت کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ وہاں با اصول زندگی باوزن قرار پائے گی۔ وہاں اعلیٰ معیار کے مطابق کیا ہوا عمل قابل لحاظ سمجھا جائے گا۔ وہاں وقتی مصلحت کے بجائے ساری اہمیت اس عمل کو حاصل ہو جائے گی جو اپنے اندر ابدی اقدار کی صفت رکھتا تھا۔

دنیا میں باطل بھی باوزن دکھائی دے سکتا ہے۔ لیکن آخرت میں حق کے سوا کسی چیز میں وزن نہ ہوگا۔

مادی دوڑ

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۲ میں ارشاد ہوا ہے ـــــــ (اے لوگو) زیادہ کی حرص نے تم کو غفلت میں رکھا، یہاں تک کہ تم مر کر قبروں میں جا پہنچے، ہرگز نہیں، تم بہت جلد جان لوگے۔ پھر ہرگز نہیں، تم بہت جلد جان لوگے۔ ہرگز نہیں۔ کاش تم یقین کے ساتھ جانتے، کہ تم ضرور دوزخ کو دیکھوگے۔ پھر تم اس کو یقین کی آنکھ سے دیکھو گے۔ پھر اس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں پوچھ ہوگی (التکاثر ۱ ـ ۸)

موجودہ دنیا طرح طرح کی مادی چیزوں کا ایک وسیع دستر خوان ہے، یہ چیزیں دنیا میں امتحان کے لیے رکھی گئی ہیں نہ کہ آزادانہ استفادہ کے لیے۔ آدمی اگر ان چیزوں کو امتحان کی نظر سے دیکھے تو وہ بقدر ضرورت ان کو حاصل کرے گا اور احتیاط اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ان کو استعمال کرے گا۔

لیکن آدمی عام طور پر ذمہ دارانہ رویہ پر قائم نہیں رہ پاتا۔ مادی چیزوں کی کشش اس کو اپنی طرف اس طرح کھینچتی ہے کہ وہ ان ہی کی طرف دوڑ پڑتا ہے مزید یہ کہ اس کی حرص کہیں نہیں رکتی۔ وہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے وہ اپنے پورے وجود کو دنیا کی کمائی میں مشغول کر دیتا ہے۔ وہ اسی حال میں اپنے صبح و شام بسر کرتا ہے یہاں تک کہ اس کی موت کا وقت آجاتا ہے، وہ اپنی زندگی بھر کی کمائی کو موجودہ دنیا میں چھوڑ کر آخرت کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔ اس وقت اچانک وہ اپنے آپ کو اس حال میں پاتا ہے کہ اس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں جو زندگی کے اگلے مرحلے میں اس کے کام آسکے۔ آدمی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کمائے، وہ زیادہ سے زیادہ سازوسامان اپنے پاس جمع کرے۔ وہ اسی دھن میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ جمع کرنے کی چیز تو دوسری تھی اور میں کسی اور چیز کو جمع کرنے میں مصروف رہا۔

دنیا کی چیزوں کا اضافہ صرف آدمی کی مسئولیت کو بڑھاتا ہے۔ اور آدمی اپنی نادانی سے یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی کامیابی میں اضافہ کر رہا ہے۔

زمانہ گواہ ہے

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۳ میں ارشاد ہوا ہے ——— زمانہ گواہ ہے۔ بے شک انسان گھاٹے میں ہے۔ مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اور نیک عمل کیا اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی (العصر ۳-۱)

انسان ایک مخصوص زمانہ میں پیدا ہوتا ہے۔ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عمر آگے بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ زمانہ کی اس حد پر پہنچ جاتا ہے جو اس کی عمر کی آخری حد ہے۔ اب اس پر موت آجاتی ہے۔ انسانی زندگی کی یہ نوعیت بتاتی ہے کہ وہی انسان کامیاب ہے جو اپنے ملے ہوئے وقت کو استعمال کر سکے۔ ورنہ وقت گزر جائے گا اور آخر میں اس کے حصہ میں کچھ نہ ہوگا۔

آدمی ہر لمحہ اپنی موت کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اگر اپنی مہلت عمر کو استعمال نہ کرے تو آخر کار اس کے حصہ میں جو چیز آئے گی وہ صرف محرومی ہے۔ کامیاب ہونے کے لیے آدمی کو خود عمل کرنا ہے جبکہ ناکامی کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ اس کی طرف بھاگی چلی آ رہی ہے۔

ایک بزرگ نے کہا کہ سورہ عصر کا مطلب میں نے ایک برف بیچنے والے سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ لوگو، اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے۔ لوگو، اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے۔ اس پکار کو سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ جس طرح برف پگھل کر کم ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح انسان کو ملی ہوئی عمر بھی تیزی سے گزر رہی ہے۔ عمر کا موقع اگر بے عملی میں یا برے کاموں میں کھو دیا جائے تو یہی انسان کا گھاٹا ہے (تفسیر کبیر امام رازی)

اپنے وقت کو صحیح استعمال کرنے والا وہ ہے جو موجودہ دنیا میں تین باتوں کا ثبوت دے۔ ایک ایمان، یعنی حقیقت کا شعور اور اس کا اعتراف۔ دوسرے عمل صالح، یعنی وہی کرنا جو کرنا چاہیے اور وہ نہ کرنا جو نہیں کرنا چاہیے۔ تیسرے حق و صبر کی تلقین، یعنی حقیقت کا اتنا گہرا ادراک کہ آدمی اس کا داعی اور مبلغ بن جائے۔

اس دنیا میں ایک کامیاب زندگی پانے کے لیے صبر لازمی طور پر ضروری ہے۔ آدمی جب خلاف ایمان باتوں کا چھوڑنا برداشت کرتا ہے، اسی وقت اس کو ایمان کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ جب وہ اپنی خواہشوں پر بریک لگاتا ہے، اسی وقت عمل صالح کو اختیار کرنا اس کے لیے ممکن ہوتا ہے۔ جب وہ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی ناخوشگواریوں پر صبر کرتا ہے۔ اسی وقت وہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو حق کی نصیحت کر سکے۔

انسانی سماج

قرآن کی سورہ نمبر ۱۶ میں ارشاد ہوا ہے ــــ بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا۔ اور اللہ روکتا ہے فحشاء سے اور منکر سے اور سرکشی سے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو (النحل ۹۰)

انسان کو چاہیے کہ وہ خدا کی دنیا میں عدل کے ساتھ رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا جو حق دوسرے پر آتا ہے وہ اس کو پوری طرح ادا کرے۔ خواہ صاحب حق کمزور ہو یا طاقت ور اور خواہ وہ پسندیدہ شخص ہو یا ناپسندیدہ۔ حقوق کی ادائیگی میں صرف حق کا لحاظ کیا جائے نہ کہ دوسرے اعتبارات کا۔ احسان یہ ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں عالی ظرفی کا طریقہ اپنایا جائے۔ انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کیا جائے۔ قانونی دائرہ سے آگے بڑھ کر لوگوں کے ساتھ فیاضی اور ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ آدمی کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ حتی الامکان وہ اپنے لیے اپنے حق سے کم پر راضی ہو جائے اور دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینے کی کوشش کرے۔ ایتاء ذی القربیٰ یہ ہے کہ آدمی جس طرح اپنے بیوی بچوں کی ضرورت کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس کو پورا کرتا ہے، اسی طرح وہ دوسرے قریبی لوگوں کی ضرورت کے بارہ میں بھی حساس ہو۔ ہر صاحب استعداد شخص اپنے مال پر صرف اپنا اور اپنے گھر والوں ہی کا حق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کو بھی وہ اپنی ذمہ داری میں شامل کرے۔

یہ وہ تین کام ہیں جن کی ہدایت خدا نے انسان کو دی ہے۔ اب تین چیزیں ایسی ہیں جن سے خدا نے انسان کو روکا ہے۔ پہلی چیز فحشاء ہے۔ اس سے مراد کھلی ہوئی اخلاقی برائیاں ہیں۔ یعنی وہ برائیاں جن کا برا ہونا خود اپنے ضمیر کے تحت ہر آدمی کو معلوم ہوتا ہے۔ دوسری چیز منکر ہے، اس سے مراد وہ نامعقول کام ہیں جو عام اخلاقی معیار کے خلاف ہیں۔ اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کو انسان عام طور پر برا جانتے ہیں۔ تیسری چیز بغی ہے۔ اس کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا۔ اس میں ہر وہ سرکشی داخل ہے جب کہ آدمی اپنی واقعی حد سے گزر کر دوسرے شخص پر دست درازی کرے۔ وہ اپنے زور واثر کو ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے استعمال کرنے لگے۔

انسانی بلندی

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان نشانیوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے۔ مگر وہ تو زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔ پس اس کی مثال کتے کی سی کی ہے کہ اگر تو اس پر بوجھ لادے تب بھی ہانپے اور اگر چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ پس تم یہ احوال ان کو سناؤ تاکہ وہ سوچیں (الاعراف ۱۷۶)

موجودہ دنیا حق کی نشانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ انسان کا ضمیر اس کو سچائی کی طرف رہنمائی دیتا ہے۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ سچائی کا خاموش اعلان ہے۔ اسی کے ساتھ خدا کا پیغمبر خدا سے ہدایت لے کر الفاظ کی صورت میں اس حقیقت کا آخری حد تک اظہار کر رہا ہے۔

اس طرح خدا نے انسان کے لیے ہدایت کا عالمگیر اہتمام کر رکھا ہے۔ اگر انسان ان خدائی آوازوں کو سنے اور ان سے ہدایت لینے کی کوشش کرے تو وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ آدمی یقینی طور پر سچائی کو پالے گا اور پھر اس منزل کی طرف چل پڑے گا جو اس کی کامیابی کی اصل منزل ہے۔ اس عمل کے دوران اس کا ذہنی ارتقا ہوگا، اس کی روح ترقی یافتہ روح بنتی چلی جائے گی، وہ خدا کا وہ مطلوب انسان بن جائے گا جس کے لیے اس نے ابدی سعادتیں مقدر کی ہیں۔

مگر اکثر انسانوں کے ساتھ یہ المیہ پیش آتا ہے کہ وہ مادی ترغیبات کے مقابلہ میں شکست کھا جاتے ہیں۔ مادی رونقیں انھیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ وہ ضمیر کی آواز کائنات کا اعلان اور پیغمبر کی ہدایت ہر ایک کو نظر انداز کر کے مادی زینتوں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اور آخر کار یہ ہوتا ہے کہ بہترین امکانات سے بھری ہوئی دنیا میں وہ تباہ و برباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

خدا نے انسان کے لیے اس دنیا میں بہترین امکانات کھولے ہیں۔ اس نے یہاں وہ تمام اسباب مہیا کر دیے ہیں جس کے ذریعہ انسان بلندیوں کی طرف سفر کر سکے۔ مگر اس سفر کی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو سطحی چیزوں سے اوپر اٹھائے وہ خواہش کی پیروی نہ کرے۔ وہ ظاہری رونقوں کو نظر انداز کر کے اعلیٰ حقیقتوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے، ایسے ہی لوگ اعلیٰ انسانی مرتبہ تک پہنچیں گے۔ جو لوگ ایسا نہ کریں وہ اپنے آپ کو پستیوں میں گرالیں گے۔

دینِ رحمت

دین رحمت

آپ قرآن کو کھولیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کی سب سے پہلی آیت یہ ہے: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے) یہ آیت قرآن میں ایک سو چودہ بار آئی ہے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رحم یا مہربانی کی قدر اسلام کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہے۔ ہر سچے مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ رحمت ور أفت اور شفقت و مہربانی کا پیکر بنے۔ اس کے دل میں دوسروں کے لئے مہربانی کے سوا کوئی اور جذبہ موجود نہ ہو۔

اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب بھی ایک شخص دوسرے شخص سے ملے تو وہ اس سے السلام علیکم کہے۔ یعنی ہر ایک دوسرے کے لئے امن و سلامتی کا اظہار کرے۔ نماز اسلام میں ایک ایسی عبادت ہے جو ہر روز پانچ وقت ادا کی جاتی ہے (مسنون نمازیں اس کے علاوہ ہیں)۔ ہر نماز کے آخر میں نماز پڑھنے والا دائیں اور بائیں اپنا منہ پھیر کر کہتا ہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ (تمہارے اوپر اللہ کی سلامتی اور برکت ہو)۔

اس طرح ہر مسلمان کو یہ تعلیم دی گئی کہ وہ ساری دنیا کے انسانوں کے لئے اپنے سینہ میں مہربانی کے جذبات کی پرورش کرے۔ اس کا دل تمام انسانوں کے لئے رحمت و شفقت سے بھرا ہوا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام دین رحمت ہے۔ اس کی تمام تعلیمات، براہ راست یا بالواسطہ طور پر امن اور رحمت سے متعلق ہیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لئے بہتر جذبات موجود ہوں۔ ہر ایک دوسرے کو انسان کے روپ میں دیکھے نہ کہ اپنے اور غیر، دوست اور دشمن کی نظر سے۔

بہتر انسانی سماج بنانے کی یہی واحد تدبیر ہے اور اسلام میں بار بار اس کی خصوصی تاکید کی گئی ہے۔ جس سماج میں لوگوں کے درمیان اس قسم کا ماحول ہو وہ سماج لازماً ترقی کرے گا۔ ایسے سماج میں ہر ایک کو دوسرے سے وہ چیز ملے گی جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے، ہر ایک اس چیز سے بچا رہے گا جس کو وہ اپنے لئے پسند نہیں کرتا۔

اسلام رحمت کلچر ہے۔ اس کی تمام اخلاقی تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے محبت کریں، لوگ ایک دوسرے کے لئے رحمت کا پیکر بن جائیں۔

انسانی خدمت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس آدمی نے کسی مسلم کے دنیا کے غموں میں سے کسی غم کو دور کیا تو اللہ اس کے قیامت کے غموں میں سے کسی غم کو دور کرے گا۔ جس نے کسی مشکل میں پھنسے ہوئے آدمی کی مشکل کو آسان کیا تو اللہ اس کی دنیا اور آخرت کی مشکل کو آسان کرے گا۔ جس نے کسی مسلم کی پردہ پوشی کی تو اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ اور اللہ بندے کی مدد پر رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد پر رہے (واللّٰہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی المعونۃ للمسلم، ۴/۲۸۸

اسلام کی اس تعلیم میں انسانی خدمت کے معاملہ کو ہر آدمی کا ذاتی معاملہ بنا دیا ہے۔ اس کے مطابق، کوئی آدمی جب کسی انسان کی مدد کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خدا کی مدد کا مستحق بناتا ہے۔ اس نے جو کچھ دوسروں کے ساتھ کیا ہے، وہی زیادہ بڑے پیمانہ پر وہ خدا سے اپنے لیے پالیتا ہے۔

یہ تعلیم آدمی کے اندر انسانی خدمت کا غیر معمولی جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔ وہ جب کسی کو تکلیف میں دیکھتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے لیے وہ قیمتی لمحہ آگیا جب کہ وہ اس کی تکلیف کو دور کر کے اپنے آپ کو خدا کی رحمتوں کا مستحق بنالے۔ اسی طرح جب وہ دیکھتا ہے کہ کوئی انسان مشکل میں پھنسا ہوا ہے تو وہ اس کو مشکل سے نکالنے کے لیے دوڑ پڑتا ہے، کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ دوسرے کی مشکل کشائی خود اس کے لیے نازک تر مواقع پر مشکل کشائی کا سبب بنے گی۔ جب کسی کا عیب اس کے علم میں آتا ہے تو وہ اس کا اشتہار کرنے کے بجائے وہ اس کو چھپاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ خدا اس کے عیبوں کو چھپائے۔

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں کبھی کوئی شخص ضرورت مند ہوتا ہے اور کوئی شخص اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ ضرورت مند کے پاس پہنچے اور اس کی ضرورت کو پورا کرے۔ یہ حالات اس لیے ہیں تاکہ صاحب حیثیت آدمی دوسرے کی مدد کر کے اپنے آپ کو خدا کی مدد کا مستحق بنائے۔ اور جس کی مدد کی گئی ہے وہ احسان مندی کا اظہار کر کے اپنے اندر اعتراف کے جذبہ کی پرورش کرے۔

برتر اخلاق

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ امعۃ نہ بنو۔ یعنی تم یہ کہنے لگو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ اور اگر وہ ہمارے ساتھ ظلم کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ظلم کریں گے۔ بلکہ تم اپنے آپ کو اس کے لیے آمادہ کرو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں تب بھی ہم ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ اور اگر وہ ہمارے ساتھ برا سلوک کریں تب بھی ہم ان کے ساتھ ظلم نہیں کریں گے:

لا تکونوا إمعۃ تقولون إن أحسن الناس أحسنا وإن ظلموا ظلمنا ولکن وطنوا أنفسکم إن أحسن الناس أن تحسنوا وإن أساؤوا فلا تظلموا (الترمذی، بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۱۸)

اسلامی اخلاق وہ ہے جو برتر اخلاق ہو۔ یعنی ہر حال میں اچھے اخلاق پر قائم رہنا، خواہ دوسروں کی طرف سے برے اخلاق کا تجربہ پیش آرہا ہو۔ اسلامی اخلاق دوسروں کے ردعمل میں نہیں بنتا بلکہ خود اپنے اعلیٰ اصولی معیاروں کے تحت بنتا ہے۔ اسلام میں اخلاق ایک عبادت ہے، وہ کوئی جوابی انسانی رویہ نہیں۔

عبادت کا ثواب کیفیات کے اضافہ کے ساتھ بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی آدمی دوسروں کی طرف سے برے سلوک کا تجربہ پیش آنے کے باوجود ان کے ساتھ اچھے سلوک پر قائم رہے تو اس کا ثواب بھی بڑھ جائے گا۔ کیوں کہ وہ جذبات کی قربانی کی سطح پر جاکر حسن اخلاق کے اصول پر قائم رہا۔

معتدل حالات میں حسن اخلاق اگر سادہ طور پر تہذیبی برتاؤ (manners) کی حیثیت رکھتا ہے تو غیر معتدل حالات میں حسن اخلاق اعلیٰ درجہ کی عبادت بن جاتا ہے۔ معتدل حالات میں جو خوش اخلاقی برتی جاتی ہے، وہ انسانی شخصیت کے ارتقاء میں کچھ مددگار نہیں ہوتی۔ لیکن جب ایک آدمی غیر معتدل حالات میں دوسروں کے برے رویہ سے غیر متاثر رہ کر حسن اخلاق پر قائم رہے تو اس کی یہ روش اس کی شخصیت کے ارتقا کا ذریعہ بن جائے گی۔

بداخلاقی کے جواب میں حسن اخلاق بلا شبہ سب سے بڑا اخلاق ہے۔

محبت عام

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی اسی چیز کو محبوب رکھے جس کو وہ اپنے لیے محبوب رکھتا ہے (لایومن احدکم حتی یحب لاخیہ مایحب لنفسہ) فتح الباری ۱/۳،

اس حدیث میں انسانی اخلاق کا ایک ایسا سادہ معیار بتایا گیا ہے جس کو ہر آدمی سمجھے، اور ہر آدمی اس کو اپنا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں اس سے زیادہ سادہ معیار اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

ہر آدمی بتائے بغیر یہ جانتا ہے کہ کیا چیز اس کو پسند ہے، اور وہ کون سی چیز ہے جو اس کو پسند نہیں۔ وہ کون سی بات ہے جو اس کو اچھی لگتی ہے اور وہ کون سی بات ہے جو اس کو بری معلوم ہوتی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ہر آدمی اسی جانے پہچانے معیار کو دوسروں کے لیے بھی اختیار کرے۔

ہر آدمی کو یہ پسند ہے کہ اس سے بات کرنے والا ٹھنڈے انداز میں اس سے بات کرے۔ اب ہر آدمی کو چاہیے کہ دوسروں سے بات کرنے میں وہ بھی ہمیشہ ٹھنڈا انداز اختیار کرے۔ ہر آدمی کو یہ پسند ہے کہ کوئی شخص جب اس سے وعدہ کرے تو وہ اپنے وعدہ کو پورا کرے۔ اب یہی روش اس کو بھی دوسروں کے ساتھ اختیار کرنا چاہیے۔ ہر آدمی کو یہ پسند ہے کہ اس کے ساتھ جب کسی کا لین دین ہو تو وہ اس کے ساتھ خیانت کا معاملہ نہ کرے۔ اب اس کو بھی دوسروں کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرنا چاہیے۔

برا انسان وہ ہے جو ایک حقیقت کو اپنے بارہ میں جانے مگر وہ اسی حقیقت کو دوسروں کے بارے میں بھول جائے۔ اس کے مقابلہ میں اچھا انسان وہ ہے جس کے اندر اس قسم کی دوعملی نہ ہو۔ وہ دوسروں کے لیے بھی ویسا ہی ہو جیسا کہ وہ خود اپنے آپ کے لیے ہے۔

صرف اپنی پسند کو جاننا خود غرضی ہے۔ اپنی پسند کے ساتھ دوسروں کی پسند کو جاننا ایثار ہے۔ خود غرضی انسان کی انسانیت کی توہین ہے۔ اس کے برعکس ایثار انسانیت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ خود غرض انسان صرف اپنے آپ کو جانتا ہے اور صاحب ایثار انسان اپنے ساتھ دوسروں کو بھی۔

فائدہ پہنچانا

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس درمیان میں ایک آدمی کو بچھّو نے ڈنک مارا۔ وہ تکلیف سے تڑپنے لگا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، میں جھاڑ پھونک جانتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کو جھاڑ دوں۔ پیغمبر اسلامؐ نے جھاڑ پھونک کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ البتہ آپ نے فرمایا: من استطاع منکم ان ینفع اخاہ فلینفعہ۔ یعنی تم میں سے جو شخص اپنے بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اسے ضرور فائدہ پہنچائے۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: من استطاع منکم ان ینفع اخاہ فلیفعل (صحیح مسلم بشرح النووی، ۱۴/۱۸۶-۱۸۷)

اس حدیث میں ایک اصولی بات کہی گئی ہے جو اسلامی اعتبار سے بھی بے حد اہم ہے اور انسانی اعتبار سے بھی۔ جس آدمی کے اندر انسانی احساس زندہ ہو اس کا حال یہ ہوگا کہ وہ کسی دوسرے کی تکلیف کو دیکھ کر تڑپ اٹھے گا۔ اسی طرح جس آدمی کے اندر ایمانی شعور موجود ہو وہ مزید اضافہ کے ساتھ دوسرے انسانوں کا خیر طلب بن جائے گا۔

حیوان صرف ذاتی تکلیف کو جانتا ہے۔ حیوان صرف اس تکلیف کو محسوس کر پاتا ہے جو خود اسے پیش آرہی ہو۔ مگر انسان کا درجہ اس سے بلند ہے۔ انسان کو یہ صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ اپنے سوا دوسروں کی تکلیف کو بھی جانے اور اس کو شدت کے ساتھ محسوس کرے۔ جس انسان کے اندر یہ صفت نہ پائی جائے وہ گویا انسان کی صورت میں ایک حیوان ہے۔

سچا انسان وہ ہے جو دوسروں کی ضرورت کو سمجھے، جس کی خوشی اس میں ہو کہ وہ دوسروں کے کام آسکے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچا کر سکون حاصل کرے۔ دوسروں کو نفع پہنچانا ایمان اور انسانیت کا لازمی تقاضا ہے۔ جس آدمی کی ذات سے دوسروں کو نفع نہ پہنچے وہ گویا آدمی بھی نہیں۔

نفع بخشی اور انسانیت دونوں لازم ملزوم ہیں۔ جو آدمی نفع بخشی کی صفت سے خالی ہو وہ یقینی طور پر انسانیت سے بھی خالی ہوگا۔

پھل دار درخت

ایک لمبی حدیث ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ درختوں میں ایک درخت ہے جس کی مثال مومن جیسی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ کھجور کا درخت ہے (ان من الشجر شجرة مثلها كمثل المسلم ... قال النبي صلى الله عليه وسلم : هي النخلة) فتح الباری ۱/۱۹۹

کھجور کا درخت (اور اس قسم کے دوسرے پھل دار درخت) کا معاملہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ درخت زمین سے اور ہوا سے اور سورج سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح اپنے آس پاس کے وسائل کو استعمال کرتے ہوئے ایک پھل دار درخت اپنے آپ کو زمین پر ایک طاقت ور وجود کی صورت میں کھڑا کرتا ہے۔ پھر وہ ان حاصل کیے ہوئے اجزاء کو اس سے زیادہ قیمتی اور زیادہ مفید صورت میں بدلتا ہے جس کو پھل کہا جاتا ہے۔ پھر یہ پھل بھی وہ اپنے لیے تیار نہیں کرتا بلکہ صرف اس لیے کرتا ہے تاکہ دوسرے لوگ اس کو کھائیں اور اس سے اپنے لیے غذا اور طاقت حاصل کریں۔

ٹھیک یہی معاملہ مومن کا بھی ہے۔ مومن جس سماج میں رہتا ہے وہاں سے وہ بہت سی چیزیں حاصل کرتا ہے۔ اس طرح اس کی ذہنی اور جسمانی شخصیت کا ارتقاء ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ ایک کامل انسان بن جاتا ہے۔

مگر مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ لینے کے وقت تو خوب لے مگر دینے کے وقت وہ دینے کے لیے تیار نہ ہو۔ اس معاملہ میں مومن وہی کرتا ہے جو کھجور کا درخت یا کوئی اور پھل دار درخت کرتا ہے۔ وہ اپنے وجود کے درخت پر لگے ہوئے پھل میں دوسروں کا بھی حصہ سمجھتا ہے۔ وہ اس طرح جیتا ہے کہ اس کا وجود صرف اس کی اپنی ذات کے لیے مفید نہ رہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی مفید بن جائے۔ اس نے جو کچھ دنیا سے پایا ہے اس کو وہ صرف اپنے لیے سمیٹ کر نہیں رکھ لیتا، بلکہ اس کو وہ پوری انسانیت کا مشترک سرمایہ سمجھتا ہے۔

انسانیت کا کمال یہ ہے کہ آدمی دنیا سے جو کچھ پائے، اس کو زیادہ بہتر صورت دے کر وہ اسے دوبارہ دنیا کی طرف لوٹا دے۔

صبح وشام

ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ آدمی رشک کے قابل ہے جس کو اللہ نے مال دیا ہو اور پھر وہ اس کو رات میں بھی اور دن میں بھی خرچ کرے (ورجل اعطاہ اللہ مالاً فھو یتصدق بہ آناء اللیل و آناء النھار) فتح الباری ۶۹۱/۸

اسلام کے مطابق، مال اس لیے نہیں ہے کہ آدمی اس کے ذریعہ سے اپنی خواہشیں پوری کرے بلکہ مال کسی کو اس لیے دیا جاتا ہے کہ وہ اس کو استعمال کرکے عام انسانوں کی خدمت کرے۔ مال بھلائی کمانے کے لیے ہے نہ کہ ذاتی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے۔

اسلام کے مطابق، انسان کی دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک خدا کی نسبت سے، اور دوسری عام آدمیوں کی نسبت سے۔ خدا کی نسبت سے آدمی کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خدا کی خدائی کا اعتراف کرے اور اس کا عبادت گزار بن جائے۔ آدمیوں کی نسبت سے اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کا خیر خواہ بنے، ہر ممکن موقع پر وہ دوسروں کے کام آئے۔

کوئی انسان بہت سے پہلوؤں سے عام آدمیوں کا مددگار بن سکتا ہے۔ انھیں میں سے ایک اہم ذریعہ مال ہے۔ مال آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کرکے ان کا دل ٹھنڈا کرے۔ وہ دوسروں کے کام آکر انھیں مشکلات سے نکالے۔

دوسروں کی مدد کرنا ایک نہایت اعلیٰ فکری جذبہ ہے۔ جب ایک آدمی دوسرے شخص کی مدد کرکے اس کو مصیبت سے نکالتا ہے تو یہ اس کے اپنے لیے خوشی کا ایک قیمتی موقع ہوتا ہے۔ یہ خوشی گویا اس کے عمل کی ایک نقد قیمت ہے۔ اس کی دوسری بڑی قیمت وہ ہے جو آدمی کو آخرت میں ملے گی۔

لوگوں کی ضرورتوں میں ان کے کام آنا کوئی وقتی عمل نہیں، یہ ایک مستقل صفت ہے۔ سچا انسان وہ ہے جو لوگوں کو خوش کرنے میں اپنی خوشی سمجھے، جو دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کو اپنی کامیابی جانتا ہو۔ جو صبح وشام ایسے مواقع کی تلاش میں رہے جب کہ وہ دوسروں کی خدمت کرکے اپنی انسانیت کی تکمیل کرسکتا ہو۔

حسنِ معاشرت

موطا امام مالک (باب ما جاء فی المهاجرة) میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو، تم آپس میں مصافحہ کرو اس سے کینہ چلا جائے گا۔ تم آپس میں ھدیہ دو اس سے تمہارے اندر محبت پیدا ہوگی اور دشمنی جاتی رہے گی (تصافحوا یذهب الغل، وتهادوا تحابوا وتذهب الشحناء) موطا امام مالک، ۹۵۳

انسانی سماج پتھروں کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ وہ صاحب احساس افراد کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایسے افراد جب مل جل کر رہیں تو ان کی انسانی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت یہ ہے کہ ان کے درمیان آپس میں اچھے تعلقات ہوں۔ لوگوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے برادرانہ جذبات پائے جائیں۔

اس طرح کی انسانی فضا کو فروغ دینے کی صورت یہ ہے کہ جب بھی دو یا زیادہ آدمی آپس میں ملیں تو وہ ایک دوسرے سے سلام اور مصافحہ کریں۔ سلام کا مطلب ایک دوسرے سے بہتر الفاظ کے ساتھ ملنا ہے، اور مصافحہ گویا اس سے آگے بڑھ کر مزید قربت کی ایک علامت ہے۔ سلام کے بعد جب دو آدمی ایک دوسرے سے مصافحہ کریں تو فطری طور پر ان کے درمیان اجنبیت ختم ہو جاتی ہے اور قربت کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔

اسی برادرانہ جذبہ کی ایک اور بڑھی ہوئی صورت یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو ھدیہ اور تحفہ دیں۔ ھدیہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، جب وہ مخلصانہ جذبہ کے تحت دیا جاتا ہے تو دینے والے اور پانے والے کے درمیان غیر معمولی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ھدیہ دو آدمیوں کو اعلیٰ انسانی رشتہ میں باندھ دیتا ہے۔

اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ سماج کے اندر منفی رجحانات دبیں اور مثبت رجحانات فروغ پائیں۔ شکایت اور نفرت کی فضا ختم ہو اور لوگ محبت اور حسن تعلق کی فضا میں جینے لگیں۔ سماج میں اس قسم کا ماحول پیدا کرنے کے لیے سلام و مصافحہ اور ھدیہ و تحفہ جیسی چیزیں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

حدیدی اخلاق

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ — ہم نے اپنے رسولوں کو نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ اتاری کتاب اور میزان تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے بن دیکھے، بے شک اللہ طاقت والا، زبردست ہے۔

قرآن کی اس آیت کے مطابق، انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ انصاف پر قائم ہونے والا بنے۔ جس سماج کے افراد انصاف پر قائم ہوں، اس سماج کو مختلف پہلوؤں سے اس کا فائدہ پہنچے گا ایسے سماج میں امن ہوگا۔ ایسے سماج میں لوگوں کے حقوق محفوظ ہوں گے۔ ایسے سماج میں ہر آدمی کو یہ موقع حاصل ہوگا کہ وہ خدا کی نعمتوں میں سے اپنا حصہ آزادانہ طور پر لے سکے۔ ایسے سماج میں وہ تمام فائدے لوگوں تک بے روک ٹوک پہنچ رہے ہوں گے جو خدا نے انسانوں کے لیے مقدر کیے ہیں۔

انصاف پر قائم ہونا لازمی طور پر پختگی اور مضبوطی چاہتا ہے۔ موجودہ دنیا میں مختلف ایسے اسباب پیش آتے ہیں جو آدمی کو انصاف سے ہٹا دیں۔ جو اس کو بے انصافی کی روش پر چلنے کے لیے مجبور کر دیں۔ ایسی حالت میں صرف پختہ ارادہ اور مضبوط عزم ہی انسان کو مسلسل طور پر انصاف کی روش پر قائم رکھ سکتا ہے۔

لوہا علامتی طور پر اسی مضبوط کرداری کا سبق ہے۔ لوہے میں استثنائی طور پر غیر معمولی سختی رکھی گئی ہے۔ اس بنا پر وہ ان تمام چیزوں میں انسان کے لیے انتہائی کارآمد بن گیا ہے جس میں سختی ضرورت ہو۔ سوئی سے لے کر مشین اور ریل تک بے شمار چیزیں لوہے کی اسی نفع بخش صفت کا مظہر ہیں۔

یہی مضبوطی انسان سے بھی مطلوب ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی انسانی فرائض ادا کرنے کے لیے لوہے کی طرح مضبوط بن جائے۔ انسان کے اندر حدیدی کردار کا ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ پختگی کے ساتھ سچائی پر قائم رہے گا۔ وہ ہر حال میں نفع بخش کردار کا حامل بنا رہے گا۔

حدید (لوہا) تشدد کی علامت نہیں، وہ مضبوطی کی علامت ہے۔ اسی لیے مضبوط آدمی کو حدیدی انسان (لوہا پرش) کہا جاتا ہے۔

خرچ کی مدیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ —— لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو مال تم خرچ کرو اس میں حق ہے تمہارے ماں باپ کا اور رشتہ داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا۔ اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کو معلوم ہے (البقرہ ۲۱۵)

قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ دوسروں کے اوپر خرچ کی کیا مدیں ہونی چاہئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام لوگ جن سے آدمی کا سابقہ پڑتا ہے، خواہ وہ وقتی ہو یا مستقل، وہ سب اس قابل ہیں کہ آدمی اپنا مال ان کے اوپر خرچ کرے۔

اس سلسلہ میں فطری ترتیب یہ ہے کہ اگر آدمی کے رشتہ دار ضرورت مند ہوں تو سب سے پہلے اس کو اپنے ان رشتہ داروں کے اوپر خرچ کرنا چاہیے۔ اپنے ضرورت مند رشتہ داروں کی ضرورت پوری کرنے میں بھی اتنا ہی ثواب ہے جتنا کہ دور کے لوگوں پر خرچ کرنے میں۔ قربت اور دوری اس معاملہ میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتی۔

اس کے بعد فطری تقسیم میں پڑوسیوں کا درجہ ہے۔ آدمی کے پڑوس میں جو لوگ ضرورت مند ہوں ان کی ضرورتیں پوری کرنا بہت بڑا انسانی عمل ہے۔ یہ پڑوسی مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو آدمی کا مستقل پڑوسی ہو، دوسرے وہ لوگ جو سفر یا غیر سفر میں وقتی طور پر پڑوسی کا درجہ حاصل کرلیں۔ اسی طرح کوئی مسافر جو چلتا ہوا کسی بستی میں آجائے، اس کا بھی یہ حق ہے کہ اگر وہ ضرورت مند ہے تو اس کی ضرورت پوری کی جائے۔

سماجی عمل کے دوران بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص یتیم ہو جاتا ہے۔ کوئی کسی حادثہ کا شکار ہو کر حاجت مند بن جاتا ہے، ایسے لوگ خصوصی طور پر مدد کے مستحق ہیں۔ ان کی مدد کرنا ہر سماج کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری ہے۔ ایسے لوگوں کی مدد انفرادی طور پر بھی ہونا چاہیے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو منظم طور پر مدد کرنے کے لیے اجتماعی ادارے قائم کیے جائیں۔

انفاق ایک اعتبار سے انسانی خدمت ہے اور دوسرے اعتبار سے خدائی عبادت۔

زندہ ملاقات

ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے : من زار رجلاً ولم یذق منہ شیئاً فکأنما زار میتاً (جو شخص کسی سے ملا اور اس نے اس سے کچھ چکھا نہیں تو گویا کہ وہ مُردہ سے ملا)

اس حدیث کا ابتدائی مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے ملاقات کرے تو جس سے اس نے ملاقات کی ہے وہ اس کی کچھ تواضع کرے ، خواہ یہ تواضع ایک کھجور یا ایک گلاس پانی کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔ ملاقات کے وقت ملاقاتی کو کھانے پینے کی کچھ چیزیں پیش کرنا معروف سماجی اخلاق ہے۔ یہ صفت ہر انسان میں ہوتی ہے ، خواہ وہ امیر ہو یا غریب ، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ ملاقات کے وقت کچھ پینے یا کھانے کی چیز پیش کرنا گویا تقریب کا ذریعہ ہے۔ یہ طرفین کے درمیان دوری اور اجنبیت کو ختم کرنے والا ہے۔

تاہم اس حدیث کی اصل اسپرٹ یہ ہے کہ ہر آدمی کو دوسرے آدمی کے لیے خوش اخلاقی کا پیکر ہونا چاہیے۔ جب وہ کسی سے بات کرے تو سننے والے کو اس کی باتوں میں مٹھاس مل رہی ہو ، جب وہ کسی کا ذکر کرے تو وہ اس کے بہترین نام کے ساتھ اس کا ذکر کرے۔ جب وہ کسی کو کوئی پیغام دے تو وہ پیغام ایسا ہو جو اس کے دل کو ٹھنڈا کرنے والا ہو۔

کسی کا قول ہے کہ آدمی ہر آن اپنے آپ کو ریڈیئیٹ کرتا رہتا ہے۔ برف اپنے ماحول میں ٹھنڈک بکھیرتا ہے اور آگ اپنے آس پاس گرمی پھیلاتی ہے ، اسی طرح آدمی بھی ہر لمحہ مختلف پہلوؤں سے اپنے آپ کو ماحول میں توسیع دیتا رہتا ہے یہ عمل ہر حال میں شعوری یا غیر شعوری طور پر جاری رہتا ہے۔ اب ایک سچے انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس پہلو سے اپنا نگراں بنا ہوا ہو۔ وہ اس بات کی مسلسل کوشش کرے کہ اس کی ذات سے ماحول کو ہمیشہ ٹھنڈک ملے۔ وہ لوگوں کے لیے ہمیشہ راحت ثابت ہو نہ کہ کسی قسم کی مصیبت۔

جس انسان کی فطرت زندہ ہو وہ یقیناً ایسا ہی ذائقہ بخش انسان ہوگا۔ اس سے جس آدمی کو بھی سابقہ پیش آئے گا وہ اس کے لیے ایک خوش گوار تجربہ ثابت ہوگا۔ ایسے انسان کے پاس سے گزرنے والے کو محسوس ہوگا کہ وہ پھولوں کی ایک وادی سے گزرا ہے نہ کہ کانٹوں کی ایک جھاڑ جھنکاڑ سے۔

دوسروں کا حق

قرآن میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اگلی زندگی میں جنتوں میں داخل کیے جائیں گے۔ ان لوگوں کی لازمی صفات میں سے ایک صفت اس طرح بتائی گئی ہے ـــــ اور وہ لوگ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا معین حق ہے (المعارج ۲۴-۲۵)

موجودہ دنیا میں ہر انسان بہت سے اجتماعی رشتوں سے وابستہ ہے۔ ایک طرف وہ وسیع تر عالم فطرت سے جڑا ہوا ہے اور دوسری طرف انسانی سماج سے۔ آدمی اپنی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے اس میں ان سارے عناصر کا لازمی حصہ شامل رہتا ہے۔ کوئی انسان اس پر قادر نہیں کہ وہ اپنے ماحول سے آزاد ہو کر محض اپنی ذاتی بنیاد پر کوئی قابل قدر چیز حاصل کرسکے۔

عالم فطرت (سورج، ہوا، پانی، وغیرہ) سے آدمی جو اَن گنت فائدے حاصل کرتا ہے اس کا بھی ایک حق ہے۔ اور اس کا حق یہ ہے کہ آدمی دل سے خالق کائنات کا شکر ادا کرے۔ شکر کا یہ احساس اتنا قوی ہو کہ خالق کی یاد اس کے روز و شب کے لمحات میں مستقل طور پر شامل ہو جائے۔ جو لوگ خدا کا یہ حق ادا کریں، وہی لوگ جائز طور پر خدا کی اس دنیا میں رہنے کے مستحق ہیں۔

دوسرا حق وہ ہے جو سماج کی نسبت سے ہر انسان کے اوپر عائد ہوتا ہے۔ اس دنیا میں آدمی جو مال حاصل کرتا ہے، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، ہر حال میں اس کے اندر سماج کا ایک حصہ شامل رہتا ہے۔ کسی بھی انسان کا حاصل کیا ہوا مال صرف اس کی ذاتی محنت یا لیاقت کا نتیجہ نہیں، بلکہ وہ پورے سماج کا مشترک عطیہ ہے۔

یہ انسانی شرافت کا تقاضا ہے کہ اس حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کیا جائے۔ اس اعتراف کی عملی صورت یہ ہے کہ اپنے حاصل کیے ہوئے مال کا ایک حصہ مستقل طور پر سائل اور محروم کو دیا جائے۔ یعنی ان لوگوں کو جو اپنی ضرورت کو سوال کی صورت میں پیش کریں۔ اور ان لوگوں کو بھی جو سوال تو نہ کریں مگر ان کے احوال بتا رہے ہوں کہ وہ مالی کمی کا شکار ہیں، اور اس قابل ہیں کہ انھیں مالی سہارا پہنچایا جائے۔ دوسروں کا حق ادا کرنے کے بعد ہی کوئی شخص اس قابل بنتا ہے کہ اس کو اس کا حق دیا جائے۔

نفع بخشی

قرآن میں فطرت کے ایک قانون کو اس طرح بتایا گیا ہے —— خدا نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق بہہ نکلے۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی ابھر آتا ہے جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لیے آگ میں پگھلاتے ہیں۔ اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اللہ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے (الرعد ۱۷)

قرآن کی اس آیت میں فطرت کے دو سبق آموز واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ جب بارش ہوتی ہے اور اس کا پانی بہہ کر ندیوں اور نالوں میں پہنچتا ہے تو پانی کے اوپر ہر طرف جھاگ پھیل جاتا ہے۔ اسی طرح جب چاندی اور دوسری معدنیات کو صاف کرنے کے لیے ان کو آگ پر تپاتے ہیں تو ان کا میل کچیل جھاگ کی صورت میں اوپر آجاتا ہے، مگر جلد ہی بعد یہ ہوتا ہے کہ دونوں چیزوں کا جھاگ، جس میں انسان کے لیے کوئی فائدہ نہیں فضا میں اڑ جاتا ہے اور پانی اور دھات اپنی جگہ پر پوری طرح باقی رہتے ہیں جو کہ انسان کے لیے مفید ہیں۔

یہ فطرت کے واقعات ہیں جن کے ذریعہ خدا تمثیل کے روپ میں ایک اہم حقیقت کو بتا رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں کامیابی اور بقا کا فطری اصول کیا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ اس دنیا میں صرف اس فرد یا قوم کو بقا و ثبات حاصل ہوتا ہے جو اپنے آپ کو دوسروں کے لیے نفع بخش ثابت کرے۔ جو فرد یا گروہ دوسرے انسانوں کو نفع پہنچانے کی طاقت کھو دے اس کے لیے خدا کی اس دنیا میں کوئی باعزت جگہ نہیں۔

صرف اپنی ذات کے لیے جینا فطرت کی اسکیم کے خلاف ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی ذاتی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ لازمی طور پر دوسروں کے بھی کام آئے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ فطرت کے نقشہ میں بے جگہ ہو کر رہ جائے گا۔

کائنات کا مطلوب انسان وہ ہے جو ایک نفع بخش انسان ہو۔

صدقہ اسپرٹ

اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ ہر آدمی کے اندر صدقہ کی عمومی اسپرٹ موجود ہو۔ وہ ہر حال میں اور ہر موقع پر صدقہ دینے والا بن جائے۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث یہ ہے جو صحیح البخاری میں آئی ہے :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مسلمان کے اوپر صدقہ ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اگر وہ کچھ نہ پائے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چاہیے کہ وہ محنت کرکے کمائے، پھر اس میں سے کچھ اپنے لیے لے اور کچھ دوسرے کے اوپر صدقہ کرے۔ لوگوں نے کہا کہ اگر اس میں یہ استطاعت بھی نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ضرورت مند کی خدمت کرے۔ لوگوں نے کہا کہ اگر وہ ایسا بھی نہ کر سکے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چاہیے کہ وہ خیر کی نصیحت کرے۔ لوگوں نے کہا کہ اگر وہ ایسا بھی نہ کر سکے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر اس کو چاہیے کہ وہ شر سے باز رہے، کیونکہ یہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے (فتح الباری ۱۰/۴۶۲)

صدقہ ایک وقتی عمل نہیں بلکہ وہ ایک عمومی اسپرٹ ہے۔ جب ایک آدمی کے اندر صدقہ کی یہ اسپرٹ پیدا ہو جائے تو اس کا اظہار ہر وقت ہوتا رہے گا۔ جو آدمی صدقہ اسپرٹ کا حامل ہو وہ کسی بھی حال میں صدقہ والے عمل سے خالی نہیں ہو سکتا۔

صدقہ کی اصل دوسرے انسانوں کے لیے خیر خواہی ہے۔ جب کسی آدمی کے اندر یہ روح بیدار ہو جاتی ہے تو وہ اپنے اندرونی جذبہ کے تحت مجبور ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے جو کچھ بھی کر سکتا ہے کرے۔ اگر اس کے پاس مال ہو تو وہ اپنے مال میں سے دوسروں کی مدد کرے گا۔ اگر اس کے پاس کوئی مال موجود نہیں تو وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو استعمال کرکے کمائے گا اور پھر اس میں سے کچھ اپنی ضرورت میں خرچ کرے گا اور کچھ دوسروں کو دے گا۔ اور اگر اس قسم کا مال بھی اس کے پاس نہ ہو تو وہ اپنے جسم و دماغ سے دوسروں کی خدمت کرے گا، مثلاً راستہ سے کانٹا ہٹانا یا کسی مسافر کو راستہ بتانا۔ اسی طرح اس کا یہ جذبہ بوقت ضرورت نصیحت کی صورت میں ظاہر ہوگا، وہ دوسروں کی اصلاح کے لیے انھیں میٹھے الفاظ کا تحفہ دے گا۔ اس صدقہ کا آخری درجہ یہ ہے کہ آدمی ایسے کام سے اپنے آپ کو بچائے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچنے والی ہو۔

کمزوروں کی مدد

اسلام میں اس پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے پاس مال ہے وہ اس کو صرف اپنی ذات کے لیے خاص نہ کر لیں بلکہ اس میں سے دوسروں کے اوپر بھی خرچ کریں۔ اس کا سبب ایک حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ تم کو جو مدد ملتی ہے اور جو رزق تمہارے پاس پہنچتا ہے وہ تمہارے کمزوروں ہی کے سبب سے ہوتا ہے (هل تنصرون وترزقون الا بضعفائکم) فتح الباری ۶/۱۰۴

یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ انسانوں میں کسی کے پاس زیادہ مال ہوتا ہے اور کسی کے پاس کم۔ اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب فطرت کا وہ نظام ہے جو خدا نے اپنی مصلحت کے تحت قائم کیا ہے۔ یہ دنیا آزمائش کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس امتحانی مصلحت کا تقاضا ہے کہ لوگوں کے درمیان فرق ہو۔ یہ دراصل فرق ہی ہے جو انسانی سماج میں امتحان کے حالات پیدا کرتا ہے۔ اگر انسانوں کے درمیان مختلف قسم کے فرق نہ ہوں تو آزمائش والے اسباب کا پیدا ہونا بھی ختم ہو جائے۔

اسی میں سے ایک فرق یہ ہے کہ کوئی انسان پیدائشی طور پر قوی ہوتا ہے اور کوئی انسان ضعیف، ذہنی اعتبار سے بھی اور جسمانی اعتبار سے بھی۔ اسی فرق کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اپنی برتر صلاحیت کے زور پر زیادہ مال اکٹھا کر لیتے ہیں اور کچھ لوگ اپنی کمتر صلاحیت کی بنا پر زیادہ مال حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

گویا کہ کسی کے پاس زیادہ مال ہونا دوسروں کے ضعف کے سبب سے ہوتا ہے۔ اگر سارے ہی لوگ قوی ہوں تو کسی ایک کے پاس زیادہ مال اکٹھا نہیں ہو سکتا۔ اب صاحب مال کو چاہیے کہ وہ اس فطری صورت حال کا اعتراف کرے۔ وہ اپنے زیادہ مال کو خود اپنی صلاحیت کا نتیجہ نہ سمجھے بلکہ اس کو خدائی انتظام کا نتیجہ سمجھے۔ صاحب مال کے اندر اگر یہ ذہن ہو تو وہ اپنے مال کو صرف اپنا مال نہیں سمجھے گا بلکہ اس کا خیال یہ ہوگا کہ یہ دراصل دوسروں کا حصہ ہے جو اتفاقاً میرے پاس آ گیا۔ یہ جذبہ اس کو مجبور کرے گا کہ جو کچھ دوسروں کا ہے اس کو وہ دوسروں کی طرف لوٹا دے۔

یہی اسلام ہے اور یہی صحیح انسانی اسپرٹ۔

کھانا کھلانا

قرآن میں مطلوب انسان کی جو تصویر ہے، اس کا ایک پہلو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ اس کی محبت میں مسکین اور یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں (الدھر ۸) اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں جب اہل جہنم سے پوچھا جائے گا کہ کیا چیز تم کو جہنم میں لے آئی۔ تو اس کی ایک وجہ وہ یہ بتائیں گے کہ ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے (المدثر ۴۴)

اس طرح کی آیتوں میں اطعام (کھانا کھلانا) کا لفظ علامتی معنی میں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے مطابق، ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسرے کسی انسان کو بھوک پیاس کی حالت میں دیکھے تو وہ اس کی بھوک اور پیاس مٹائے۔ وہ اس کی حاجتوں کو پورا کرے۔

دوسروں کو کھلانا یا ان کی ضرورتوں کو پورا کرنا بلاشبہ بہت بڑا عمل ہے۔ خود کمانا اور خود کھانا اگر حیوانیت ہے تو کمانے کے بعد خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا وہ چیز ہے جو کسی انسان کو حقیقی انسانیت کے درجہ میں پہنچاتا ہے۔

جس سماج میں لوگوں کے اندر یہ مزاج ہو کہ وہ اپنی کمائی میں دوسروں کا حصہ سمجھیں وہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ دوسروں کی ضرورت بھی پوری کریں۔ ایسا سماج سکون کا سماج ہوگا۔ ایسے سماج میں ہر انسان عافیت کی زندگی گزارے گا۔ ایسا سماج ایک بڑے خاندان کے مانند ہوگا جس کے ہر فرد کے دل میں دوسرے افراد کے لیے اسی طرح محبت کے جذبات ہوں گے جس طرح خود اپنے خاندان کے افراد کے لیے ہوتے ہیں۔

جو لوگ دنیا میں ایسا معاشرہ بنائیں، وہ گویا خدا کی مرضی کو پورا کر رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں جنت کے معاشرہ میں بسائے جائیں گے۔ کیوں کہ انھوں نے دنیا میں جنتی معاشرہ کے مطابق، زندگی گزارنے کی کوشش کی تھی۔

خود کھانے میں اگر دنیا کا فائدہ ہے تو دوسروں کو کھلانے میں آخرت کا فائدہ۔ خود کھانا اگر وقتی خوشی کا سبب ہے تو دوسروں کو کھلانا مستقل خوشی کا سبب۔ خود کھانا اگر صرف کھانا ہے تو دوسروں کو کھلانا اعلیٰ انسانیت۔

جاری فائدہ

مسند احمد کی ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص ایک درخت لگائے اور اس کے بعد وہ مرجائے پھر یہ درخت بڑا ہو کر پھل لائے، جس کو انسان اور چڑیاں کھائیں، تو یہ اس کے لیے ایک مستقل ثواب ہوگا جب تک کہ خدا کی مخلوق اس سے فائدہ اٹھاتی رہے (کان لہ اجر جار ما انتفع بہ من خلق اللّٰہ)

اسلام میں نفع رسانی کا ایک مستقل اصول وہ ہے جس کو صدقہ جاریہ کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک آدمی ایک مفید عمل کرے، مثلاً وہ درخت لگائے یا پُل بنائے، اور اس کے بعد وہ مرجائے، مگر اس کی قائم کی ہوئی چیز اس کی موت کے بعد بھی باقی رہ کر انسانوں کو فائدہ پہنچاتی رہے تو اس قسم کی صدقہ جاریہ کی بے حد اہمیت ہے اور اس کام میں اس کا بہت بڑا ثواب بتایا گیا ہے۔

صدقہ جاریہ درحقیقت انسانی شرافت کے ایک اعلیٰ پہلو کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ انسانی شرافت کا ایک اعلیٰ درجہ ہے کہ آدمی یہ چاہے کہ وہ کوئی ایسا کام کر جائے جس کا فائدہ انسانی نسلوں کو اس وقت بھی پہنچتا رہے جب کہ وہ آدمی اپنی عمر پوری کر کے دنیا سے چلا گیا ہو۔

نفع رسانی یا فائدہ بخشی ایک اعلیٰ ترین انسانی جذبہ ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ جذبہ زندہ ہو وہ صرف اتنا ہی نہیں کرتا کہ براہ راست طور پر جب کسی انسان سے اس کا سابقہ پڑے تو وہ اس کو کچھ فائدہ پہنچا دے۔ بلکہ ایسے آدمی کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جو عمومی طور پر لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا ہو۔ حتیٰ کہ اس کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی موت بھی انسانیت کے لیے اس کی نفع رسانی کا سلسلہ منقطع نہ کر سکے، اس کی نفع بخشی کا سلسلہ اس وقت بھی جاری رہے جب کہ وہ خود اس کو دیکھنے کے لیے دنیا میں موجود بھی نہ ہو۔

دوسروں کے لیے مفید بننا خود اپنی انسانیت کی تکمیل ہے۔ دوسروں کو دے کر آدمی خود اپنے لیے اس سے زیادہ پالیتا ہے جتنا کہ اس نے دوسروں کو دیا تھا۔ یہ عمل اپنے اور غیر کے تصور کو مٹاتا ہے، اور اپنے اور غیر کے تصور کو مٹا کر وحدت انسانیت کا ماحول بنانا بلاشبہ سب سے بڑی انسانی خدمت ہے۔

عمومی شفقت

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح البخاری میں بھی وہ کئی باب کے تحت نقل کی گئی ہے۔ باب رحمۃ الناس والبھائم (انسانوں اور حیوانوں کے ساتھ رحمت) کے تحت وہ روایت اس طرح بیان ہوئی ہے :

ایک شخص کسی راستہ میں چل رہا تھا۔ اس کو سخت پیاس لگی۔ پھر اس نے ایک کنواں دیکھا۔ وہ اس میں اترا اور اس سے پانی پیا۔ پھر نکلا تو اس نے دیکھا کہ ایک کتا ہے جو ہانپ رہا ہے اور پیاس کی وجہ سے تر مٹی کو کھا رہا ہے۔ آدمی نے کہا کہ یہ کتا بھی اسی حالت سے دوچار ہے جس حالت سے میں دوچار تھا۔ پھر وہ آدمی دوبارہ کنواں میں اترا اور اپنے خف کو پانی سے بھرا پھر اس کو منہ سے پکڑ کر باہر آیا اور کتے کو پانی پلایا۔ تو اللہ نے اس کے اس عمل کو قبول کر لیا اور اس کو بخش دیا۔ لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کیا ہمارے لیے حیوانوں میں بھی اجر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، ہر ذی روح میں تمہارے لیے اجر ہے (فتح الباری ۱۰/۴۵۲)

آدمی کے جسم کو جب پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو فطرت اس کو اندر سے پیاس کا احساس دلاتی ہے تاکہ وہ پانی حاصل کرے اور جسم میں پانی پہنچا کر اس کی ضرورت پوری کرے۔ یہی معاملہ بھوک لگنے یا ٹھنڈک محسوس ہونے کا ہے۔ یہ گویا فطرت کی پکار ہے جو آدمی کو بتاتی ہے کہ وہ کھانا کھا کر یا گرم کپڑا اوڑھ کر اپنے جسم کی ضرورت پوری کرے۔

یہ احساسات حیوان کے اندر بھی ہیں۔ مگر حیوانات صرف اپنی ذات کی حد تک ان احساسات کی تکمیل سے واقف ہیں۔ مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ ان احساسات کی توسیع کرے۔ وہ جس طرح اپنی ضرورت کو محسوس کر کے اس کو پورا کرنے کا انتظام کرتا ہے، اسی طرح وہ دوسرے انسانوں اور حیوانوں کی ضرورت کو بھی جانے، اور ہر ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔

اپنی ضرورت کو پورا کرنا صرف اپنے فطری تقاضے کو پورا کرنا ہے۔ مگر دوسرے کی ضرورت کو پورا کرنا ایک عبادت ہے اور اعلیٰ ترین انسانی شرف۔

پڑوسی کا حق

اسلام میں پڑوسی کا حق ادا کرنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے، اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ عزت واحترام کا معاملہ کرے (من کان یؤمن باللہ ... فلیکرم جارہ) ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص مومن نہیں ہے جس کی ایذاؤں سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو (لایؤمن ... الذی لایامن جارہ بوائقہ)

کسی انسان کا سب سے پہلا سابقہ اس کے پڑوسی سے پڑتا ہے۔ اس لیے کسی انسان کی سب سے پہلی آزمائش بھی اس کے پڑوسی کے معاملہ میں ہوتی ہے۔ کوئی انسان اگر برا ہے تو اس کے پڑوسیوں سے اس کے تعلقات بھی برے ہوں گے۔ اور اگر کوئی انسان اچھا ہے تو اس کے پڑوسیوں سے اس کے تعلقات بھی اچھے ہوں گے۔

کسی آدمی کی انسانیت کی پہچان یہ نہیں ہے کہ اس کا معاملہ دور کے لوگوں کے ساتھ کیسا ہے۔ بلکہ اس کی انسانیت کی اصل پہچان یہ ہے کہ اپنے قریب کے لوگوں کے ساتھ وہ کیسا برتاؤ کرتا ہے۔ اور اس معاملہ میں پڑوسی بلا شبہ کسی آدمی کا سب سے پہلا قریبی انسان ہے۔

قریب ہونے کی وجہ سے آپ کے ہر عمل کا اثر پڑوسی تک پہنچتا ہے۔ اگر آپ اپنے گھر میں شور کریں تو پڑوسی کے کان تک اس کی آواز پہنچے گی۔ اگر آپ اپنے دروازہ پر دھواں کریں تو آپ کا دھواں بھی پڑوسی کے گھر میں داخل ہوگا۔ اگر آپ اپنے گھر کا کوڑا باہر پھینکیں تو اس کا بھی تلخ تجربہ آپ کے پڑوسی کو بھگتنا ہوگا۔ اس طرح آپ کے ہر اچھے یا برے عمل کا اثر پڑوسی تک پہنچتا رہتا ہے۔ وہ آپ کے پھول کا بھی تجربہ کرتا ہے اور آپ کے کانٹے کا بھی۔

اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ پڑوسی کے معاملہ میں بے حد محتاط رہے۔ وہ پڑوس کے لوگوں کا اسی طرح پاس و لحاظ کرے جس طرح وہ خود اپنے گھر والوں کا پاس و لحاظ کرتا ہے۔

درخت کا پڑوسی درخت کے سایہ سے محروم نہیں رہ سکتا، اسی طرح ایک حقیقی انسان کے فیض سے اس کے پڑوسی کا محروم رہنا ممکن نہیں۔

عمومی خیر خواہی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان الدین النصیحۃ، ان الدین النصیحۃ، ان الدین النصیحۃ " قالوا لمن یا رسول اللہ ؟ قال للہ وکتابہ ورسولہ وائمۃ المؤمنین وعامتہم، وائمۃ المسلمین وعامتہم (سنن ابی داؤد ۴/۲۸۸) یعنی آپ نے فرمایا کہ دین خیر خواہی ہے، دین خیر خواہی ہے، دین خیر خواہی ہے — لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول کس کے لیے۔ آپ نے فرمایا اللہ کے لیے اور اس کی کتاب کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے امیر کے لیے اور ان کے عام لوگوں کے لیے اور مسلمین کے امیر کے لیے اور ان کے عام لوگوں کے لیے۔

کسی آدمی کے سینہ میں حقیقی دین آنے کے بعد اس کے اندر لازمی طور پر انسانی خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح پانی میں شکر ڈالنے کے بعد پانی کے اندر مٹھاس کا ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس آدمی کے اندر دین ہوگا، اس کے اندر لازمی طور پر خیر خواہی بھی موجود ہوگی۔ جو دل انسانی خیر خواہی سے خالی ہو، یقینی طور پر وہ دین سے بھی خالی ہوگا۔

اس خیر خواہی کے بے شمار پہلو ہیں۔ آپ جب کسی کو غلط بات بولتے ہوئے یا غلط کام کرتے ہوئے دیکھیں تو اس وقت خیر خواہی یہ ہوگی کہ اس کے پاس پہنچ کر نرمی اور شفقت کے انداز میں اس کو سمجھایا جائے۔ پرسوز کلام اور سنجیدہ دلائل کے ذریعہ یہ کوشش کی جائے کہ وہ اپنے قول و فعل کو درست کر لے اور غلط روش سے باز آئے۔

ایک انسان وہ ہے جو دوسروں کو اس نظر سے دیکھے کہ وہ ان سے اپنے لیے کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ ایسا انسان خدا کا مطلوب انسان نہیں۔ وہ فطرت کے نقشہ میں بے جگہ ہے، وہ اس امتحان میں ناکام ہو گیا جس کے لیے خدا نے اس کو موجودہ دنیا میں رکھا تھا۔

دوسرا انسان وہ ہے جو لوگوں کو اس نظر سے دیکھے کہ وہ انہیں کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ ایسے انسان کی تسکین اس میں ہوگی کہ وہ کسی پہلو سے دوسروں کے کام آسکے، اس کی ذات سے دوسروں کو فائدہ حاصل ہو جائے۔ یہی وہ انسان ہے جو خدائی آزمائش میں کامیاب اترا۔

تکلیف دور کرنا

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الایمان بضع وسبعون شعبۃ، فافضلھا قول لا الہ الا اللہ، وادناھا، اماطۃ الاذی عن الطریق، والحیاء شعبۃ من الایمان (یعنی ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں، اس کا سب سے افضل شعبہ یہ کہنا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور اس کا ادنی درجہ راستہ سے تکلیف کی چیز کو ہٹا دینا ہے۔ اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے) مشکاۃ المصابیح ۱/۱۰

ایمان آدمی کے اندر جو مزاج پیدا کرتا ہے اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ایسے آدمی کے اندر دوسروں کی مدد کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ کسی کو مصیبت میں دیکھے اور وہ اس کی مدد نہ کرے۔ یہاں تک کہ اگر وہ راستہ میں کوئی پتھر یا کانٹے جیسی چیز دیکھتا ہے تو راستہ سے ہٹائے بغیر اس کو چین نہیں آتا۔ کیوں کہ ایسی حالت میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس راستہ سے گزرے اور اس کو تکلیف پہنچ جائے۔

زندگی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی صرف اپنے بارے میں سوچے، اس کو صرف اپنے آرام اور تکلیف کی فکر ہو۔ اس کا اپنا معاملہ درست ہو جائے تو اس کے بعد اس کو کسی اور کی پروا باقی نہ رہے۔ مگر ایسا انسان حقیقی انسان نہیں وہ اس انسانی شرافت سے خالی ہے جو فطرت کے اعتبار سے اس سے مطلوب ہے۔

حقیقی انسان وہ ہے جو دوسروں کی تکلیف پر بھی اسی طرح تڑپے جس طرح وہ اپنی تکلیف پر تڑپتا ہے۔ وہ دوسروں کی مصیبت کو دور کرنے کے لیے بھی اسی طرح آمادہ رہتا ہو جس طرح وہ اپنی مصیبت کو دور کرنے کے لیے سرگرم ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے معاملہ کو اپنا معاملہ سمجھے۔ وہ دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہو اور وہ دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر درد مند ہو جائے۔

انسان اور پتھر میں جو چیز فرق کرتی ہے وہ حساسیت ہے۔ پتھر بے حس ہوتا ہے اور انسان حساس۔ انسان اگر حساسیت کھو دے تو اس میں اور پتھر میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔

خرچ سے اضافہ

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر روز جب کہ بندے صبح کرتے ہیں تو آسمان سے دو فرشتے اترتے ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک کہتا ہے کہ اے اللہ، خرچ کرنے والے کو اس کا بدل دے۔ اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ اے اللہ، مال روکنے والے کا مال ضائع کر دے: ما من یوم یصبح العباد فیہ الا ملکان ینزلان فیقول احدھما: اللّٰھم اعط منفقاً خلفاً ویقول الآخر اللّٰھم اعط ممسکاً تلفاً (فتح الباری ۳/۲۵۷)

اس حدیث میں دراصل فطرت کا وہ نظام بتایا گیا ہے جس کے مطابق، خدا نے اس دنیا کو بنایا ہے۔ اس دنیا میں کامیابی اس کے لیے ہے جو نظام فطرت سے مطابقت کرے۔ جو اس فطری نظام سے مطابقت کے لیے تیار نہ ہو، اس کے لیے اس دنیا میں ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔

خدا کا بنایا ہوا وہ فطری نقشہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جو آدمی اپنے کمائے ہوئے مال کو ذاتی ملکیت نہ سمجھ لے بلکہ اس میں سے دوسروں کو بھی دے تاکہ وہ بھی اپنی ضرورت پوری کر سکیں، ایسے افراد والا سماج خوب فروغ پائے گا۔ اس کے اندر مثبت قدریں ہر طرف پھیلیں گی۔ ایسے لوگوں کے ذریعہ جو سماج بنے گا وہ گویا ایک ہرا بھرا باغ ہوگا۔ وہاں کے انسانوں میں پھول کی مہک اور پھل کی مٹھاس ہوگی۔ اس طرح کے سماج میں ہر ایک کو اس کا حصہ مل رہا ہوگا۔ وہاں دینے والے کو بھی اس کا دیا ہوا مختلف صورتوں میں اس کی طرف لوٹ رہا ہوگا، کبھی براہ راست انداز میں اور کبھی بالواسطہ انداز میں۔

اس کے برعکس معاملہ اس سماج کا ہے جہاں ہر مال والا اپنے مال کو خود اپنے ہی پاس روک کر رکھے۔ ایسے سماج میں لوگ ایک دوسرے سے بے تعلق ہوں گے۔ وہاں کا حال یہ ہوگا کہ جس کو نہیں ملا ہے وہ اس پر حسد کرے گا جس کو ملا ہوا ہے۔ وہاں ہر مال والا صرف اپنی ذات کے دائرہ میں جی رہا ہوگا، سماج کا مجموعی اعتماد اس کو حاصل نہ ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسا سماج کانٹوں سے بھری ہوئی جھاڑی کی مانند بن جائے گا۔ وہاں مال والے لوگ بھی اسی طرح سکون اور چین سے محروم ہوں گے جس طرح کہ بے مال والے لوگ۔

برتر ہاتھ

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مال بڑا سرسبز اور شیریں ہے۔ جو اس کو سخی دل کے ساتھ لے تو اس کے لیے وہ برکت کا ذریعہ ہوگا۔ اور جس نے اس کو حرص کے جذبہ کے تحت لیا تو اس میں اس کے لیے برکت نہیں ہوگی۔ اور وہ اس آدمی کی طرح ہوگا جو کھاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا۔ اور اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے: إن هذا المال خضرٌ حلو، فمن اخذه بسخاوة نفس بورك له فيه، ومن اخذه باشراف نفس لم يبارك له فيه، وكان كالذي يأكل ولا يشبع، واليد العليا خير من اليد السفلى (فتح الباری ۵/ ۳۴۵)

اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے — اس کا مطلب یہ ہے کہ پانے والے کے مقابلہ میں دینے والے کا درجہ زیادہ ہے۔ اسلام ہر آدمی کے اندر یہ اسپرٹ ابھارتا ہے کہ وہ جس سماج میں ہو وہاں وہ اس طرح رہے کہ اس کے ذریعہ سے دوسروں کو کچھ نہ کچھ مل رہا ہو۔ دوسروں سے لے کر جینے کا طریقہ اسلام میں پسندیدہ نہیں۔

یہ دینا اور لینا کوئی سادہ بات نہیں، اس کا تعلق پوری اخلاقیات سے جڑا ہوا ہے۔ جس سماج میں لوگوں کے اندر دینے کا مزاج ہو وہاں مثبت اخلاقیات کو فروغ حاصل ہوگا۔ ایسے ماحول میں باہمی محبت، ایک دوسرے کی رعایت، سماجی خدمت، آپس میں خیر خواہی، آپس میں برادرانہ تعلقات جیسی قدروں کا فروغ حاصل ہوگا۔ پورا سماج ایک خاندان کی مانند بن جائے گا جہاں کوئی کسی کو غیر نہ سمجھے بلکہ ہر ایک دوسرے کو اپنے قریبی کی نظر سے دیکھنے لگے۔

اس کے برعکس جس سماج میں لینے اور صرف اپنے لیے سمیٹنے کا مزاج ہو وہاں منفی اخلاقیات کو فروغ حاصل ہوگا۔ ایسے سماج میں لوگ غیروں اور اجنبیوں کی طرح رہیں گے۔ وہاں باہمی اعتماد کی فضا نہ ہوگی۔ وہاں انسانی خیر خواہی کے بجائے حیوانی خود غرضی کا دور دورہ ہوگا۔

مطلوب انسانی سماج وہ ہے جس کے افراد میں دینے کی اسپرٹ پائی جائے۔ جس سماج کے افراد میں صرف لینے کا جذبہ ہو وہ فطرت کے نقشہ کے خلاف ہے۔ ایسا سماج کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔

فطرت کا نظام

فطرت کا نظام بے اجرت نفع بخشی کے اصول پر قائم ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز دوسروں کو فائدہ پہنچا رہی ہے، بغیر اس کے کہ وہ دوسروں سے اس کی کوئی قیمت وصول کرے، بغیر اس کے کہ وہ دوسروں کے اوپر اس کا کوئی اظہار کرے، یہاں فرائض کی انجام دہی ہے مگر حقوق کا کوئی مطالبہ نہیں، یہاں دوسروں کی رعایت کرنا ہے مگر اپنی بڑائی کا کوئی مظاہرہ نہیں۔

سورج ساری دنیا کو مسلسل روشنی اور حرارت دے رہا ہے، مگر اس کی یہ تمام خدمت مکمل طور پر یک طرفہ ہے نہ کہ دو طرفہ۔ ہوا زمین کے ہر گوشہ میں ہر لمحہ آکسیجن سپلائی کر رہی ہے جس پر زندگیوں کا انحصار ہے، مگر اس نے کبھی اپنا کوئی بل پیش نہیں کیا۔ پانی کا نظام عالمی سطح پر قائم ہے جس کے بغیر زندگی کا وجود ممکن نہیں، مگر یہ سب کچھ کسی معاوضہ کے بغیر ہو رہا ہے۔

درخت سایہ اور پھول اور پھل دیتے ہیں، مگر وہ اس کی کوئی قیمت نہیں مانگتے۔ زمین ہر قسم کی مفید فصل اگاتی ہے جو انسان اور حیوان کے لیے جینے کا سہارا ہے، مگر زمین اپنا یہ سارا کام خدمت گزاری کے اصول پر کرتی ہے نہ کہ اجرت طلبی کے اصول پر۔ چڑیاں ہماری فضاؤں میں ہر طرف پرکشش نغمے بکھیر رہی ہیں، مگر وہ ہم سے کسی تعریف و ستائش کی امید نہیں رکھتیں۔

انسان بھی اسی عالم فطرت کا ایک حصہ ہے، انسان کو بھی وہی طریقہ اختیار کرنا ہے جو بقیہ دنیا کی تمام چیزیں وسیع پیمانہ پر اختیار کیے ہوئے ہیں۔ زندگی کا کوئی بھی دوسرا طریقہ اس دنیا میں نہ ممکن ہے اور نہ مطلوب۔

انسان ایک سماجی حیوان ہے، وہ ہمیشہ بہت سے لوگوں کے درمیان رہتا ہے، بار بار اس کا سابقہ دوسرے انسانوں سے پڑتا ہے۔ اب انسان کے لیے صحیح اور فطری طریقہ صرف یہ ہے کہ جب بھی اس کا سابقہ دوسرے انسانوں سے پیش آئے تو ہر ایک کو دوسرے سے کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچے۔ دو انسانوں کا ملنا دو پتھروں کا ملنا نہ بنے، بلکہ وہ دو ایسی ہستیوں کا ملنا بنے جن میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے رحمت و نعمت کا نمونہ بن جائے۔

فطرت بہترین گائیڈ ہے، بشرطیکہ اس میں خلل نہ ڈالا جائے۔

کائناتی اخلاق

کائنات انسانی اخلاقیات کا ماڈل ہے۔ ہمارے پیدا کرنے والے کو ہم سے جو اخلاقی رویہ مطلوب ہے اس کو اس نے کائنات میں وسیع پیمانہ پر انتہائی معیاری انداز میں قائم کر رکھا ہے تاکہ انسان اس کو دیکھ کر نصیحت لے اور اس اخلاقی روش کو اپنی زندگی میں اپنا لے۔

آسمان اپنی بے پناہ وسعتوں کے باوجود مکمل طور پر خاموش ہے۔ اس طرح وہ انسان کو بتا رہا ہے کہ بولنے سے زیادہ چپ رہنے والے بنو، بتانے سے زیادہ سیکھنے والے بنو۔ تمہیں خواہ کتنی ہی زیادہ عظمت حاصل ہو جائے مگر تم اس طرح رہو جیسے تمہیں کوئی عظمت حاصل نہیں۔

سورج روشنی اور حرارت کا اتھاہ خزانہ ہے۔ وہ ہر آن زمین کو روشنی اور حرارت سپلائی کر رہا ہے۔ مگر وہ کسی سے اس کی قیمت نہیں مانگتا۔ یہ اس بات کا سبق ہے کہ انسان یک طرفہ طور پر فائدہ پہنچانے والا بنے۔ وہ لوگوں کو دیتا رہے خواہ اسے اس کی کوئی قیمت نہ مل رہی ہو۔

ہوا ہر آن سرگرم ہے۔ وہ ہر تنگ اور کشادہ جگہ سے گزر رہی ہے مگر وہ کسی سے ٹکراتی نہیں۔ اس طرح وہ پیغام دے رہی ہے کہ اے انسان تم اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرو کہ دوسروں کے ساتھ تمہارا ٹکراؤ پیش نہ آئے۔ تمہاری سرگرمیاں دوسروں کے لئے کوئی مسئلہ پیدا کرنے والی نہ ہوں۔ درخت زمین سے ایک پودے کی صورت میں نکلتا ہے اور پھر بڑا ہو کر پورا درخت بن جاتا ہے۔ اس سے لوگوں کو سایہ، ہریالی، پھول اور پھل اور دوسری چیزیں ملتی ہیں۔ وہ مٹی اور پانی جیسی چیزوں کو اپنی غذا بنا کر اس کو ایک ہرے بھرے درخت کی صورت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ بتا رہا ہے کہ انسان کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ غصہ کو معافی میں تبدیل کرے۔ وہ منفی جذبات کو مثبت جذبات کی طرف موڑ دے۔ اس کو کسی کی طرف سے برائی کا تجربہ ہو تب بھی وہ اس کی طرف بھلائی کا تحفہ لوٹائے۔ یہ ہے انسانی اخلاقیات کا وہ ماڈل جس کا مظاہرہ کائنات میں ہر آن کیا جا رہا ہے۔

انسان کو چاہئے کہ وہ بھی اس کائناتی نمونہ کو اختیار کرے۔

حسن ظن

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ اچھا گمان کرنا اچھی عبادت میں سے ہے (**حسن الظن من حسن العبادة**) مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۰۳۔

دنیا کی زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ آدمی دوسرے کے بارے میں بدگمان ہو جائے۔ یہ بدگمانی کبھی اس لئے ہوتی ہے کہ آدمی مذکورہ شخص کے بارے میں پہلے سے تعصب کا شکار ہوتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ آدمی ایک برا آدمی ہے، اس لئے اس سے یہی توقع ہے کہ وہ غلط بات کرے یا غلط کام میں ملوث ہو۔

بدگمانی کی دوسری بڑی وجہ معلومات کی کمی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے کے حالات سے پوری طرح واقف نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے صرف ناقص معلومات ہوتی ہیں۔ ان ناقص معلومات کی بنا پر وہ معاملہ کو صحیح رخ کے ساتھ نہیں دیکھ پاتا اور غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔

زندگی کی اس صورت حال نے رائے قائم کرنے کے معاملہ کو ایک مشکل معاملہ بنادیا ہے۔ ہر آدمی اس نازک صورت حال میں مبتلا ہے کہ اگر وہ اپنی ذہنی پیچیدگیوں کا شکار ہو یا ناقص معلومات کی بنیاد پر رائے قائم کرے تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ سخت ناانصافی کرے گا۔ ایسی حالت میں ہر آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ ایک طرف اپنے آپ کو متعصبانہ فکر سے خالی کرے اور دوسری طرف رائے قائم کرنے سے پہلے معاملہ سے متعلق پوری واقفیت حاصل کرے۔ اس چیز نے کسی کے بارے میں اچھی رائے قائم کرنے کے معاملہ کو ایک جہاد کا معاملہ بنادیا ہے۔ یہاں حسن ظن کے لئے ایک جہادی عمل درکار ہے۔ حسن ظن کے اسی پہلو نے حسن ظن کو ایک اعلیٰ عبادت بنادیا ہے۔

حسن ظن کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ کسی کے بارے میں برے خیالات کو اپنے ذہن سے نکال کر اس کے بجائے اچھے خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دینا ہے۔ یہ ایک داخلی جہاد ہے اسی لئے اس کا بہت بڑا ثواب اسلام میں رکھا گیا ہے۔

حسن معاملہ

قرآن میں نکاح وطلاق کے مسائل بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ -طلاق دوبار ہے۔اس کے بعد یا تو خوش اسلوبی کے ساتھ رکھنا ہے یا خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کردینا(البقرہ ۲۲۹)۔ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے اس آیت کا تعلق نکاح وطلاق کے مسئلہ سے ہے مگر اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے اس کا تعلق پوری زندگی سے ہو جاتا ہے۔

انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔اس بنا پر موجودہ دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ دو انسان یا زیادہ انسان باہم اکٹھا ہوتے ہیں۔کبھی وقتی طور پر اور کبھی لمبی مدت کے لئے۔ایسے حالات میں اسلام کا حکم یہ ہے کہ مل کر رہنے کی مدت کو بھی اچھے انداز میں گزارا جائے اور علیحدگی کے بعد بھی اس کو اچھے انداز میں بتایا جائے۔

جب بھی دو یا زیادہ آدمی باہم مل کر رہتے ہیں تو لازمی طور پر ان کے درمیان شکایت اور اختلاف کے مواقع بھی آتے ہیں۔اس دنیا میں بے شکایت قسم کی اجتماعی زندگی ممکن نہیں۔ایسی حالت میں کسی کو یہ نہیں کرنا چاہئے کہ جب تک وہ ساتھ رہ رہا ہو اس وقت تک تو حالات کے دباؤ کی بنا پر بظاہر خوش اسلوبی کے ساتھ نبھائے مگر جب وہ جدا ہو تو اپنی جدائی کو معقول ثابت کرنے کے لئے واقعی یا غیر واقعی شکایتیں ادھر ادھر بیان کرنے لگے۔

ہر آدمی اپنے آپ کو سماج میں باعزت دیکھنا چاہتا ہے۔اس بنا پر شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اسی کوشش میں رہتا ہے کہ جن لوگوں کا ساتھ اس نے چھوڑا ہے ان کی ایسی بری تصویر بنائے کہ لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ وہ لوگ اسی قابل تھے کہ ان کا ساتھ چھوڑ دیا جائے۔مگر اس قسم کی ہر کوشش گناہ ہے۔خواہ وہ واقعہ کے مطابق ہو یا واقعہ کے خلاف۔

مومن وہ ہے جو اس وقت بھی درست بات کہے جب کہ وہ کسی سے راضی ہو اور اس وقت بھی اس کے منھ سے درست بات نکلے جب کہ اس کے اور فریق ثانی کے درمیان ناراضی کی صورت پیدا ہو گئی ہو۔ مومن وہ ہے جو ہر حال میں حسن معاملہ کا ثبوت دے۔

مال کی پاکی

قرآن میں خدا پرست انسان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ----جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ وہ پاکی حاصل کرے اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ مگر صرف اپنے خدائے برتر کی خوشنودی کے لئے اور عنقریب وہ خوش ہو جائے گا۔ (اللیل ۱۸-۲۱)

اسلام میں اس بات کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ آدمی اپنی کمائی کو صرف اپنے لئے خاص نہ کرے بلکہ اس میں سے دوسروں کو بھی دے۔ اپنے کمائے ہوئے مال کو صرف اپنے اوپر خرچ کرنا اور اس میں سے خدا کا اور انسان کا حصہ نہ نکالنا اسلام میں سخت گناہ ہے۔

کوئی شخص اگر اپنا مال دوسرے کو اس لئے دے کہ اس نے اس کے اوپر احسان کیا تھا تو یہ دینا اگرچہ کوئی برائی نہیں مگر صرف اس قسم کے عطیہ سے اسلامی تعلیم کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ احسان اتارنے کے لئے یا کسی اور جوابی فائدہ کے لئے دینے سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کے لئے اسلام میں اپنا مال دوسروں پر خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کوئی آدمی جب اپنے مال کا ایک حصہ دوسرے کو دیتا ہے تو بظاہر وہ ایک غیر شخص کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ مگر اسلام کے مطابق اسکا اصل مقصد خود دینے والے کی اپنی اصلاح ہے۔ اس طرح وہ اپنے دل کو اور اپنی روح کو پاک کرتا ہے۔

مال کے ساتھ کئی اخلاقی برائیاں جڑی ہوئی ہیں۔ مثلاً بخل، طمع، اور احساس برتری وغیرہ۔ کوئی مال والا جب اپنے مال کو اللہ کے حکم کی بنا پر دوسروں کو دیتا ہے تو وہ ان برائیوں کو اپنے اندر سے نکالتا ہے۔ مال کو صرف اپنے لئے خاص کرنا گویا ان برائیوں کو اپنے اندر پرورش کرنا ہے۔ اور مال میں سے دوسروں کو دینا گویا اپنے آپ کو دھو کر ان برائیوں سے پاک کرنا ہے۔

آدمی جب بلا معاوضہ اپنا مال دوسروں کو دیتا ہے تو وہ اپنے اندر، بخل کے جذبات کو کچلتا ہے۔ وہ مال سے محبت کا تعلق توڑتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو یہ سبق دیتا ہے کہ مال ضرورت کے لئے ہے نہ کہ عزت اور شان بڑھانے کے لئے۔ مال کا دینا بیک وقت پانے والے کے لئے بھی مفید ہے اور دینے والے کے لئے بھی۔

نفسیاتی پیچیدگی سے پاک

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ ایک مجلس میں بیٹھے ہوے تھے۔ اس دوران ایک آدمی سامنے سے گذرا۔ آپ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ یہ شخص جنتی ہے۔ جو لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک صاحب بتاتے ہیں کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ شخص کون سا عمل کرتا ہے جس کی وجہ سے پیغمبر اسلام نے اس کو جنتی بتایا۔ چنانچہ وہ اس آدمی کے گھر گئے، انہوں نے اس سے اجازت لیکر تین دن تک اس کے یہاں قیام کیا۔ تیسرے دن جب وہ وہاں سے جانے لگے تو اس آدمی نے پوچھا کہ آپ کس لئے یہاں آئے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا مذکورہ واقعہ بتایا اور کہا کہ میں تین دن تک تم کو دیکھتا رہا۔ مگر میں نے تمہارے اندر کوئی عبادت یا عمل نہیں دیکھا جو عام مسلمانوں سے زیادہ ہو۔

اس آدمی نے جواب دیا کہ میں وہی ہوں جیسا کہ تم نے مجھے دیکھا۔ البتہ میرے اندر ایک چیز ہے اور شاید اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا ہو۔ اور وہ یہ کہ میں اپنے اندر کسی کے خلاف کینہ نہیں پاتا (غیر انی لا اجد فی نفسی لأحد من المسلمین غشا) مسند احمد۔

موجودہ دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے شکایت ہو جاتی ہے۔ سماج میں رہتے ہوئے بے شکایت زندگی ممکن نہیں۔ کبھی کوئی شخص سخت الفاظ بول دیتا ہے۔ کبھی کوئی شخص آپ کی امیدوں کو پورا نہیں کرتا۔ کبھی کسی شخص سے آپ کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص ایسا عمل کرتا ہے جس سے آپ کی انا پر چوٹ پڑتی ہے یا آپ کا وقار مجروح ہوتا ہے وغیرہ۔

اس طرح کی تلخ یادیں مستقل طور پر آدمی کے حافظہ میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ ان کو مٹانا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر آدمی کا امتحان ہو رہا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں کامیاب ہو کر وہ اپنے آپ کو جنت کا مستحق بنا سکتا ہے۔ اس امتحان میں کامیابی یہ ہے کہ آدمی ان تلخ یادوں کو بھلانے کی کوشش کرے۔ اور اگر وہ یاد آئیں تو ان کا اثر قبول کرنے سے انکار کر دے۔ اپنے منفی احساسات سے اوپر اٹھنے والا انسان ہی جنت کے باغوں میں داخل کیا جائیگا۔

حسد

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے، اس طرح جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ (ایاکم والحسد، فان الحسد یأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب) ابوداود بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۰۱۔

آگ لکڑی کی قاتل ہے۔ اس لئے لکڑی کو محفوظ رکھنے کے لئے اس کو آگ سے بچانا پڑتا ہے۔ اسی طرح کچھ چیزیں انسانی جسم کے لئے مہلک ہیں۔ جسم کی صحت وعافیت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان مہلک چیزوں سے اس کو مکمل طور پر بچایا جائے۔

ٹھیک یہی معاملہ انسان کی اندرونی شخصیت کا ہے۔ انسان کی روح یا اس کے اندر کی شخصیت ہی اصل انسان ہے۔ اس داخلی انسان کے لئے بھی کچھ چیزیں بے حد مہلک ہیں۔ وہ اس کو آگ کی طرح کھا جانے والی ہیں۔ اس لئے یہ انسان کے اپنے فائدہ کی بات ہے کہ وہ ان مہلک چیزوں سے اپنی شخصیت کو بچائے، وہ اپنے انسانی وجود کا محافظ بن جائے۔ ان مہلک چیزوں میں سب سے زیادہ مہلک چیز حسد ہے۔ جو انسان حسد کا شکار ہو جائے وہ یقینی طور پر اپنی روحانی زندگی کا بھی خاتمہ کر لیگا۔

حسد کیا ہے؟ حسد یہ ہے کہ آدمی کسی دوسرے کو اپنے سے زیادہ دیکھے تو وہ اس کو برداشت نہ کر سکے، وہ اس کے خلاف جلن میں مبتلا ہو جائے، اس قسم کی جلن بلاشبہ یکطرفہ طور پر صرف حاسد کو نقصان پہنچاتی ہے، وہ محسود کی بڑائی میں کوئی کمی نہیں کرتی۔

موجودہ دنیا میں جب بھی کسی کو کسی قسم کی بڑائی ملتی ہے تو وہ خدا کا ایک عطیہ ہوتی ہے۔ یہ دراصل خدا ہے جو اپنی مصلحت کے تحت کسی کو ایک چیز دیتا ہے اور کسی کو دوسری چیز۔ کسی کو کم دیتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ ایسی حالت میں کسی کی بڑائی پر حسد کرنا خدا کے قائم کئے ہوئے فطری نظام کے خلاف لڑنا ہے۔ اس قسم کی لڑائی میں کوئی بھی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ خدائی فیصلے کا اعتراف نہ کرنے کی بنا پر وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے۔

عافیت کا راز

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو تکلیف پہنچائے تو اللہ اس کو تکلیف پہنچائے گا۔ اور جو شخص کسی کو مشقت میں مبتلا کرے گا تو اللہ اس کو مشقت میں مبتلا کرے گا (من ضار ضار الله به و من شاق شاق الله علیه) مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۰۱

خدا نے اس دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی عمل یک طرفہ نہیں، یہاں ہر عمل اپنا دو طرفہ انجام رکھتا ہے۔ آپ ایک گیند کو دیوار پر ماریں تو وہ دوبارہ آپ کی طرف لوٹے گی۔ آپ کسی کو گالی دیں تو گالی کے الفاظ جس طرح دوسرے شخص کے کان تک پہنچیں گے اسی طرح وہ آپ کے کان میں بھی داخل ہوں گے۔ آپ کسی سے انتقام لیں تو وہ اور اس کی اولاد بھی اس انتقام کا انتقام لے گی۔ یہی معاملہ ہر عمل کا ہے۔ کوئی شخص جب کسی کے خلاف ایک عمل کرے تو اس کو جاننا چاہئے کہ فریق ثانی جس طرح اس عمل کا شکار ہو گا اسی طرح خود عمل کرنے والے کو بھی کسی نہ کسی صورت میں اس کا انجام بھگتنا پڑے گا۔

یہی حقیقت مذکورہ حدیث میں بتائی گئی ہے۔ اس سنگین حقیقت کا تعلق ہر انسان سے ہے۔ کوئی بھی شخص کسی بھی حال میں اس سے بچنے پر قادر نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں عافیت کی زندگی حاصل کرنے کی سب سے آسان تدبیر یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو عافیت میں رکھے۔ جو آدمی دوسروں کو تکلیف نہ دے وہ اپنے آپ کو تکلیف میں پڑنے سے بچاتا ہے۔ جو آدمی دوسروں کو تنگی میں مبتلا نہ کرے وہ خود بھی اس دنیا میں تنگی اور مشقت سے محفوظ رہے گا۔

اس دنیا میں کوئی بھی شخص فطرت کے نظام سے آزاد ہو کر اپنی زندگی نہیں بنا سکتا۔ یہاں ہر آدمی کے لئے فطرت کے نقشہ سے مطابقت ضروری ہے، خواہ وہ چھوٹا آدمی ہو یا کوئی بڑا آدمی۔ یہاں فطرت کے نقشہ سے مطابقت کا نام کامیابی ہے اور فطرت کے نقشہ سے انحراف کا نام ناکامی۔

اسلام فطرت سے الگ کوئی طریقہ نہیں۔ اسلام دراصل فطرت ہی کے ابدی اصولوں کا انسانی زندگی پر انطباق ہے۔

اصلاحی زندگی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا کے پیغمبر حضرت شعیبؑ کو اللہ تعالی نے اہل مدین کی طرف بھیجا۔ جن کی حیثیت اس وقت ایک بگڑی ہوئی قوم کی تھی۔ پیغمبر نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل پہنچ چکی ہے۔ پس ناپ اور تول پوری کرو۔ اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو۔ اور فساد نہ ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ (الاعراف ۸۵)

قرآن کے مطابق موجودہ دنیا ایک اصلاح یافتہ دنیا ہے یہاں صحیح زندگی یہ ہے کہ آدمی دنیا کے اصلاح یافتہ نقشہ کو باقی رکھتے ہوئے یہاں زندگی گذارے۔ اگر وہ فطرت کے اس مقرر نقشہ میں بگاڑ پیدا کرے تو یہ اس کے لئے ایک نا قابل معافی جرم ہوگا۔ اس جرم کی پکڑ سے وہ خدا کے یہاں بچ نہیں سکتا۔

اس فطری نقشہ کا ایک پہلو وہ ہے جو مادی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً ہوا کا نظام، پانی کا نظام، درختوں کا نظام، زراعت کا نظام وغیرہ۔ ان نظاموں میں تبدیلی کئے بغیر اس سے استفادہ کرنا انسان کا حق ہے۔ لیکن اگر وہ اس نظام کو بدلے مثلاً وہ زمین کے درختوں کو کاٹ ڈالے یا پانی کے ذخیرہ کو آلودہ کردے یا ایسی کارروائی کرے جس سے ہوا میں گیسوں کا تناسب بدل جائے تو اس قسم کا کوئی بھی عمل اس کے لئے ایک نا قابل معافی جرم ہوگا۔

دوسرا نقشہ وہ ہے جو انسانی سماج میں مطلوب ہے اس کا علامتی معیار ترازو ہے۔ ترازو کی صفت یہ ہے کہ وہ چیزوں کو نہایت منصفانہ طور پر تولتا ہے۔ کم یا زیادہ تولنا ترازو کی فطرت کے خلاف ہے۔ انسان کو بھی اسی صفت کو اختیار کرنا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اس دنیا میں لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں ترازو کی مانند انصاف کا رویہ اختیار کرے۔ وہ منصفانہ روش کے اصول پر اپنی زندگی کا نقشہ بنائے۔

ترازو ایک اعتبار سے صحیح تول کی علامت ہے اور دوسرے اعتبار سے پورے اخلاقی رویہ میں انصاف اور دیانتداری کی علامت۔

فرائض پر نظر

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ عنقریب حکمرانوں میں بگاڑ آجائے گا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس وقت ہم کیا کریں؟ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ حاکموں کو ان کا حق ادا کرو اور اپنا حق خدا سے مانگو (ادوا إليهم حقهم وسلوا الله حقكم) بخاری و مسلم، بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۲/۱۰۸۷۔

یہی بات حضرت مسیح نے ان الفاظ میں فرمائی کہ جو قیصر کا ہے قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے خدا کو دو۔ یہ آسمانی شریعتوں کی ایک اہم تعلیم ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ حقوق کے بجائے فرائض پر نظر رکھے۔ وہ حقوق کے نام پر دوسروں سے ٹکراؤ کرنے کے بجائے خود اپنی ڈیوٹی کو پہچانے اور اس کو پورا کرنے میں لگ جائے۔

اس کا تقاضا ہے کہ آدمی کی نظر اپنے حق پر نہ ہو بلکہ اپنے فریضہ پر ہو۔ وہ یہ نہ دیکھے کہ اس کو کیا ملا اور کیا نہیں ملا بلکہ اس کی ساری توجہ اس پر مرتکز رہے کہ خود اس نے کیا دیا۔ اس نے انسانیت کے اثاثہ میں کیا اضافہ کیا۔

حقوق طلبی کا مزاج سماج میں انتشار اور ٹکراؤ پیدا کرتا ہے۔ وہ باہمی اعتماد کی فضا کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ نفرت اور دشمنی کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس جس سماج کے افراد کی نظر خود اپنی ڈیوٹی پر ہو وہاں سماج میں مثبت قدروں کو فروغ ہوگا۔ وہاں باہمی اعتماد کا ماحول پرورش پائے گا۔ لوگ ایک دوسرے کا احترام کریں گے۔ ایسے سماج میں امن اور سکون کی ہوائیں چلیں گی۔

سماج سے حکومت بنتی ہے، حکومت سے سماج نہیں بنتا۔ اگر کسی سماج میں مثبت قدروں کو فروغ حاصل ہو جائے تو اس کے بعد وہاں جو حکومت بنے گی وہ بھی اپنے آپ ایک درست حکومت ہوگی۔ اس کے برعکس جس سماج میں منفی قدروں کا غلبہ ہو وہاں حکومت بھی ویسی ہی ہوگی جیسا کہ وہاں کا سماج ہے۔ حدیث کا مذکورہ اصول سماج کی اصلاح کا بھی ضامن ہے اور اس کے ساتھ حکومت کی اصلاح کا بھی ضامن۔ ذاتی اصلاح اجتماعی اصلاح کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

غصہ نہیں

قرآن میں مطلوب انسان کی جو صفتیں بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ انہیں جب غصہ آتا ہے تو وہ غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں (**والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس**) آل عمران ۱۳۴۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے پیغمبر اسلام ﷺ سے کہا کہ اے خدا کے رسول مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جو میرے لئے مفید ہو اور وہ بات مختصر ہو تاکہ میں اس کو یاد رکھوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم غصہ نہ کرو۔ سائل نے بار بار اپنا سوال دہرایا۔ آپ نے ہر بار یہی جواب دیا کہ تم غصہ نہ کرو (**یا رسول الله قل لي قولا ينفعني واقلل عليّ لعلي اعيه: فقال رسول الله ﷺ لا تغضب فاعاد عليه حتى أعاد عليه مراراً كل ذلك يقول لا تغضب**)۔ تفسیر ابن کثیر ۱/۴۰۵۔

فرد کی اصلاح اور سماج کی تعمیر دونوں کے لئے یہ ایک کلیدی اصول ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی کو بار بار ایسے تجربات پیش آتے ہیں جو اس کے اندر غصہ کو بھڑکا دیں۔ اب اگر آدمی ایسے منفی واقعات کا اثر لیتا رہے تو وہ معتدل ذہن کے ساتھ دنیا میں نہیں جی سکتا۔ اس کے ذہن میں ہر وقت ایک قسم کا اشتعال برپا رہے گا۔ اس کی یہ حالت اس کی صلاحیتوں کو کھا جائے گی۔ وہ اس قابل نہ رہے گا کہ اپنی جدوجہدِ حیات کا کوئی مثبت نقشہ بنا سکے۔

یہی معاملہ پورے سماج کا ہے۔ جس سماج کے لوگوں میں غصہ کو کنٹرول کرنے کا مزاج نہ ہو، ایسے سماج میں سکون رخصت ہو جائے گا۔ لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیل جائیگی۔ ایک دوسرے کے لئے خیر خواہی اور ایک دوسرے سے ہمدردی جیسی قدریں باقی نہ رہیں گی۔ جس سماج کا حال یہ ہو جائے وہ سماج کبھی ترقی کا سفر طے نہیں کر سکتا۔

غصہ کو روکنا سادہ طور پر صرف ایک عمل نہیں، وہ تمام دوسرے معاملات کی اصلاح کے لئے ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

خبر کی تحقیق

قرآن میں جو احکام دئے گئے ہیں ان میں سے ایک حکم یہ ہے -اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچادو، پھر تم کو اپنے کئے پر پچھتانا پڑے (الحجرات ٦)۔

بہت سے انسان جب مل جل کر زندگی گذارتے ہیں تو ان کے درمیان طرح طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ان واقعات سے خبریں بنتی ہیں۔ یہ خبریں لوگ بیان کرتے ہیں۔ اس طرح وہ پورے سماج میں پھیل جاتی ہیں۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اگر کسی خبر کو صرف سن لینا کافی سمجھا جائے اور لوگ ایک بار سنتے ہی اس کو بیان کرنے لگیں تو تقریباً ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ خبر کی صورت بدل جاتی ہے۔ ابتدائی طور پر واقعہ اگر ایک سادہ واقعہ تھا تو اپنی آخری صورت میں پہنچ کر وہ بدلتے بدلتے ایک سنگین واقعہ بن جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر تحقیق کا مزاج ہو۔ لوگ ایسا کریں کہ محض سن کر کسی خبر کو نہ مان لیں اور نہ ہر سنی ہوئی بات کو بیان کرنا شروع کر دیں۔ لوگوں کے اندر یہ مزاج ہونا چاہیے کہ وہ جب بھی کسی خبر، خاص طور پر بری خبر کو سنیں تو اس کی پوری تحقیق کریں ہر پہلو سے اس کی نوعیت اور واقعیت کو جانچیں اس طرح ضروری تحقیق کر لینے کے بعد اپنی رائے بنائیں۔

اگر آپ کسی بری خبر کو سنتے ہی اس کو مان لیں تو اس کا نقصان یہ ہوگا کہ اس کی بنا پر آپ ایک انسان کے بارے میں غیر واقعی رائے قائم کر لیں گے اور اس کو ایک ایسے جرم کا مجرم قرار دے دیں گے جو اس نے کیا ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بعد کو جب اصل حقیقت کھلے گی تو آپ کو سخت شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔

صحیح سوچ کے لئے تحقیق لازمی طور پر ضروری ہے۔ جن لوگوں میں تحقیق کا مزاج نہ ہو ان کے اندر صحیح سوچ اور درست فکر کا ارتقا بھی نہیں ہو سکتا۔

تحقیق صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ تحقیق کے بغیر بولنا ایک غیر سنجیدہ فعل ہے اور اسی کے ساتھ غیر اسلامی بھی۔

بے انصافی نہیں

حدیث میں آیا ہے کہ مدینہ کے دو آدمی پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس آئے ان کے درمیان ایک زمین کے بارے میں جھگڑا تھا۔ دونوں کا دعویٰ تھا کہ یہ زمین میری ہے۔ مگر دونوں میں سے کسی کے پاس پکا ثبوت موجود نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ تم لوگ میرے پاس اپنے نزاعی معاملات لاتے ہو اور میں ایک انسان ہوں۔ اور یہ ممکن ہے کہ تم میں سے کوئی شخص زیادہ بولنے والا ہو اور وہ دلیل میں دوسرے سے سبقت لے جائے۔ اور میں اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں جو میں تم سے سنتا ہوں۔ پس اگر میں کسی کے حق میں اس چیز کا فیصلہ کر دوں جو دراصل اسکے بھائی کی تھی تو وہ اس کو نہ لے۔ کیوں کہ یہ اس کے لئے آگ کا ایک ٹکڑا ہوگا۔ وہ قیامت میں اس حال میں آئے گا کہ وہ اس کی گردن میں لٹک رہا ہوگا۔ اس کے بعد دونوں آدمی رو پڑے۔ دونوں میں سے ہر ایک نے کہا کہ میرا حق میرے بھائی کے لئے ہے (تفسیر ابن کثیر ۱/ ۵۵۰)۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب دو آدمیوں میں کوئی نزاع پیدا ہو تو وہ فیصلہ کے لئے اس کو عدالت میں لے جاتے ہیں۔ عدالت ظاہری شہادتوں کی بنیاد پر اپنا فیصلہ دیتی ہے۔ یہ شہادتیں اکثر اوقات کافی ثبوت نہیں ہوتیں۔ چنانچہ عدالت ایسا فیصلہ کر دیتی ہے جو لفظی اعتبار سے بظاہر درست معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ درست نہیں ہوتا۔ اس طرح اکثر اوقات حقدار حق سے محروم رہ جاتا ہے اور جو حقدار نہیں ہے وہ غیر واقعی طور پر اس کا مالک بن جاتا ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ لوگ انسانی عدالت کو آخری عدالت نہ سمجھیں۔ انہیں اس حقیقت کا احساس ہو کہ انسانی عدالت کے اوپر بھی ایک اور عدالت ہے۔ یہ خدا کی عدالت ہے، جس سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں۔ خدا کی عدالت میں تمام مقدمات دوبارہ نظرثانی کے لئے پیش ہوں گے۔ وہاں حقائق کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا نہ کہ محض ظاہری الفاظ کی بنیاد پر۔ وہاں بہت سی جیت ہار میں بدل جائیگی اور بہت سی ہار فتح ثابت ہوگی۔

انسان کی عدالت میں کوئی شخص ہوشیاری کر کے بچ سکتا ہے مگر خدا کی عدالت میں کوئی بھی ہوشیاری یا تدبیر اس کو بچانے والی نہیں۔

مشورہ

قرآن میں خدا کے مطلوب انسان کی جو صفات بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ اپنا کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں ﴿وامرهم شوری بینهم﴾ الشوری ۳۸۔

مشورہ انسان کی ایک فطری ضرورت ہے۔ کسی ایک انسان کا علم ہمیشہ محدود ہوتا ہے۔ وہ ساری باتوں کو یا کسی بات کے تمام پہلوؤں کو نہیں جان سکتا۔ حالانکہ موجودہ دنیا میں کوئی صحیح فیصلہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں تمام متعلق پہلوؤں کی رعایت شامل ہو۔ مشورہ اسی مسئلہ کا حل ہے۔ وہ افراد کی انفرادی کمیوں کی تلافی ہے۔

جب کہ معاملہ کو مختلف لوگوں کے درمیان رکھا جائے اور ہر آدمی کو کھلے طور پر اپنی رائے دینے کا موقع حاصل ہو تو ایسی صورت میں زیر مشورہ معاملہ کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ اب یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ جامع واقفیت کی روشنی میں معاملہ کے بارے میں کوئی فیصلہ لیا جائے۔

مشورہ کو حقیقی مشورہ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں میں کچھ اوصاف لازمی طور پر پائے جاتے ہوں ـــــ آدمی کو اپنی کمی کا احساس ہو وہ کسی صحیح رائے کو ماننے کے لئے اپنی انا کو رکاوٹ نہ بننے دے۔ اس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ تعصب کے خول سے نکل کر کھلے ذہن کے ساتھ لوگوں کی باتوں کو سن سکے۔ جس طرح وہ اپنے جاننے کو جانتا ہے۔ اسی طرح وہ اس سے بھی باخبر ہو کہ وہ کون سے امور ہیں جن کی بابت وہ زیادہ نہیں جانتا۔

مشورہ فرد کے لئے بھی خیر کا ذریعہ ہے اور سماج کے لئے بھی۔ وہ چھوٹے معاملات میں بھی مفید ہے اور بڑے معاملات میں بھی۔ وہ ہر مرد اور عورت کے لئے ہے، کوئی بھی مرد یا عورت اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مزید یہ کہ مشورہ صرف ایک دینوی عمل نہیں ہے، وہ ایک عبادت بھی ہے۔ مشورہ دنیا کے اعتبار سے رحمت ہے اور آخرت کے اعتبار سے ثواب۔ مشورہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی سمجھ کے ساتھ دوسروں کی سمجھ کو بھی اپنے فیصلہ میں شامل کر لے۔

برائی پھیلانا

قرآن کی سورہ النور میں کچھ خاص معاشرتی ہدایات دی گئی ہیں اس کا پس منظر یہ تھا کہ مدینہ کے کچھ غیر مخلص اور غیر ذمہ دار مسلمانوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں ایک لغو بات سنی اور فوراً ہی اس کا چرچا کرنے لگے۔ اس فعل کو قرآن میں اشاعت فاحشہ کہا گیا ہے (النور ۱۹) اس سلسلہ میں ایک ضروری ہدایت قرآن میں ان الفاظ میں دی گئی ہے۔

ولولا إذ سمعتموه قلتم ما يكون لنا أن نتكلم بهذا سبحانك هذا بهتان عظيم. يعظكم الله أن تعودوا لمثله ابداً إن كنتم مؤمنين. (النور ۱۶–۱۷)

اور جب تم نے اس کو سنا تو یوں کیوں نہ کہا کہ ہم کو زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات منھ سے نکالیں۔ معاذ اللہ یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ پھر کبھی ایسا نہ کرنا اگر تم مؤمن ہو۔

ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے اس آیت کا تعلق عائشہ صدیقہؓ کے بارہ میں جھوٹے پروپگنڈے سے ہے مگر قرآن ایک ابدی کتاب ہے اور اس اعتبار سے اس آیت کا ایک عمومی اور وسیع تر مفہوم بھی ہے اور وہ یہ کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کے بارہ میں اس نوعیت کی کمزوری سے بچنے کا شدید اہتمام کرے جو اسلام کے دور اول میں مدینہ کے معاشرہ میں پیش آئی تھی۔

سماجی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کے بارہ میں کوئی بات سامنے آتی ہے۔ باعتبار حقیقت وہ ایک سادہ بات ہوتی ہے مگر کوئی شخص نادانی یا شر پسندی کی بنا پر اسکا ایک الٹا مفہوم نکال کر اس کو بیان کرتا ہے۔ اب سننے والے اس کو لے کر اس کو پھیلانا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ بے بنیاد بات ہر طرف پھیل جاتی ہے۔

اسلامی شریعت کے مطابق، یہ طریقہ بدترین جرم کی حیثیت رکھتا ہے صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب کسی کی زبان سے ایسی کوئی بات سنی جائے تو فوراً اسکی دلیل اس سے پوچھی جائے اگر وہ اپنے قول کی تائید میں کوئی حقیقی دلیل نہ دے سکے تو سختی کے ساتھ اسکی مذمت کی جائے اور لوگوں کے اندر یہ ذہن پیدا کیا جائے کہ کوئی شخص بے دلیل بات نہ اپنی زبان سے نکالے اور نہ کوئی سننے والا اس کو سنے۔

بری بات کو تحقیق کے بغیر دہرانا اسلام میں بہت بڑا جرم ہے۔

نقصان میں فائدہ

قرآن کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ جب وہ کچھ کھوئے تو وہ اس پر مایوس نہ ہو (الحدید ۲۳)۔ یہ ایک اہم اصول ہے جو موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں لازمی طور پر ہر انسان کو ''نقصان'' کا تجربہ پیش آتا ہے اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں، حتی کہ پیغمبر بھی نہیں۔ یہ سادہ معنوں میں صرف نقصان نہیں ہے بلکہ وہ اعلیٰ ترقی کا زینہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں نقصان کے بغیر کوئی شخص بڑی ترقی کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

ایک شخص بچپن میں یتیم ہو جائے تو بظاہر یہ نقصان کا واقعہ ہے۔ مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سرپرست سے محرومی اس کے لئے خود اعتمادی کی تربیت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ایک باپ معاشی دوڑ میں ناکام رہ جائے تو اس کے بچوں میں عمل کا نمایاں شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ زیادہ محنت کرکے باپ سے بھی زیادہ بڑی ترقی حاصل کر لیتے ہیں۔

ایک شخص کو اپنے باپ سے وراثت میں کچھ زرعی زمین ملی مگر اس کے کچھ قریبی لوگوں نے غلط کارروائی کر کے اس کی آبائی زمین اس سے چھین لی۔ اس کے بعد وہ شہر چلا گیا۔ اس نے ایک فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ یہاں اس کی صلاحیتوں کو زیادہ بڑا موقع ملا۔ ترقی کرتے کرتے وہ خود ایک فیکٹری کا مالک بن گیا۔ زرعی نقشہ میں اس نے جو کچھ کھویا تھا، صنعتی نقشہ میں اس نے مزید اضافہ کے ساتھ اس کو پالیا۔

اس دنیا میں امکانات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہاں نقصان میں بھی فائدہ کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ یہاں کھونے کے بعد بھی آدمی دوبارہ بہت کچھ پالیتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ بے حوصلہ نہ ہو۔ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو مسلسل استعمال کرتا رہے۔

مایوسی ہمیشہ وقتی نقصان کی بنا پر ہوتی ہے۔ آدمی کی نگاہ اگر مستقبل کو دیکھ سکے تو وہ کبھی مایوس نہ ہو کیوں کہ اس دنیا میں بار بار حالات بدلتے ہیں۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ زمین کی گردش رات کو صبح میں تبدیل کر دیتی ہے۔

انسانی کردار

قرآن کی سورۃ نمبر ۱۴ میں ارشاد ہوا ہے کہ کیا تم نے نہیں دیکھا، کس طرح مثال بیان فرمائی خدا نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت پر اپنا پھل دیتا ہے۔ اپنے رب کے حکم سے اور خدا لوگوں کے لئے مثال بیان کرتا ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں (ابراہیم: ۲۴،۲۵)۔

پھلدار درختوں کا یہ اصول ہے کہ وہ اپنے موسم پر اپنا پھل دیتے ہیں۔ موسم آتے ہی ایسے درختوں میں پھول نکلتے ہیں جو بہت جلد پھل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

وقت پر اپنا پھل دینا یہ درخت کی صفت ہے۔ یہی صفت انسان سے بھی مطلوب ہے۔ جو واقعہ درخت میں پھل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے وہی واقعہ انسان کی زندگی میں اخلاقی رویہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ گویا ایک اگر مادی پھل ہے تو دوسرا اخلاقی پھل۔ پہلا واقعہ طبیعی قانون کے تحت پیش آتا ہے اور دوسرا واقعہ خود انسان کے اپنے شعوری فیصلہ کے تحت۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے ہر موقع پر اپنے قول و عمل سے وہ اسی روش کا اظہار کرے جس کی توقع انسان ہونے کی حیثیت سے اس سے کی گئی ہے۔ کسی معاملہ میں اس کو اپنا بیان دینا ہو تو وہ وہی کہے جو انصاف کا تقاضا ہو۔ وہ کسی حال میں بے انصافی کی بات اپنی زبان سے نہ نکالے۔ اگر کسی کی طرف سے کوئی اشتعال انگیز بات پیش آئے تو وہ اس کے مقابلہ میں تحمل کا انداز اختیار کرے، کیونکہ تحمل کے خلاف روش انسان کی انسانیت کے مطابق نہیں۔

اس کا یہی انداز عملی معاملات میں بھی ہو۔ وہ جب بھی لوگوں کے درمیان کوئی عمل کرے تو پہلے یہ سوچ لے کہ اس کا یہ عمل اس کے انسان ہونے کی حیثیت کے مطابق ہے یا اس کے مطابق نہیں۔ وہ جب ایک راستہ پر چلے تو وہ دوسروں کو بھی راستہ دے رہا ہو۔ وہ جب دوسروں کے ساتھ لین دین کرے تو اس کا لین دین عین وہی ہو جس کی امید اس سے انسان ہونے کی بنا پر کی گئی تھی۔

منتخب بندے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت آدم کی تخلیق کے وقت خدا اور ابلیس کے درمیان ایک مکالمہ ہوا۔ اس مکالمہ کا ایک جزء یہ تھا: ابلیس نے کہا: اے میرے رب، جیسا تو نے مجھ کو گمراہ کیا ہے اسی طرح میں زمین میں ان کے لئے مزین کروں گا اور سب کو گمراہ کردوں گا۔ سوا ان کے جو تیرے چنے (مخلص) بندے ہیں۔ خدا نے کہا یہ ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے۔ بیشک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا زور نہیں چلے گا۔ سوا ان کے جو گمراہوں میں سے تیری پیروی کریں۔ اور ان سب کے لئے جہنم کا وعدہ ہے۔ اس کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازہ کے لئے ان لوگوں کے الگ الگ حصے ہیں (الحجر: ۴۴-۳۹)۔

ابلیس یا شیطان لوگوں کو صحیح راستے سے بھٹکانے کے لئے جو تدبیر اختیار کرتا ہے وہ تزئین ہے۔ یعنی غلط عمل کو درست بنا کر پیش کرنا۔ تزئین کے اس فتنہ سے وہ لوگ بچیں گے جو خدا کے چنے ہوئے بندے ہوں۔ اس بچاؤ کی صورت کیا ہوگی اس کا جواب ایک حدیث میں اس طرح ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں اپنے بندوں کی مغفرت اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک کہ وہ مجھ سے استغفار کرتے رہیں (القرطبی ۱۰/۲۷)۔

اس سے معلوم ہوا کہ تزئین کا توڑ استغفار ہے۔ یعنی جب بھی شیطان کسی غلط عمل کو مزین کر کے پیش کرے تو بندہ حکمت خداوندی کو استعمال کر کے شیطانی فریب کی حقیقت کھول دے۔ وہ اپنی ایمانی فراست کے ذریعہ شیطان کی تزئین کو سمجھ جائے اور استغفر اللہ کہہ کر اپنے آپ کو شیطان کے فکری جال میں پھنسنے نہ دے۔

شیطانی تزئین کا معاملہ فکر اور سوچ کی سطح پر ہوتا ہے۔ اس کے توڑ کی واحد تدبیر یہ ہے کہ آدمی خدائی وحی اور خدائی نشانیوں میں غور کر کے اپنے آپ کو اس حد تک باشعور بنائے کہ جب بھی شیطان کسی غلط چیز کو مزین کر کے اس کے سامنے لائے تو وہ فوراً اس کا تجزیہ کر کے اس کی غلطی کو معلوم کرے۔ اور اس طرح اس کے فریب میں پڑنے سے اپنے آپ کو بچالے۔

کھونے میں پانا

قرآن میں ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر مصیبت ڈالتا ہے۔ اس کو محرومی اور نقصان میں مبتلا کرتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ بندہ صبر کرے تو صبر کی یہ روش اس کو ہدایت والا بنا دیتی ہے (البقرہ: ۱۵۷)۔

اس معاملہ کی مزید وضاحت ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی بھی مسلم پر جب کوئی مصیبت آتی ہے اور وہ اپنی مصیبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون کہتا ہے اور یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ، مجھے میری مصیبت پر اجر دے اور اس کے بعد اس سے بہتر عطا فرما تو اللہ اس کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے:

لا يصيب احدا من المسلمين مصيبة فيسترجع عند مصيبته ثم يقول: اللّٰهم اجرني في مصيبتي واخلف لي خيرا منها الافعل ذلك به (تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۹۸)۔

دنیا جس قانون الٰہی کے تحت چل رہی ہے اس کے مطابق یہاں ہر آدمی پر مصیبت کے لمحات آتے ہیں۔ مصیبت کے ان لمحات میں آدمی اگر مغلوب نہ ہو، وہ ان کے مقابلہ میں ثابت قدم رہتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کرے، وہ انسانوں سے شکایت کرنے کے بجائے اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے تو اس کی یہ صابرانہ روش زیادہ بہتر انجام کے ساتھ اس کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ زیادہ بہتر انجام ہدایت کی روشنی ہے۔

مصیبتوں پر صبر سے آدمی کی روحانیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ زیادہ حساس ہو کر خدائی فیضان کو اخذ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر تواضع کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ خلاف ایمان اوصاف، مثلاً گھمنڈ، انتقام، بے اعترافی، حب جاہ، وغیرہ، کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ایسا آدمی، شعوری اعتبار سے، دنیا سے دور اور آخرت سے قریب ہو جاتا ہے۔

مصیبت حقائق معنوی میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ مصیبت کے ذریعہ آدمی کو معرفت کی روشنی حاصل ہوتی ہے۔ مصیبت میں آدمی مادی چیز کھوتا ہے اور اس کے بدلے میں وہ روحانی نعمتوں کو حاصل کر لیتا ہے۔ مگر یہ "کھونے میں پانا" صرف اس شخص کے لئے مقدر ہے جو مصائب و نقصان پر صبر کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

خرابی کی جڑ

اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو پیدا کیا تو ابلیس کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کرے مگر ابلیس نے ایسا کرنے سے انکار کیا اس کا سبب اس کا بڑائی کا احساس تھا(أنا خير منه) آدم کو چھوٹا سمجھنا اور ان کے مقابلے میں اپنے کو بڑا سمجھ لینا یہی وہ جرم تھا جس کی بنا پر ابلیس خدا کی پیروی نہ کر سکا اور ملعون قرار پایا۔

یہی احساس تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ انسانی زندگی میں جتنی بھی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان سب کی وجہ آخر کار یہی خود ساختہ برتری کا احساس ہوتا ہے۔

آدمی جب حق کا اعتراف نہیں کرتا تو اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ اس نے داعی حق کو کم اور اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ سمجھ لیا تھا جب آدمی کسی کے خلاف زیادتی کرتا ہے تو اس کی جرأت بھی اس کو اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ مذکورہ شخص کو کمتر اور اس کے مقابلے میں اپنے آپکو برتر سمجھ رہا ہوتا ہے۔

اسی طرح اداروں میں جب عہدے کے جھگڑے ہوتے ہیں تو اس کے پیچھے بھی یہی سبب ہوتا ہے۔ ایک شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اس عہدے کا زیادہ مستحق ہوں۔

اپنے بارے میں بڑائی کا احساس رکھنے والا آدمی اگر اپنے آپ کو زور آور پائے تو وہ اپنے خیال کے مطابق کمزور فریق کے خلاف ظلم وزیادتی کرنے لگتا ہے۔ یہ گویا اپنے احساس برتری کا فعّال اظہار ہے۔ اس کے بجائے وہ آدمی جس کا یہ حال ہو کہ وہ احساس برتری کا شکار تو ہو لیکن وہ زور آور نہ ہو، ایسا آدمی انفعالی طور پر اپنے جذبہء برتری کا اظہار کرتا ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو حسد اور جلن جیسی نفسیاتی کمزوریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ لفظی بڑائی کر کے دوسرے کے قد کو چھوٹا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے رجحان کے مطابق، جس واقعے کو وہ خارجی طور پر ظہور میں نہ لا سکے اس کو وہ اپنے قلب اور اپنی زبان کے ذریعے ظہور میں لا کر یہ تسکین حاصل کرتے ہیں کہ جو ان سے چھوٹا تھا اس کو انہوں نے آخر کار چھوٹا ثابت کر دیا۔

فرشتوں کی صفت اعتراف ہے اور شیطان کی صفت بے اعترافی۔

نفس مطمئن

قرآن میں کامیاب انسان کو النفس المطمئنة کہا گیا ہے یعنی مطمئن روح(Peaceful Soul)۔ اس سے مراد وہ انسان ہے جو جئے تو حالت اطمینان میں جئے اور اس پر موت آئے تو حالت اطمینان پر موت آئے۔ وہ ہر حال میں مطمئن زندگی گزارنے والا ہو۔

قرآن میں اس کے دو معیار بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا جب اس کو آسودگی اور فراوانی عطا فرمائے تو وہ فخر وناز کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو بلکہ متواضع انسان بن کر دنیا میں رہے۔ دوسرا معیار یہ ہے کہ خدا جب اس کو معاشی تنگی میں مبتلا کرے تو وہ مایوسی اور دل شکستگی کا شکار نہ ہو بلکہ وہ صبر وشکر کے ساتھ اس کا استقبال کرے۔

دنیا کی زندگی میں حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ یہاں کبھی فراخی آتی ہے کبھی تنگی۔ کبھی مشکل پیش آتی ہے اور کبھی آسانی۔ کبھی موافق صورتحال سے سابقہ پیش آتا ہے اور کبھی ناموافق صورتحال سے۔ یہ مختلف حالات امتحان کے لئے ہوتے ہیں جو انسان ان حالات میں مثبت ذہن پر قائم رہے وہ اللہ کی نظر میں کامیاب ٹھہرا اور منفی ذہنیت کا شکار ہو جائے وہ ناکامیاب ہو گیا۔

نفس مطمئن کا مطلب شاداں وفرحاں ہونا نہیں ہے۔ اس دنیا میں شاداں وفرحاں صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو سطحی طرز فکر کا حامل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مادی آسائش کی کوئی بھی مقدار اعلیٰ انسان کو مطمئن نہیں کرتی ہر مادی آسائش اعلیٰ ذہن والے انسان کو اپنی ذہنی سطح سے کمتر محسوس ہوتی ہے اس لئے وہ اس پر مطمئن بھی نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ آیت میں اطمینان کا تعلق دنیوی چیزوں سے نہیں ہے بلکہ خدا سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو خدا کی طرف سے جس آزمائش میں بھی ڈالا جائے خواہ وہ فراوانی کی آزمائش ہو یا تنگی کی آزمائش، ہر حال میں وہ راضی برضا رہے۔ کوئی بھی تجربہ خدا کی نسبت سے اس کے اطمینان قلب کو برہم نہ کرے۔ سکھ کی حالت ہو یا دکھ کی حالت، ہر حال میں خدا کے ساتھ اس کا روحانی تعلق یکساں طور پر برقرار رہے۔

قانون فطرت

روی الإمام مسلم فی صحیحه عن ابی هریرة عن النبی ﷺ قال: من یسّر علی معسر فی الدنیا یسر الله علیه فی الدنیا والآخرة.

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص دنیا میں کسی تنگ حال کو آسانی دے گا تو اللہ اس کو دنیا اور آخرت میں آسانی دے گا۔

روی الإمام البخاری فی صحیحه عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ قال: من کان فی حاجة اخیه کان الله فی حاجته (وفی روایة) قال ﷺ: والله فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیه.

حضرت عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے گا، اللہ اس کی حاجت پوری کرے گا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ بندہ کی مدد کرتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد کرے۔

جو آدمی دوسروں کی مدد کرے اور ان کی مشکل میں ان کے کام آئے اس کو اس خدائی نظام کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے جو خدا نے فطرت کی سطح پر قائم کر رکھا ہے۔ اس حمایت کی بنا پر وہ آدمی کامیاب ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس نظام فطرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ جو شخص لوگوں کے کام آئے وہ لوگوں کی نظر میں ان کا محبوب ہو جائے۔ لوگوں کے دل اس کے لئے جھک جائیں۔ اس کو ہر ایک کی طرف سے عزت اور احترام حاصل ہو۔ اور جس شخص کو اپنے ماحول میں اس قسم کا باعزت مقام حاصل ہو جائے اس کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں رہ سکتا۔

دوسروں کی مدد کرنا دوسروں کے لئے نفع بخش بننا ہے۔ اور نفع بخشی اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ لوگوں کے لئے نافع بننے والا لوگوں کے درمیان سردار کا درجہ پالیتا ہے۔ کسی مطالبہ کے بغیر لوگ اضافہ کے ساتھ اس کے حقوق ادا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ دینے والا ہوتا ہے اور لوگ لینے والے۔ اور یہ فطرت کا قانون ہے کہ دینے والا لینے والوں کے اوپر سرداری کا مقام حاصل کرلے۔

فطرت کا اٹل قانون یہ ہے کہ آدمی دے کر پائے۔ وہ دوسروں کو راحت پہنچا کر خود اپنے لئے راحت حاصل کرے۔ اس قانون میں کوئی استثنا نہیں۔

امانت ادا کرو

عن ابی هریرة، عن النبی صلی الله علیه وسلم قال:
"اَدِّ الاَمَانَةَ الیٰ مَنِ ائتمنك ولا تَخُن مَن خَانَكَ"
(رواه الترمذی وابو داؤد والدارمی).

حضرت ابو ہریرۃ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص تمہارے پاس امانت رکھے اس کی امانت ادا کرو۔ اور جو شخص تمہارے ساتھ خیانت کرے اس کے ساتھ تم خیانت نہ کرو۔

امانت ادا کرنا بلاشبہ ایک اہم ترین اسلامی حکم ہے (المؤمنون ۸) اگر کسی شخص کے پاس کسی دوسرے کی کوئی امانت ہو تو اس کو اس وقت تک بے چین رہنا چاہئے جب تک وہ اس کو ادا نہ کرلے۔ امانت کا تعلق کسی مخصوص چیز سے نہیں، اس کا تعلق تمام چیزوں سے ہے۔ ابو حیان اندلسی نے اپنی تفسیر البحر المحیط (سورہ المومنون) میں لکھا ہے کہ امانت کے حکم میں قول اور فعل اور عقیدہ سے تعلق رکھنے والی تمام چیزیں داخل ہیں۔

اگر آپ کے پاس ایک ایسی بات ہے جو کسی کے حق میں مفید ہو سکتی ہے تو وہ گویا دوسرے شخص کی امانت ہے جو آپ کے پاس محفوظ ہے، اس بات کو اس شخص تک پہنچانا آپ کا فرض ہے۔ اگر آپ کا ایک قول کسی کو بے عزت ہونے سے بچاسکتا ہے تو وہ قول دوسرے آدمی کی امانت ہے۔ آپ پر لازم ہے کہ آپ اس قول کا اعلان کریں تاکہ آپ کے بھائی کی عزت اور مال محفوظ ہو سکے۔

ولا تخن من خانك کی نصیحت بے حد اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک آدمی کے اندر یہ مزاج نہ ہو کہ وہ دوسرے آدمی کی روش سے قطع نظر کر کے اس کی امانت ادا کرے گا، اس وقت تک وہ امانت کی ادائیگی کے امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

موجودہ دنیا میں اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے شکایت ہو جاتی ہے۔ یہ شکایت صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی۔ اگر آدمی شکایتوں سے اثر لے تو وہ کبھی بہتر اخلاق پر عمل نہیں کر سکتا۔ اس دنیا میں خیانت کے باوجود امانت کا طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ دوسروں سے برے سلوک کا تجربہ ہونے کے باوجود ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص "باوجود" کے اس اصول کو نہ مانے وہ اس دنیا میں کبھی صحیح اسلامی روش پر قائم نہیں رہ سکتا۔

دو انسان

پانی پانی ہے۔ لیکن گرم ہونے کے بعد وہ آگ بن جاتا ہے۔ ابتدائی حالت میں وہ ایک ٹھنڈا سیال ہے۔ اور انتہائی حالت میں کھولتا ہوا لاوا۔ یہ پانی کے لئے قدرت کا قانون ہے۔

یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان اپنی ابتدائی حالت میں ایک بے ضرر انسان ہوتا ہے۔ لیکن اگر انسان کی انا کو چھیڑ دیا جائے تو وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ضرر رساں بن جائے گا۔ انسان اپنی معتدل حالت میں ہو تو وہ فطرت کا ایک دل کش پھول ہے۔ مگر انسان کے اندر جب غصہ کی آگ بھڑک اٹھے تو اس وقت وہ ایک اور انسان ہوتا ہے۔ اس وقت وہ تمام حیوانوں سے زیادہ خونخوار حیوان بن جاتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی ایک صفت یہ ہے کہ اس کے اندر نفس لوامہ رکھدیا گیا ہے۔ نفس لوامہ سے مراد ضمیر ہے۔ ابتدائی طور پر آدمی اپنے نفس لوامہ پر ہوتا ہے۔ اس وقت آدمی کی فطرت اس کی رہنما ہوتی ہے۔ وہ عین اپنی اندرونی آواز کے تحت شرافت اور انسانیت پر قائم رہتا ہے۔

انسان کی دوسری صفت وہ ہے جس کو قرآن میں نفس امارہ کہا گیا ہے۔ اس سے مراد انانیت ہے۔ آدمی کا نفس امارہ یا اس کی انا عام حالت میں سوئی ہوئی رہتی ہے۔ اس سے کسی کو خطرہ نہیں ہوتا۔ مگر جب نفس امارہ پر زد پڑے تو وہ جاگ اٹھتا ہے۔ اس وقت وہ انتقامی جذبات میں اندھا ہو جاتا ہے۔ اب وہ انتہائی حد تک نقصان رساں بن جاتا ہے۔

انسان کی یہ دونوں صفتیں خود خالق نے پیدا کی ہیں۔ اس لئے ان کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ ہمارے لئے صرف یہ ممکن ہے کہ اعراض کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے نقصان سے بچائیں۔

ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہم مقابل کے انسان کی نفس لوامہ کو جگائیں اور اس کی نفس امارہ کو خوابیدہ حالت میں پڑا رہنے دیں۔

اسلام کے مطابق، کامیابی اور ناکامی دونوں آدمی کے اپنے اختیار میں ہے۔ آدمی دوسرے فریق کے اندر جس قسم کی نفسیات جگائے گا وہی اس کے حصہ میں آئے گی۔

سمجھ داری

الدیلمی نے حضرت انس کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **المؤمن کیّس فطِن** (مومن دانا اور سمجھ دار ہوتا ہے)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ: **اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور الله** (مومن کی ہوشیاری سے بچو، کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے)۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہوشیاری اور سمجھ داری کوئی نسلی یا گروہی صفت ہے جو ان تمام لوگوں میں پائی جاتی ہے جو اپنے آپ کو مومن کہیں۔ یہ دراصل کسی گروہ کی خصوصیت نہیں بلکہ ایمان کی خصوصیت ہے۔ جس آدمی کے اندر حقیقی ایمان پیدا ہو جائے، اس کے اندر وہی صفت آجائے گی جس کا اوپر ذکر ہوا۔

سمجھ داری کیا ہے؟ سمجھ داری کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ آدمی کے اندر وہ صفت پائی جائے جو ایک دعاء کے اندر ان الفاظ میں ملتی ہے: **وارِنا الاشیاء کما هي** (اے اللہ، مجھے چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں)۔

اس کا مطلب چیزوں کو ان کی اصل صورت میں (as it is) دیکھنا ہے۔ ایمان آدمی کے اندر یہی صفت پیدا کرتا ہے۔ اور جو آدمی چیزوں کو ان کی اصل حالت میں دیکھنے لگے، اس کی رائے اور اس کے فیصلے ہمیشہ درست ہوں گے۔

حقیقی ایمان آدمی کے اندر ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ذاتی رجحانات سے الگ ہو کر رائے قائم کرنے لگے۔ اور آدمی کے اندر یہ استعداد پیدا ہو جانے ہی کا دوسرا نام ہوشیاری ہے۔

ایک شخص جب کسی کو حسد اور نفرت کی نظر سے دیکھے تو اس کی خوبیاں اس کو دکھائی نہیں دیں گی۔ وہ اس کو سراپا برائی نظر آئے گا۔ اس کے برعکس ایک آدمی کسی کو محبت اور عقیدت کی نظر سے دیکھنے لگے تو اس کی برائیاں اس کی نظر سے اوجھل ہو جائیں گی۔ وہ اس کو سراپا اچھائی کی صورت میں دکھائی دے گا۔

اسی طرح غصہ، انتقام اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ جو رائے قائم کی جائے وہ کبھی معتدل رائے نہیں ہوتی۔ کسی خاص کیفیت کا آدمی کے اوپر غلبہ ہو جائے تو وہ اس کے بارہ میں درست رائے قائم کرنے سے قاصر رہے گا۔

تقوی، اخلاق

آدمی دو ذمہ داریوں کے درمیان ہے، خدا اور انسان۔ خدا کے مقابلہ میں آدمی سے تقوی مطلوب ہے، اور انسان کے مقابلہ میں اخلاق۔ مگر یہ دونوں ہی چیزیں کسی کو عزیمت کی سطح پر حاصل ہوتی ہیں۔ رخصت کی سطح پر ان میں سے کوئی چیز کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔

خدا کے مقابلہ میں آدمی کو صاحب تقوی بننا ہے۔ یعنی ڈر کی حد تک خدا کی عظمتوں کو محسوس کرنے والا۔ اس قسم کا احساس کسی شخص کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ کبھی قانونی حد پر نہیں رک سکتا۔ وہ لازماً قانون کی حد سے آگے تک پہنچ جائے گا۔ وہ صرف عامل نہیں بنے گا بلکہ محتاط بن جائے گا۔ وہ کسی محدود معنے میں متقی نہیں بنے گا بلکہ وہ کلی معنی میں متقی بننے کی کوشش کرے گا۔ تقوی کسی حد بندی کو نہیں جانتا۔ یہی بات ہے جو حدیث میں ان لفظوں میں بتائی گئی ہے:

عن عطية السعدی قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يبلغ العبد ان يكون من المتقين حتى يدع مالا بأس به حذرا مما به بأس (الترمذی وابن ماجة) تفسير ابن كثير، ۱، ٤٠.

عطیہ سعدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بندہ متقیوں کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ ایسی چیزوں کو بھی چھوڑ دے جس میں حرج نہیں ہے اس اندیشہ سے کہ شاید اس میں حرج ہو۔

انسان کے مقابلہ میں آدمی سے یہ مطلوب ہے کہ وہ صاحب اخلاق بنے۔ جس آدمی کے اندر اخلاقی احساس پیدا ہو جائے وہ کبھی برابر کی سطح پر نہیں رکے گا۔ یعنی وہ ایسا نہیں کرے گا کہ دوسرے لوگ خوش اخلاقی برتیں تو وہ بھی ان کے ساتھ خوش اخلاق بن جائے۔ اور دوسرے لوگ بد اخلاقی برتیں تو وہ ان کے ساتھ برا سلوک کرنے لگے۔ سچا صاحب اخلاق یک طرفہ اخلاقیات پر قائم ہوتا ہے۔ حدیث میں یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صل من قطعك واعف عمن ظلمك واحسن الى من اساءَ اليك.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص تم سے کٹے تم اس سے جڑو۔ جو شخص تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کر دو۔ اور جو شخص تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

انفرادی حکم، اجتماعی حکم

ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص تم کو امین بنائے تم اس کی امانت ادا کرو، اور جو آدمی تمہارے ساتھ خیانت کرے تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو (اَدِّ الامانَةَ الی من ائتمنك ولا تخن من خانك) مشکاۃ المصابیح ۸۸۵/۲۔

دوسری روایت میں عمر بن عنبسہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس کے درمیان اور کسی قوم کے درمیان معاہدہ ہو تو وہ نہ اس کی کوئی گرہ کھولے اور نہ اس کو باندھے، یہاں تک کہ اس کی مدت پوری ہو جائے، یا پھر اس کی طرف معاہدہ کو برابری کے ساتھ پھینک دے (مَن كَان بينَه وبينَ قومٍ عهدٌ فلا يُحِلَّنَّ عهداً ولا يشُدَّنَّه حتى يمضيَ امَده او ينبذَ اليهم علىٰ سواءٍ) مشکاۃ المصابیح ۱۱۶۵/۲۔

ان دونوں حدیثوں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے۔ البتہ پہلی حدیث کا تعلق فرد کے معاملات سے ہے، اور دوسری حدیث کا تعلق قوم کے معاملات سے۔ ایک میں انفرادی نوعیت کا حکم ہے اور دوسری میں اجتماعی نوعیت کا حکم۔

شریعت میں کچھ احکام انفرادی احکام کہے جاتے ہیں اور کچھ احکام اجتماعی احکام۔ یہ دونوں احکام اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے ایک ہوتے ہیں۔ البتہ ان میں دائرہ عمل کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے۔ مثلاً مذکورہ دونوں حکموں کی اسپرٹ ایک ہے۔ یعنی خیانت کرنے والے کے ساتھ خیانت نہ کرنا۔ فرد کا دائرہ اختیار اپنے شخصی معاملات تک محدود ہے، اس لئے وہ اپنے شخصی دائرہ میں اس اسپرٹ کی تعمیل کرے گا۔ قوم کا دائرہ اختیار اجتماعی اور بین اقوامی معاملات تک ہے، اس لئے قوم (یا قوم کے ذمہ دار) اس اسپرٹ کی تعمیل وسیع تر دائرہ میں کریں گے۔

مومن وہ ہے جس کا کردار، اس حد تک بااصول ہو کہ اس کے بارے میں تجربے سے پہلے پیشن گوئی کی جاسکے۔ یہ قابل پیشن گوئی کردار ہی اہل ایمان کی اصل اور حقیقی شناخت ہے۔

دوسروں سے فائدے اٹھانا

قرآن: وامرهم شوری بینهم(الشوری ۳۸)۔

اور اہل ایمان اپنا کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں۔

حدیث: المشورة حصن من الندامة وامان من الملامة

مشورہ شرمندگی سے محفوظ رکھنے کا قلعہ ہے اور ملامت کے مقابلہ میں امان ہے۔

عمر فاروق: رأی الفرد کالخیط السهیل

اکیلے آدمی کی رائے کچے دھاگے کی مانند ہے۔

عبدالحمید: المشاورة فی رأیه ناظر من ورائه

اپنے معاملہ میں مشورہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اپنے پیچھے کی طرف دیکھنے والا۔

لقمان حکیم: شاوِر مَن جرّب الامور فانه یعطیك من رایه ماقام علیه بالغلاء وانت تأخذه مجاناً۔

تجربہ کار سے مشورہ لو کیوں کہ وہ تجھ کو مفت وہ چیز دیتا ہے جو اس کو مہنگی قیمت پر ملی ہے۔

مقولہ: نصفُ رأیك مع اخیك فشاوِره لِیَکمُلَ لك رأیك

تمہاری رائے کا آدھا تمہارے بھائی کے پاس ہے۔ تم اس سے مشورہ کرو تاکہ تمہاری رائے مکمل ہو جائے

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب سے بہت زیادہ مشورہ کیا کرتے تھے (ما رأیت احداً اکثر مشورةً لاصحابه من النبی ﷺ) اللہ پر ایمان اور اللہ کی معرفت کے بعد ایک آدمی کے اندر جو مزاج بنتا ہے، اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے معاملات میں بہت زیادہ مشورہ کرنے لگتا ہے۔

مشورہ عقل کا تقاضا ہے۔ کسی ایک آدمی کی سمجھ کبھی سارے پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ ہر آدمی کی سمجھ محدود سمجھ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عقلمند آدمی مشورہ کو پسند کرتا ہے۔ تاکہ دوسروں کی رائے معلوم کر کے اپنی رائے کی کمی کی تلافی کر سکے۔

بہتر انسان

حدیث میں آیا ہے پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لئے سب سے بہتر ہوں (**خیر کم خیر کم لاھلہ وانا خیر کم لاھلی**) الترمذی، کتاب المناقب۔

انسان کا سب سے پہلا عملی امتحان خود اپنے گھر کے اندر ہوتا ہے۔ ہر صبح اور ہر شام گھر کے اندر ایسے معاملات پیش آتے ہیں جن میں وہ کوئی رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس طرح ہر روز گھر کے اندر یہ جانچ ہوتی رہتی ہے کہ آدمی اپنے بول میں کیسا ہے اور اپنے عمل میں کیسا۔ آدمی اگر اچھا ہے تو وہ گھر کے معاملات میں اچھا ثابت ہوگا۔ اور اگر وہ برا ہے تو اس کی برائی بھی گھر کے اندر چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔

کوئی آدمی باہر کی زندگی میں مصنوعی طور پر اچھی اچھی باتیں کر سکتا ہے، وہ اچھا نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے کو اچھا بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ لیکن گھر کے اندر کوئی آدمی اپنی شخصیت کو چھپا نہیں سکتا۔ گھر ایک بہترین آئینہ ہے جس میں ہر آدمی کی حقیقی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس طرح گھر ہر آدمی کے لئے ایک تربیت گاہ بن گیا ہے اگر کوئی آدمی اپنے گھر کے اندر اچھا انسان بننے میں کامیاب ہو جائے تو باہر آکر بھی وہ اچھا انسان ثابت ہوگا۔

گھر کسی سماج کی ابتدائی یونٹ ہے۔ بہت سے گھروں کے ملنے سے ایک سماج بنتا ہے۔ اس طرح گھر کی اصلاح پورے سماج کی اصلاح ہے اور گھر کا بگاڑ پورے سماج کا بگاڑ۔

گھر کے اندر وہ تمام معاملات چھوٹے پیمانے پر پیش آتے ہیں جو گھر کے باہر بڑے پیمانے پر پیش آتے ہیں۔ ہر گھر نہ صرف سماج کا ایک حصہ ہے بلکہ وہ سماجی زندگی کا ایک چھوٹا نمونہ بھی ہے۔ آدمی کو سماج میں اس طرح رہنا ہے کہ وہ ہر ایک کی عزت کرے۔ وہ ہر ایک کا خیر خواہ ہو۔ وہ لوگوں سے نرم انداز میں خطاب کرے۔ وہ لوگوں کے لئے رکاوٹ بنے بغیر اپنا کام کرے۔ اس کی نظر اپنے حقوق پر کم ہو اور اپنے فرائض پر زیادہ۔ وہ خدمت لینے کے بجائے خدمت کرنے کا مزاج رکھتا ہو۔

اخلاقیات

اصلاحی اور اخلاقی تعلیمات

اسلامی اخلاق

شوہر اور بیوی کے درمیان اگر اختلاف ہوجائے تو اس وقت دونوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا حکم بتاتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ —— طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو قاعدہ کے مطابق رکھ لینا ہے۔ یا خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دینا (الطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ) البقرہ ۲۲۹۔ یہ آیت اپنے ابتدائی مفہوم کے لحاظ سے شوہر اور بیوی کے تعلق کے بارے میں آئی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کا ایک وسیع تر انطباق بھی ہے۔ یہ آیت دراصل اسلام کی ایک اخلاقی اسپرٹ کو بتاتی ہے۔ اس اسپرٹ کا تعلق تمام انسانی تعلقات سے ہے۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی معاملاتی تعلق قائم ہوتا ہے۔ مثلاً مل کر سفر کرنا، مل کر ادارہ چلانا، مل کر تجارت کرنا، وغیرہ۔ اس طرح کے ہر ملاپ میں دو یا زیادہ انسان کبھی محدود مدت کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور کبھی لمبی مدت کے لیے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں مستقل تعلق کے نام پر دو شخصوں کے درمیان ملاپ قائم ہوتا ہے۔ مگر بعد کو ایسی صورتیں پیش آتی ہیں کہ ان کا باہمی تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔

ایسے تمام معاملات میں اتحاد کے متعلق طرفین کو جس اسلامی اصول کی پابندی کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ یا تو خوش اسلوبی کے ساتھ تعلق کو باقی رکھیں، یا خوش اسلوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

دو انسان جب کسی مقصد کے لیے باہم متحد ہوں تو شریعت انھیں یہ حکم نہیں دیتی کہ وہ ہر حال میں اپنے اتحاد کو باقی رکھیں۔ لیکن معاملے کے دونوں فریقوں کے لیے شریعت کا یہ لازمی حکم ہے کہ وہ اتحاد اور اختلاف دونوں حالتوں میں اخلاقی معیار کو ترک نہ کریں۔ دونوں میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ تعلق ٹوٹنے کے بعد ایک فریق دوسرے کو بدنام کرنے لگے یا اس کی جڑ اکھاڑنے کے لیے سرگرم ہو جائے۔

لوگوں کی مدد کرنا

قرآن میں ایمان لانے والے کی صفات یہ بیان کی گئی ہیں کہ وہ خدا کی محبت میں اپنا مال دے، رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں (وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ) البقرہ ١٧٧

یہ آیت بتاتی ہے کہ کسی آدمی کے اندر جب مومنانہ شخصیت پیدا ہوتی ہے تو خاندان اور سماج کے دائرہ میں اس کا اظہار کن کن صورتوں میں ہوتا ہے۔

فرمایا کہ وہ اپنے ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کرنے لگتا ہے۔ رشتہ داروں سے چوں کہ ہر وقت تعلق ہوتا ہے اس لیے اکثر ان سے طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ کہ رشتہ داروں سے بظاہر یہ امید نہیں ہوتی کہ وہ شکرگزاری یا نیازمندی کی صورت میں کوئی بدلہ دیں گے۔ اس لیے اسلام میں بہت زیادہ ابھارا گیا ہے کہ آدمی اپنے ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کرے۔

اسی طرح یتیموں اور محتاجوں کی مدد کرنا مومن کے لیے بہت محبوب ہو جاتا ہے۔ اس کا دردمند دل اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ وہ کمزوروں کو دیکھ کر انھیں حقیر نہ سمجھے بلکہ ان کی مدد کے لیے دوڑ پڑے۔

یہی معاملہ مسافر کا ہے۔ مسافر اپنے وطن میں جیسا بھی ہو مگر جب وہ اپنے گھر سے دور سفر میں ہوتا ہے تو وہ بھی مختلف پہلوؤں سے ضرورت مند بن جاتا ہے۔ یہاں مومن کا ایمانی احساس متحرک ہو جاتا ہے۔ وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک مسافر کی ضرورت پوری کرکے اسے فارغ نہ کر دے۔ اسی طرح جو لوگ کسی وجہ سے مسائل کے درمیان گھر جائیں جو کسی سماجی روایت کی بندش میں پھنس کر رہ گئے ہوں۔ ان کے پاس خود اتنا مال نہ ہو کہ وہ اس کو دے کر وہاں سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ ایسے لوگوں کو مال دے کر انھیں حالات کی گرفت سے آزاد کرانا بھی مومن کی انسانی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے۔

بھلائیوں میں سبقت

قرآن (البقرہ ۱۴۸) میں ہے کہ —— ہر ایک کے لیے ایک رخ ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف دوڑو (وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ)

یہ آیت قبلہ کے مسئلہ کے ذیل میں آئی ہے۔ مگر، قرآنی اسلوب کے مطابق، اس میں ایک بنیادی بات بتادی گئی ہے جس کا تعلق پوری انسانی زندگی سے ہے۔ فاستبقوا الخیرات کا لفظ سیاق کے اعتبار سے خصوصی مفہوم رکھتے ہوئے وسیع تر پہلو کے اعتبار سے ایک عمومی حکم ہے جو ہر انسان کو ہر لمحہ ایک بنیادی ہدایت دے رہا ہے۔

زندگی مسابقت کے اصول پر مبنی ہے۔ انسان کے اندر فطری طور پر یہ جذبہ موجود ہے کہ وہ آگے بڑھے اور ترقی کرے۔ اسی فطری جذبہ کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی اپنی دوڑ لگا رہا ہے، ہر آدمی دوسروں سے آگے بڑھنے کے لیے اپنی پوری طاقت خرچ کر رہا ہے۔

مسابقت کا یہ جذبہ عام طور پر خواہش کے رخ پر چل پڑتا ہے۔ ہر انسان کے اندر جس طرح مسابقت کا جذبہ رکھا گیا ہے اسی طرح ہر ایک کے اندر مادی خواہشیں بھی پوری طاقت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مادی خواہش کا زور آدمی کے جذبۂ مسابقت کو ایک رخ پر دوڑا دیتا ہے۔ دنیا میں بیشتر لوگ زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے کے لیے سرگرم ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی اندرونی خواہش نے ان کے مسابقت کے جذبہ کو مال کے رخ پر موڑ دیا۔

مگر قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی مسابقت کے جذبہ کو خیر کے رخ پر سرگرم کرے۔ وہ اپنی مادی خواہشوں کو اپنی دوڑ کا نشانہ بنانے کے بجائے اس چیز کو نشانہ بنائے جس کو خدا نے خیر قرار دیا ہے۔ خیر سے مراد علم بھی ہے، جو آدمی کی ذہنی اور فکری ترقی کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح اس سے دعوتِ حق بھی مراد ہو سکتی ہے جو کام کا اتنا وسیع میدان ہے جس کی حدیں کہیں ختم نہیں ہوتیں۔ اسی طرح بھلائیوں میں مسابقت کا ایک میدان وہ بھی ہے جس کو خدمتِ خلق کہا جاتا ہے۔

صلح بہتر ہے

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ نزاع کی صورت میں دونوں فریق آپس میں صلح کر لیا کریں۔ اور صلح بہتر ہے، اور حرص انسانوں کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے (النساء، ۱۲۸) یہ اصول انسانی زندگی کے تمام معاملات کے لیے ہے، خواہ اس کا تعلق گھر کے معاملہ سے ہو یا باہر کے معاملہ سے۔ خواہ وہ دو آدمیوں کا مسئلہ ہو یا پوری جماعت کا مسئلہ۔ خواہ وہ قومی ہو یا بین اقوامی۔ اجتماعی زندگی کے تمام نزاعی معاملات کا یہی واحد حل ہے۔

صلح کی قابل عمل صورت صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ معاملہ کے دونوں فریق اسٹیٹس کو (حالت موجودہ) پر راضی ہو جائیں۔ اس میں واحد رکاوٹ حرص ہے۔ معاملہ کا ایک یا دوسرا فریق حرص میں پڑ کر اسٹیٹس کو کو توڑنا چاہتا ہے، بر وقت ملے ہوئے پر راضی نہ ہو کر وہ مزید کو حاصل کرنا چاہتا ہے جس کے لیے فطری طور پر دوسرا فریق آمادہ نہیں ہوتا، بس یہی مزاج صلح میں رکاوٹ بن جاتا ہے اور پھر دونوں فریق انتہائی بے فائدہ طور پر لڑائی کو جاری رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے ملے ہوئے کو بھی کھو دیتے ہیں۔

صلح کو اکثر لوگ نزاعی معاملہ کی سطح پر جانچتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ایک ثانوی درجہ کی چیز ہے۔ زیادہ اہم اور زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ صلح آدمی کے لیے نئے عمل کا دروازہ کھولتی ہے۔ صلح کے بعد آدمی کو اپنا سفر جاری رکھنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ نزاع کی حالت سفر حیات کو روکتی ہے، اور صلح کا معاملہ زندگی کے رکے ہوئے سفر کو از سر نو جاری کر دیتا ہے۔

صلح کوئی پسپائی نہیں۔ صلح دراصل پریکٹیکل وزڈم (عملی حکمت) کا دوسرا نام ہے۔ صلح حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے۔ صلح کا مطلب جذباتی مواقع پر غیر جذباتی فیصلہ لینا ہے۔ صلح یہ ہے کہ نزاعی معاملات میں آدمی اَنانیت کا شکار نہ ہو۔ وہ کسی چیز کو اپنے لیے پرسٹیج اشو (ساکھ کا مسئلہ) نہ بنائے۔ وہ ہمیشہ تدبّر اور انضباط کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ جذباتیت اور اشتعال کا۔

ٹکراؤ عمل کا دروازہ بند کرنے والا ہے اور صلح عمل کا دروازہ کھولنے والا۔

اعتراف

کوئی آدمی جب ایک شخص کے فضل وکمال کا اعتراف نہ کرے تو اس کی وجہ ہمیشہ اس کا یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کسی اور کا اعتراف کرنے سے اس کا اپنا قد چھوٹا ہو جائے گا۔ مگر وہ بھول جاتا ہے کہ ایسا کر کے وہ اپنے آپ کو زیادہ بڑے اندیشہ میں مبتلا کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کے سامنے اس کا قد ہمیشہ کے لیے چھوٹا ہو جائے۔

ایک شخص کو اگر کوئی فضل وکمال حاصل ہے تو وہ اس کی اپنی ایجاد نہیں ہے۔ وہ براہ راست خدا کا عطیہ ہے۔ اس لیے اس کا اعتراف کرنا خدا کا اعتراف کرنا ہے، اور اس کا اعتراف نہ کرنا خدا کا اعتراف نہ کرنا۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ عدم اعتراف کی روش اختیار کرتے ہوئے وہ خدا سے ڈرے۔ وہ اس کو انسان کا معاملہ نہ سمجھتے ہوئے وہ اس کو خدا کا معاملہ سمجھے۔

اس معاملہ کا ایک اور پہلو ہے جو بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ دوسرے کا اعتراف کرنا سادہ طور پر صرف دوسرے کا اعتراف کرنا نہیں ہے۔ وہ خود اپنی شخصیت کے ارتقاء کا معاملہ ہے۔ آدمی دوسرے شخص کے فضل کا اعتراف کر کے اپنی انسانیت کو بڑھاتا ہے اور دوسرے شخص کا اعتراف نہ کر کے اپنی شخصیت کو انسانی اعتبار سے مجروح کر لیتا ہے۔

اعتراف اور بے اعترافی کا معاملہ مزید آگے بڑھ کر پورے سماج سے جڑا ہوا ہے۔ جب ایک آدمی دوسرے شخص کا اعتراف کرے تو وہ سماج میں اعلیٰ انسانی قدروں کو فروغ دیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ دوسرے کی حیثیت کا اعتراف نہ کرے تو سماج میں ناقدری اور بے اعترافی کی روایات فروغ پائیں گی۔

اعتراف اور بے اعترافی کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ اعتراف کرنے والا پورے سماج میں قدر دانی کی اعلیٰ روایت قائم کرتا ہے۔ اس کے برعکس اعتراف نہ کرنے والا پورے سماج کو ناقدری کے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔ بے اعترافی اگرچہ ایک شخص کرتا ہے مگر اس کا اثر پورے سماج پر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے اعترافی کے معاملے میں آدمی کو آخری حد تک محتاط رہنا چاہیے۔

بڑائی کا جذبہ

انسان کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے۔ اسی لیے قرآن میں شیطان کو طاغوت کہا گیا ہے۔ ابتدائے حیات میں خدا نے شیطان کو یہ حکم دیا کہ وہ آدم کا سجدہ کرے مگر اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اس کے بعد خدا اور شیطان میں جو مکالمہ ہوا اس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے : خدا نے کہا کہ تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔ ابلیس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تونے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ خدا نے کہا کہ تو اُتر یہاں سے۔ تجھے یہ حق نہیں کہ تو اس میں گھمنڈ کرے۔ پس نکل جا یقیناً تو ذلیل ہے۔ ابلیس نے کہا کہ اس دن تک کے لیے تو مجھے مہلت دے جبکہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ خدا نے کہا کہ تجھ کو مہلت دی گئی۔ ابلیس نے کہا کہ چوں کہ تونے مجھے گمراہ کیا ہے، میں بھی لوگوں کے لیے تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ پھر ان پر آؤں گا ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے۔ اور تو ان میں اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ خدا نے کہا کہ نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا (اعراف ۱۸-۱۲)

انسان کی اصل کمزوری کیا ہے جس کی وجہ سے اس کے اندر اخلاقی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہر آدمی صرف اپنے آپ کو بڑا دیکھنا چاہتا ہے۔ اب چوں کہ انسانوں میں فرق ہے۔ یہاں خود فطرت کے قانون کے مطابق کوئی چھوٹا ہوتا ہے کوئی بڑا اس لیے آدمی جس کو اپنے سے بڑا دیکھتا ہے، اس کے خلاف وہ جلن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ جلن آدمی کو منفی نفسیات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ اس کے پورے کردار کو منفی کردار بنا دیتی ہے۔

اپنے کو بڑا دیکھنے کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ آدمی کو برابر عمل پر ابھارتا رہے۔ یہ اس جذبہ کا غلط استعمال ہے کہ آدمی حسد اور جلن کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے۔ اور پھر ہر قسم کی اخلاقی برائیوں کو اپنے لیے جائز کرلے۔ سچا انسان وہ ہے جس کا حال یہ ہو کہ جب وہ کسی کو اپنے سے بڑا دیکھے تو یہ واقعہ اس کے لیے عمل کا جذبہ بیدار کرنے کا سبب بن جائے۔

شاکلہ کا مسئلہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ — اور ہم جب انسان کے اوپر انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اور پیٹھ موڑ لیتا ہے۔ اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ نا امید ہو جاتا ہے۔ کہو کہ ہر ایک اپنے شاکلہ پر عمل کر رہا ہے، پس تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ہدایت والے راستہ پر ہے (بنی اسرائیل ۸۳-۸۴)

انسان کی سوچ، متاثر سوچ (کنڈیشنڈ تھنکنگ) ہوتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی دولت اور خوش حالی کے ماحول میں ہو تو اس کے اندر بے جا خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے سے باہر کسی شخص کو اہمیت نہیں دیتا۔ اور نہ کسی اور کی بات پر زیادہ دھیان دے پاتا۔ اس کے برعکس جو آدمی مصیبت اور بدحالی کا شکار ہو تو وہ حوصلہ کھو دیتا ہے۔ وہ ہر ایک کے بارے میں بے اعتمادی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دونوں ہی کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتے اور نہ اپنے عمل کی بے لاگ منصوبہ بندی میں کامیاب ہوتے۔ یہی مثال تمام معاملات کے لیے ہے۔

مثلاً حدیبیہ کے وقت اہل مکہ نے سارے معاملہ کو حال کے اعتبار سے دیکھا اور اہل ایمان نے مستقبل کے اعتبار سے۔ اہل مکہ قریبی احوال میں گم تھے۔ اور اہلِ ایمان قریبی احوال سے اوپر اٹھ کر معاملہ کو دور اندیشی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ حال کے اعتبار سے دیکھنے کی وجہ سے اہل مکہ کو نظر آیا کہ چودہ سو مسلمان اگر مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کریں تو لوگوں کی نظر میں ان کا وقار ختم ہو جائے گا، اس لیے وہ ان کے مخالف بن گئے۔ اس کے برعکس اہل ایمان نے دیکھا کہ اگر امن کا معاہدہ کرکے وہ لوٹ جائیں تو اس کے نتیجہ میں دعوت کے غیر معمولی مواقع کھل جائیں گے اور حال کی ظاہری شکست مستقبل کی عظیم فتح میں بدل جائے گی۔

دنیا میں آدمی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ اپنے محدود دائرہ سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ وہ ذاتی تعصبات کے بجائے عمومی حقائق کی روشنی میں اپنی رائے بنائے۔ وہ شاکلۂ انسانی میں گھر کر نہ رہ جائے بلکہ شاکلۂ ربانی کی سطح تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

دُہراپن نہیں

خدا نے کسی انسان کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے (الاحزاب ۴) اس کا مطلب ہے کہ خدا کو یہ پسند نہیں کہ آدمی کسی معاملہ میں دہرا انداز اختیار کرے۔ ڈبل اسٹینڈرڈ انسان پر خدا اپنی رحمت نہیں کرتا۔

سچا انسان وہ ہے جس کا حال یہ ہو کہ وہ جو کہے وہی کرے، اور جو اس کو کرنا ہے وہی بولے۔ بولنے کے وقت کچھ کہنا اور کرنے کے وقت کچھ اور کرنا، یہ خدا پرست انسان کا طریقہ نہیں۔

ڈبل اسٹینڈرڈ انسان ہی کا دوسرا نام منافق ہے۔ ایسا انسان اپنی حقیقی شخصیت کو چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ایسی بات بولتا ہے جس کے بارہ میں وہ سنجیدہ نہیں ہوتا۔ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اسٹیج پر ایسی تقریریں کرتا ہے جس کو وہ گھر آتے ہی بھول جاتا ہے۔ ایسا انسان ایک ایکٹر ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں ایک خدا پرست انسان۔

منافق اور مخلص انسان میں یہ فرق ہے کہ منافق انسان کا اندر اور باہر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اور مخلص انسان اندر اور باہر دونوں اعتبار سے ایک ہوتا ہے۔ منافق انسان کا مقصد لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اور مخلص انسان کا مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا۔

منافق انسان کے اندر فکری اور عملی تضاد پایا جاتا ہے کیوں کہ وہ حالات کو دیکھ کر اپنے فکر و عمل کو بدلتا رہتا ہے۔ مگر مخلص انسان کے یہاں تضاد نہیں ہوتا۔ کیوں کہ مخلص انسان کی سوچ اور اس کا کردار اٹل خدائی اصولوں کے ماتحت ہوتا ہے اور خدائی اصولوں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس دنیا میں مخلص انسان ہی خدا کا مطلوب انسان ہے۔ یہی وہ انسان ہے جو خدا کی ابدی رحمتوں کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

خواہش پرستی نہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۳۸ میں حضرت داؤدؑ سے خطاب کرتے ہوئے ایک اصولی بات فرمائی گئی ہے۔ فرمایا کہ تم خواہش کی پیروی نہ کرو، وہ تم کو خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی (ص ۲۶)

خدا نے انسان کے لیے ایک درست راستہ مقرر کیا اور پھر ہر انسان کی فطرت میں اسی کی تمیز رکھ دی۔ انسان اگر اپنی فطرت کی اس خاموش رہنمائی کو سمجھے اور اس کی پیروی کرے تو وہ کبھی بے راہ نہ ہو، وہ زندگی کی شاہراہ پر سیدھا چلتا رہے یہاں تک کہ وہ آخری منزل پر پہنچ جائے۔

فطرت کی اس شاہراہ سے بھٹکانے والی چیز صرف ایک ہے اور وہ انسان کی خود اپنی خواہش ہے۔ یہ خواہش زندگی کے ہر موڑ پر انسان کو بہکاتی ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اپنے آپ کو خواہش کے اثر میں نہ آنے دے۔ جو آدمی اپنی خواہش سے مغلوب ہوگیا وہ لازماً فطرت کے سیدھے راستہ سے ہٹ جائے گا، اور جو آدمی فطرت کی راہ سے ہٹ جائے اس کے لیے تباہی کے سوا اور کوئی انجام نہیں۔

آدمی کی خواہش اس کو مختلف طریقوں سے بھٹکاتی ہے۔ کبھی اس کو ظاہری رونقوں کے فریب میں الجھا کر گہری حقیقتوں سے دور کر دیتی ہے، کبھی وقتی فائدہ کی خاطر اس کو اس راہ سے ہٹا دیتی ہے جو مستقل فائدہ کی طرف جانے والی ہے۔ کبھی کسی معاملہ کو غیرت وحمیت کا سوال بنا کر آدمی کو مشتعل کر دیتی ہے۔ وہ انجام سے بے پرواہ ہو کر لڑنا بھڑنا شروع کر دیتا ہے جس کا یک طرفہ نقصان سب سے زیادہ خود اسی کو بھگتنا پڑتا ہے۔

آدمی کی خواہش، آدمی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ جو شخص کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خواہش کو اپنے کنٹرول میں رکھے۔ نہ یہ کہ خود خواہش کے کنٹرول میں آجائے۔ خواہش پرستی کے مقابلہ میں دوسرا طریقہ اصول پسندی کا طریقہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ خواہشوں کا شکار نہ بنے بلکہ وہ اعلیٰ انسانی اصولوں کی پیروی کرے۔ اس کا ہر رویہ سوچے سمجھے اصول کے تحت متعین ہوتا ہو نہ کہ محض نفس اور خواہش کی پیروی کے تحت۔

صبر، عجلت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ـــــ پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا، اور ان کے لیے عجلت نہ کرو (الاحقاف ۳۵) اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہے صابرانہ عزیمت، اور دوسری چیز ہے بے صبری اور عجلت۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے، اس کو سمجھنے کے لیے قرآن کی ان آیتوں کا مطالعہ کیجئے جو نبوت کے ابتدائی دور میں مکہ میں اتاری گئیں:

اے کپڑے میں لپٹنے والے، اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ اور اپنے کپڑے کو پاک رکھ۔ اور گندگی کو چھوڑ دے۔ اور ایسا نہ ہو کہ احسان کرو اور زیادہ بدلہ چاہو۔ اور اپنے رب کے لیے صبر کرو (مدثر ۱-۷)

سورہ مدثر کی ان آیات کی روشنی میں مذکورہ فرق کو متعین کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ موجودہ حالات میں صرف انہی چند احکام پر عمل کرو، اور بقیہ تمام معاملات کو صبر کے خانہ میں ڈال دو۔

یعنی انذار و تبشیر کے انداز میں لوگوں کو مسئلۂ آخرت سے آگاہ کرو۔ اللہ کی عظمت و کبریائی تمہارا موضوع کلام بن جائے۔ اچھے اخلاق اور اعلیٰ کردار میں اپنے آپ کو ڈھال لو۔ ہر قسم کی اعتقادی اور عملی برائیوں سے آخری حد تک دور ہو جاؤ۔ لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک کرو، مگر ان سے بدلہ پانے کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے۔

یہ گویا پانچ نکاتی پروگرام تھا جو اس وقت دیا گیا۔ اگرچہ اس وقت مکہ میں اس کے سوا بہت سے مسائل تھے۔ مثلاً کعبہ میں ۳۶۰ بتوں کا ہونا، سماج میں طرح طرح کے جرائم، مکہ کی پارلیمنٹ (دارالندوہ) پر مشرکین کا قبضہ، عرب میں رومی ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کا سیاسی نفوذ، وغیرہ۔ مگر ان سب پر صبر کا حکم دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ، اس وقت جن کاموں کے لیے نتیجہ خیز جدوجہد ممکن ہے، ان پر محنت کرو۔ اور جن کاموں میں بروقت نتیجہ خیز عمل ممکن نہیں ہے ان سب کو مستقبل کے حالات پر چھوڑ دو۔

ایک آیت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی صفت بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں (اشداء علی الکفار) الفتح ۲۹

کچھ لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اہل اسلام کا برتاؤ غیر مسلموں سے نرمی کا نہیں بلکہ سختی کا ہونا چاہیے۔ ان کو ہمیشہ غیر مسلموں سے کڑا سلوک کرنا چاہیے۔ یہ بات سراسر غلط ہے۔ رسول اللہ ؐ کے بارہ میں حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپ کا اخلاق قرآن تھا (کان خلقہ القرآن) اگر اس آیت کا مطلب یہ ہو تو آپ کو اپنے معاصر غیر مسلموں سے کڑا برتاؤ کرنا چاہیے تھا۔ حالاں کہ ایسا نہیں۔ حدیث اور سیرت کی کتابیں بتاتی ہیں کہ آپ نے ہمیشہ اپنے زمانہ کے غیر مسلموں سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ کیا۔ حتی کہ بہت سے واقعات ہیں جب کہ کسی غیر مسلم نے آپ کے ساتھ سختی کا معاملہ کیا۔ اس وقت بھی آپ اس کے لیے نرمی کا پیکر بنے رہے۔

شدید کے لفظی معنی سخت کے ہیں۔ ھو شدید علیّ کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فلاں شخص کو اپنے اثر میں لانا مجھ پر سخت دشوار ہے۔ گویا اس سے مراد کڑا یا کرخت ہونا نہیں ہے بلکہ غیر اثر پذیر ہونا ہے۔ الحماسہ میں ایک شاعر کہتا ہے کہ جوانی کی عمر میں آدمی اگر مردانگی سے عاجز رہ جائے تو ادھیڑ عمر میں اس کو حاصل کرنا اس پر سخت دشوار ہوگا:

إذا المرءُ أعيتهُ المروءةُ ناشئاً　　فمطلبُها كهلاً عليهِ شديدُ

مذکورہ قرآنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ وہ غیر مسلموں کا اثر قبول نہیں کرتے۔ وہ مکمل طور پر با اصول زندگی گزارتے ہیں۔ وہ غیر مسلم قوم یا غیر مسلم تہذیب کے درمیان رہ کر بھی ان کا اثر نہیں لیتے۔ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مومن کا برتاؤ نرم کے بجائے سخت ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے درمیان اثر پذیر بن کر رہنے کے بجائے غیر اثر پذیر بن کر رہتا ہے۔ غیر مسلموں کا اثر لینے کے معاملہ میں وہ پتھر کی طرح سخت ثابت ہوتا ہے۔ اس آیت کا تعلق اصلاً برتاؤ سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ہمیشہ با اصول انداز میں زندگی گزاری جائے۔

صبر کی اہمیت

پروگرام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کی حیثیت مثبت پروگرام کی ہو۔ اور دوسری وہ جو اتفاقی ضرورت کے تحت اختیار کی جائے۔ مثلاً صحت بخش غذا ہمارے جسم کی مستقل ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ کبھی جسم کو دوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر دوا کی حیثیت صرف وقتی مطلوب کی ہے۔ غذا ہمارے جسم کی مستقل ضرورت ہے اور دوا ہمارے جسم کی صرف اتفاقی ضرورت۔

یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین میں صبر کی حیثیت مثبت تعلیم کی ہے۔ صبر ہماری مستقل دینی ضرورت ہے۔ اس کے مقابلہ میں جنگ کی حیثیت صرف وقتی ضرورت کی ہے۔ صبر ایک عظیم نیکی ہے جو ہر وقت اور ہر حال میں مطلوب ہے۔ جب کہ جنگ صرف اس وقت مطلوب ہوتی ہے جبکہ انتہائی ناگزیر حالات میں بطور دفاع اس کی ضرورت پیش آگئی ہو۔

صبر وہ اہم ترین اصول ہے جو موجودہ امتحان کی دنیا میں ہر وقت اور ہر شخص کو درکار ہے۔ صبر کے بغیر کوئی شخص اس امتحان کے مرحلے کامیابی کے ساتھ گزر نہیں سکتا۔

اس دنیا میں آدمی کو اپنے نفس کے مقابلہ میں صبر کرنا ہے۔ شیطان کی ترغیبات کے مقابلہ میں صبر کرنا ہے۔ دوسرے انسانوں کی طرف سے پیش آنے والی ناخوشگواریوں پر صبر کرنا ہے۔

صبر کی ضرورت ہر لمحہ اور ہر موقع کے لیے ہے۔ نقصان کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے کو مایوسی سے بچائیں۔ فائدہ کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے اندر اٹھنے والے برتری کے احساس کو کچل کر ختم کر دیں۔ بیماری کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ آہ و فغاں نہ کریں۔ صحت کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے اندر فخر و ناز کے جذبات کو نہ اٹھنے دیں۔ اشتعال انگیزی کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے کو مشتعل ہونے سے بچائیں۔ اور جب کوئی شخص آپ کی تعریف کرے تو اس وقت صبر یہ ہوگا کہ آپ اس سے کبر کی غذا لینے کے بجائے سراپا تواضع بن جائیں۔

صبر کوئی انسانی قانون نہیں، وہ خود فطرت کا ایک قانون ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے ہر معاملہ سے ہے، خواہ وہ معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔

احترام انسانیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — تمام انسان خدا کی عیال ہیں۔ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ اچھا انسان وہ ہے جو اس کی عیال کے ساتھ اچھا سلوک کرے (رُوی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: الخلق کلهم عيال الله، واحبّ خلق الله تعالیٰ الیہ احسنهُم صنيعًا الى عيالہ) ادب الدنیا والدین للبصری ۲۰۰

انسانی سماج کی بہتر تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے احترام پایا جائے، لوگ ایک دوسرے کی عزت کریں، لوگ ایک دوسرے کے قدرداں بنے ہوئے ہوں۔

احترام کا یہ جذبہ لوگوں کے اندر کس طرح پیدا کیا جائے۔ اس کا سب سے زیادہ موثر اور کامیاب طریقہ یہ ہے کہ یہ حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرائی جائے کہ جس خالق نے مجھ کو پیدا کیا ہے اسی خالق نے دوسرے انسانوں کو بھی پیدا کیا ہے۔ تمام انسان گویا ایک خدا کا کنبہ ہیں۔ تمام انسان ایک خدا کے عیال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ شعور آدمی کے اندر یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے اور دوسرے میں فرق نہ کرے۔ وہ دوسرے کو بھی اتنا ہی قابل قدر سمجھے جتنا وہ خود اپنے آپ کو قابل قدر سمجھ رہا ہے۔ کسی انسان کی تحقیر کرتے ہوئے وہ محسوس کرے کہ میں نے خدائی کنبہ کے ایک فرد کی تحقیر کی۔ اسی طرح جب وہ کسی انسان کو عزت دے تو وہ اس سے یہ خوشی حاصل کرے کہ اس نے خدائی کنبہ کے ایک فرد کو عزت و احترام دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کے لیے اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں کہ وہ ایک ایسا عمل کرے جو اس کو یہ خوشی دے رہا ہو کہ میں نے خدائی کنبہ کے ایک شخص کو عزت دی ہے۔ خدائی کنبہ کے ایک شخص کے ساتھ احترام کا معاملہ کیا ہے۔ یہ نظریہ ایک طرف آدمی کو خدا کی نظر میں قابل انعام بناتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک عظیم فائدہ یہ ہے کہ اس عمل کے دوران انسان کے اندر اعلیٰ احساسات جاگتے ہیں۔ وہ دوسرے کو عزت دے کر خود اپنے آپ کو ایک باعزت انسان بنا لیتا ہے۔

قدرت کے باوجود

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — جب تم کو اپنے دشمن پر قدرت حاصل ہو جائے تو اسے معاف کرنے کو اس پر اپنی قدرت کا شکرانہ بنالو

(رُوی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: اذا قدرت علیٰ عدوّک فاجعل العفو عنہ شکراً للقدرۃ علیہ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۳۰۰

اخلاق کیا ہے۔ اخلاق اعلیٰ انسانی کردار کا دوسرا نام ہے۔ انسانی تعلقات میں کسی شخص سے جس اعلیٰ سلوک کی توقع کی جاتی ہے اسی کو اخلاق کہتے ہیں۔ کسی انسان کی انسانیت کو پہچاننے کا معیار یہی اخلاق ہے۔

ایک شخص سے آپ کی دشمنی ہو گئی۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ آپ نے اس کو زیر کر کے اس کے اوپر قابو پالیا۔ اس وقت ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس معاملہ کو صرف انتقام کی نظر سے دیکھیں، آپ یہ سوچیں کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس سے بھرپور بدلہ لیا جائے اور اپنے انتقام کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جائے۔ مگر یہ نہایت چھوٹی سوچ ہے، اعلیٰ انسانیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ سارے معاملہ کو خدا کی نظر سے دیکھیں۔ آپ اپنی کامیابی کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی کامیابی سمجھیں۔ ایسی حالت میں آپ کے جذبات بالکل مختلف ہوں گے اب آپ کے اندر شکر کا جذبہ ابھر آئے گا۔ اپنی کامیابی کے بعد شکر کی سب سے زیادہ اعلیٰ صورت آپ کو یہ دکھائی دے گی کہ آپ اپنے دشمن کو معاف کر دیں۔

قابو پانے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک زبردست قربانی کا معاملہ ہے۔ اس کے لیے باہر کے دشمن کو کچلنے کے بجائے، خود اپنے نفس کو کچلنا پڑتا ہے۔ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے بعد ہی کسی کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ قابو پانے کے بعد بھی اپنے دشمن کو معاف کر دے۔

معاف کرنا ایک نیکی ہے۔ اور قدرت کے باوجود معاف کرنا سب سے بڑی نیکی۔

اصلاح کا جذبہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — مومن، مومن کا آئینہ ہے۔ جب وہ اس میں کوئی عیب دیکھتا ہے تو اس کو درست کر دیتا ہے (المُؤْمِنُ مِرآةُ المؤمِنِ، إذا رَأى فيهِ عَيباً أصلَحهُ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۳۸۱

انسان کی انسانیت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خیر خواہ ہو۔ ہر انسان دوسرے انسان کی بہتری چاہے۔ ہر انسان کا یہ حال ہو کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا بھائی سمجھے، وہ ان کی ترقی پر خوش ہو، اور اگر کسی بھائی میں کوئی خرابی دیکھے تو وہ خیر خواہی کے جذبہ کے تحت اس کی اصلاح کے لیے مستعد ہو جائے۔

جس سماج میں لوگوں کا یہ حال ہو وہاں ہر انسان دوسرے انسان کے لیے آئینہ کی مانند ہوگا۔ اگر آپ آئینہ کے سامنے کھڑے ہوں تو وہ کسی کمی یا زیادتی کے بغیر آپ کے اصل چہرے کو دکھا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک سچے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ جب بھی کسی دوسرے انسان کے اندر کوئی کمی یا خرابی دیکھتا ہے تو اس کا انسانی جذبہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کو اس سے باخبر کر دے۔ سچے انسان کے لیے ایسے معاملہ میں چپ رہنا ممکن نہیں۔

آئینہ جب کسی کو اس کے چہرے کی خرابی دکھاتا ہے تو اس کے اندر کوئی برا جذبہ نہیں ہوتا۔ آئینہ کا کام صرف خرابی کو بتانا ہے نہ کہ خرابی والے انسان کو نیچا دکھانا۔ اسی طرح سچا انسان وہ ہے جو اپنے بھائی کو اس کی خرابی سے آگاہ کرے تو اس کے دل میں بھائی کے خلاف نفرت یا حقارت کا کوئی جذبہ نہ ہو، ایسا کرتے ہوئے نہ وہ اپنے آپ کو اونچا سمجھے اور نہ دوسرے کو نیچا۔ اس کا مقصد صرف عیب کی اصلاح ہو نہ کہ عیب کا اشتہار۔

آئینہ آدمی کے چہرہ پر کوئی دھبہ بتائے تو آدمی کسی رکاوٹ کے بغیر فوراً اس کو قبول کر لیتا ہے۔ مگر جب انسان کسی آدمی کو اس کا عیب بتائے تو اکثر وہ اس کو اپنی عزت اور غیرت کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ یہ جذبہ آدمی کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ انسان کی نشاندہی کو بھی اسی طرح خوش دلی کے ساتھ قبول کرے جس طرح وہ آئینہ کی نشاندہی کو قبول کرتا ہے۔

اپنا محاسبہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — تم لوگ خود اپنا محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے (حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا) الترمذی

انسان موجودہ دنیا میں عمل کرنے کے لیے آزاد ہے مگر وہ انجام کے معاملہ میں آزاد نہیں۔ آپ کو اختیار ہے کہ جو چاہیں بولیں اور جو چاہیں کریں۔ مگر آپ کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ اپنے آپ کو اپنے قول و عمل کے انجام سے بچا سکیں۔

آدمی اپنی زبان سے کڑوا بول بولے تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ سننے والوں پر کڑوے بول کا بھی وہی رد عمل ہو جو میٹھے بول کا ہوتا ہے۔ جو آدمی اپنی زبان سے کڑوا بول بولے اس کو جاننا چاہیے کہ اس کو بہر حال لوگوں کی طرف سے منفی رد عمل کی قیمت بھگتنی پڑے گی۔ جو آدمی بے سوچے سمجھے عمل کرے اس کو جاننا چاہیے کہ اس کا اس قسم کا عمل فطرت کے قانون کے مطابق اپنا نتیجہ ظاہر کرے گا نہ کہ اس کی ذاتی خواہش کے مطابق۔

آدمی کے قول و عمل کا ایک انجام وہ ہے جو فوری طور پر دنیا میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ دوسرا انجام وہ ہے جو موت کے بعد آخرت میں ظاہر ہوگا۔ آخرت کا انجام بھی بہر حال اسی طرح سامنے آنے والا ہے جس طرح دنیا کا انجام آدمی کے سامنے فوراً آجاتا ہے۔ آدمی کو بلاشبہ یہ اختیار ہے کہ وہ جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ مگر یہ اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں کہ وہ اپنے قول و عمل کے انجام سے اپنے کو بچا سکے، نہ موجودہ دنیا میں اور نہ آخرت کی دنیا میں، جو مرنے کے بعد ہر ایک کے سامنے آنے والی ہے۔

ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ ہر آدمی اپنا نگراں آپ بن جائے۔ ہر آدمی اس کو اپنا معمول بنا لے کہ ہر روز وہ اپنا محاسبہ کرتا رہے۔ ہر آدمی اپنا بے لاگ جائزہ لے کہ اس نے جو کچھ کیا یا کہا، کیا وہ اس قابل تھا کہ اس کو کہا جائے اور کیا جائے، یا وہ اس قابل نہ تھا۔ قبل اس کے کہ آدمی کی کارگزاری کا انجام اس کے اوپر ٹوٹ پڑے اسے چاہیے کہ وہ اپنا محاسبہ کرکے پیشگی طور پر اس سے بچنے کے لیے فکر مند ہو جائے۔

تکمیلِ انسانیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ جس نے لوگوں سے معاملہ کیا پھر ان سے ظلم نہیں کیا۔ اور ان سے بات کی اور جھوٹ نہیں بولا۔ اور ان سے وعدہ کیا پھر ان کی خلاف ورزی نہیں کی تو وہ ان میں سے ہے جس نے اپنی انسانیت کی تکمیل کر لی (رُوِی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: مَن عامل النّاس فلم یظلمھُم، وحدّثھُم فلم یُکذّبھُم، ووعدھُم فلم یخلفھُم فھوَ مِمّن کمُلت مروّتہ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۵۰۱

کامل انسان کون ہے، کامل انسان وہ ہے جس کے اندر انسانیت کی اعلیٰ صفات پائی جائیں۔ جو ہر تجربہ میں اور ہر موقع پر یہ ثابت کرے کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک انسان ہے نہ کہ انسان کی صورت میں صرف ایک حیوان۔

انسان کی پہچان اس کی صورت نہیں ہے بلکہ اس کا معاملہ ہے۔ جو آدمی دوسروں سے معاملہ کرتے ہوئے اپنی انسانیت کو قائم رکھے وہی سچا اور حقیقی انسان ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی معاملہ کے وقت ان امیدوں کو پورا نہ کر سکے جو ایک انسان سے بحیثیت انسان کی جاتی ہیں تو وہ اپنی انسانیت کو ثابت کرنے میں ناکام ہو گیا۔

اس سلسلہ میں ایک انسانی صفت یہ ہے کہ آدمی جب کسی سے معاملہ کرے تو وہ اس کے ساتھ ظلم نہ کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس سے روکے کہ وہ دوسروں کے ساتھ حق تلفی کرنے لگے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اسی چیز کو لے جو عدل و انصاف کے اعتبار سے اس کا حق ہے۔ اور جو چیز امر واقعہ کے اعتبار سے اس کا حق نہ ہو اس کو وہ ہرگز نہ لے، خواہ بظاہر وہ اس کو لینے کی قدرت رکھتا ہو۔

اسی طرح انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ ہمیشہ سچ بولے، وہ کبھی اپنی زبان سے ایسی بات نہ نکالے جو حقیقت کے اعتبار سے جھوٹ ہو۔ اسی طرح انسان کی ایک اعلیٰ صفت یہ ہے کہ جب وہ کسی سے کوئی وعدہ کرے تو ہر حال میں وہ اس کو پورا کرے۔ کسی آدمی کے باکردار ہونے کی سب سے زیادہ یقینی پہچان یہی ہے۔

حُسنِ اخلاق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— قیامت کے دن مومن کی ترازو میں سب سے زیادہ وزنی چیز اچھا اخلاق ہوگا۔ اور خدا اس شخص سے نفرت کرتا ہے جو بے حیائی کی بات بولے اور بدزبانی کرے (قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انّ اثقل شیٍٔ فی میزانِ المومنِ یوم القیامۃِ خُلقٌ حَسنٌ و انّ اللّٰہ یُبغض الفاحش البذی) الترمذی

اخلاق انسان کی پہچان ہے۔ جیسا اخلاق ویسا انسان۔ کوئی آدمی اچھا لباس پہن کر اچھا آدمی نہیں بنتا۔ یہ دراصل اچھا اخلاق ہے جو کسی انسان کو اچھا انسان بناتا ہے۔

انسانی اخلاق کی پہچان سب سے پہلے اس کی زبان سے ہوتی ہے۔ زبان آدمی کی اندرونی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ کوئی آدمی اپنی اندرونی شخصیت کے اعتبار سے جیسا ہوگا ویسا ہی وہ اپنی زبان پر ظاہر ہوگا۔

جس آدمی کے اندر انسانیت ہو، وہ تواضع اور ہمدردی کے احساسات میں جی رہا ہو، جو اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتا ہو کہ اس کے اوپر دوسروں کے حقوق ہیں اور ان حقوق کو بہر حال ادا کرنا ہے۔ ایسا آدمی جب کلام کرے گا تو اس کی زبان میں دوسروں کی رعایت شامل ہوگی۔ وہ ہر حال میں انصاف کی بات بولے گا۔ اس سے دوسروں کو میٹھے کلام کا تحفہ ملے گا۔

اس کے برعکس جس آدمی کے دل میں کبر ہو، جس کا سینہ ذمہ داری کے احساس سے خالی ہو، جو دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنا نہ جانتا ہو۔ ایسا آدمی جب دوسروں سے کلام کرے گا تو اس کے کلام میں بے حسی ہوگی۔ اس کے الفاظ بدخواہی کی کڑواہٹ لیے ہوئے ہوں گے۔ دوسروں کی طرف سے اس کے خلاف کوئی سخت بات پیش آجائے تو وہ فوراً مشتعل ہو جائے گا اور بدگوئی اور بدگمانی کا انداز اختیار کرے گا۔ اچھا انسان وہ ہے جو لوگوں کے درمیان پھول کی طرح رہے۔ اور برا انسان وہ ہے جو لوگوں کے درمیان اس طرح رہے کہ وہ لوگوں کے لیے کانٹا بنا ہوا ہو۔

امانت داری

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — جس شخص نے اپنی امانت تمہارے سپرد کی۔ اس کی امانت اس کو واپس کرو۔ کوئی شخص تم سے خیانت کرے تب بھی تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو (ادِّ الامانۃ الی من ائتمنک ولاتخن من خانک) الترمذی

عام حالت میں ایک آدمی اپنی فطرت پر ہوتا ہے، فطرت انسان کی نہایت صحیح معلّم ہے۔ چنانچہ عام حالت میں انسان وہی کرتا ہے جو اسے کرنا چاہیے۔ وہ امانتوں کو ادا کرتا ہے اور لوگوں کے ساتھ وہ سلوک کرتا ہے جو انسانیت کے مطابق ہو۔

انسان کی اصل جانچ عام حالت میں نہیں ہے بلکہ خاص حالت یا ہنگامی حالت میں ہے۔ مثلاً چھوٹی امانت کا معاملہ ہو تو آدمی اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتا۔ وہ وقت پر اسے ادا کر دیتا ہے۔ لیکن جب معاملہ کسی بڑی امانت کا ہو تو اس وقت وہ بدل جاتا ہے۔ وہ انسانی اور اخلاقی اصولوں کو توڑ کر یہ کوشش کرنے لگتا ہے کہ اس کو امانت ادا کرنا نہ ہو، دوسرے کی چیز کو وہ اپنے قبضہ میں لے لے۔

مگر یہ سخت غیر انسانی فعل ہے۔ امانت ہر حال میں قابلِ ادائیگی ہے۔ خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی حتی کہ اگر صاحب امانت کے پاس اپنی امانت کے حق میں کوئی ثبوت موجود نہ ہو تب بھی وہی اپنی امانت کا مالک ہے اور امانت دار پر اس کی ادائیگی اسی طرح ضروری ہے جس طرح ثبوت کی موجودگی میں ضروری ہوتی ہے۔

انسان کا حال یہ ہے کہ عام حالت میں وہ لوگوں کے ساتھ بدمعاملگی یا خیانت نہیں کرتا لیکن جب کوئی شخص اس کے ساتھ خیانت کا معاملہ کرے تو وہ ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ منفی جذبات سے مغلوب ہو کر وہ چاہنے لگتا ہے کہ جس نے اس کے ساتھ خیانت کا معاملہ کیا ہے وہ بھی اس کے ساتھ مزید اضافہ کے ساتھ خیانت کا معاملہ کرے۔ مگر ایک شخص کی خیانت دوسرے شخص کے لیے خیانت کو جائز نہیں کرتی۔

اخلاقی اصول

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے (لا یؤمنُ احدکُم حتّٰی یُحبَّ لاخیہِ ما یُحبُّ لنفسِہٖ) متفق علیہ۔

اخلاق کا سادہ اور فطری اصول یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے لیے بھی وہی چاہنے لگے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔ اور دوسروں کے لیے بھی اس سلوک کو برا سمجھے جس سلوک کو وہ اپنے لیے برا سمجھتا ہے۔

یہ ایک ایسا معیار ہے جو ہر ایک کو معلوم ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو اس حقیقت کو نہ جانتا ہو۔ یہ اصول ہر آدمی کو ایک ایسا اخلاقی معیار دیتا ہے، جس کی روشنی میں وہ بے خطا طور پر اپنے لیے صحیح رویہ کا فیصلہ کرے، اور جو رویہ غلط ہو اس کو چھوڑ دے۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ اس کو اپنے خلاف سازش پسند نہیں، اس لیے اس کو چاہیے کہ وہ بھی کسی کے خلاف سازش نہ کرے۔ ہر آدمی کو ناپسند ہے کہ کوئی شخص اس کا بدخواہ بن جائے اس لیے اس کو چاہیے کہ وہ بھی کسی کے خلاف بدخواہی نہ کرے۔ ہر آدمی کو معلوم ہے کہ کڑوا بول اس کی پسند کے مطابق نہیں اس لیے اس کو چاہیے کہ وہ بھی کسی کو اپنے کڑوے بول کا تحفہ نہ دے۔ ہر آدمی یہ جانتا ہے کہ اگر اس کو بے عزت کیا جائے تو ایسا فعل اس کو بے حد ناگوار ہوگا اس لیے اس کو چاہیے کہ وہ کسی بھی حال میں کسی دوسرے آدمی کو بے عزت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ہر آدمی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر اس کا مال چھینا جائے تو وہ کسی حال میں اس کو پسند نہیں کرے گا۔

یہی معاملہ پسند کا ہے۔ ہر آدمی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کیا چیزیں اس کو پسند ہیں۔ کن چیزوں کو پاکر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اب ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے اس چیز کا حریص بن جائے جس کا حریص وہ خود بنا ہوا ہے۔ وہ دوسروں کو وہی دے جس کو وہ خود پانا چاہتا ہے۔ کسی سماج کے افراد اگر اس اصول کو اختیار کر لیں تو اپنے آپ وہ سماج ایک بہتر سماج بن جائے گا۔

بھلائی اور برائی

حدیث میں آیا ہے کہ —— نواس بن سمعان صحابی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ بھلائی اور برائی کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا بھلائی حُسن خُلق کو کہتے ہیں اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تجھ کو برا لگے کہ لوگ اس سے باخبر ہوجائیں (عن النواس بن سمعان الانصاری قال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم عن البرّ والاثم فقال البرُّ حُسنُ الخُلق والاثمُ ما حاكَ في صدرِك وكرِهتَ انّ يطّلِعِ عليهِ الناس) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔

نیکی یا بھلائی ایک جذبہ ہے جو آدمی کے دل میں ہوتا ہے۔ اور وہ انسانوں سے معاملہ کرتے ہوئے اچھے اخلاق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ نیکی اپنی اصل کے اعتبار سے ایک داخلی حقیقت ہے۔ اور روزمرہ کی زندگی میں ظاہر ہونے والا حسن اخلاق اس کا خارجی ثبوت۔

جس آدمی کے دل میں نیکی ہو جب وہ لوگوں سے ملے گا تو اس کے چہرہ پر خوشی کی جھلک آجائے گی۔ جب وہ بولے گا تو اس کے الفاظ میں خیر خواہی کا جذبہ بھرا ہوا ہو گا۔ اس کا اخلاقی رویہ ہر حال میں باقی رہے گا، خواہ دوسروں نے اس کو خوش گوار انداز میں خطاب کیا ہو یا ناخوش گوار انداز میں۔ مزید یہ کہ اس کی خوش اخلاقی حقیقی خوش اخلاقی ہوگی نہ کہ محض ظاہری اور مصنوعی خوش اخلاقی۔

برائی یا برا اخلاق کیا ہے، اس کا ایک سادہ معیار فطرت نے ہر آدمی کے اندر رکھ دیا ہے۔ اور وہ ضمیر ہے۔ جب بھی آدمی کوئی بات سوچے یا وہ کوئی بری کارروائی کرے تو فوراً اس کے سینہ کے اندر بیٹھی ہوئی ضمیر کی عدالت اس کو چوکنا کرتی ہے۔ وہ خاموش زبان میں اس سے کہنے لگتی ہے کہ یہ غلط بات ہے۔ تم کو چاہیے کہ تم اسے چھوڑ دو۔ آدمی اگر ضمیر کی آواز کی پیروی کرے تو وہ کبھی برائی میں مبتلا نہ ہو۔

ضمیر کی آواز کے ذریعہ خدا ہر انسان کو متنبہ کرتا ہے۔ ضمیر خدا کی حجت ہے۔ ضمیر کی آواز کو نظر انداز کرنا خدا کی آواز کو نظر انداز کرنا ہے۔

عفوو تواضع

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — صدقہ دینے سے مال نہیں گھٹتا۔ اور بندہ جب معاف کرتا ہے تو خدا اس کی عزت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اور جو بندہ خدا کے لیے تواضع کرتا ہے خدا اس کو بلندی عطا کر دیتا ہے (ما نقصت صدقۃٌ من مالٍ وما زاد اللہ عبداً بعفوٍ الا عزاً وما تواضع احدٌ للہ الا رفعہ اللہ) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔

اخلاق دوسرے لفظوں میں، دینے کا ایک معاملہ ہے۔ جب آدمی کسی سے اچھا بول بولتا ہے یا اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے تو وہ اس کو اپنی محبت دے رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص کسی دوسرے کی مالی مدد کرتا ہے تو وہ بھی اپنی چیز کو دوسرے کے لیے دینا ہوتا ہے۔

بظاہر یہ دینا یک طرفہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی آدمی دوسرے سے کچھ پائے بغیر اس کو اپنے پاس سے دے رہا ہے۔ مگر کوئی بھی اخلاقی معاملہ یک طرفہ معاملہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دینے میں پانے کا راز چھپا ہوا ہے۔

جس سماج میں لوگ ایک دوسرے کی مالی مدد کریں، ان کے اندر جمع کرنے کے بجائے خرچ کرنے کا مزاج ہو، اس سماج میں دولت کی گردش بڑھے گی اور استحصالی ذہنیت کا خاتمہ ہوگا۔ ایسے ماحول میں یہ بالکل فطری بات ہے کہ دینے والا مختلف طریقوں سے اپنے دینے کے فوائد میں حصہ دار بن جائے۔ ایسے سماج میں جب عمومی بہبودی آئے گی تو اس کا فائدہ ہر ایک کو پہنچے گا یہاں تک کہ دینے والے کو بھی۔

جب کوئی شخص آپ کے سامنے سرکشی کرے اور آپ اس کے مقابلہ میں جوابی انداز اختیار نہ کریں بلکہ تواضع کا انداز اختیار کریں تو فطرت کا قانون حرکت میں آکر آپ کا درجہ اونچا کر دیتا ہے اور دوسرے کا درجہ نیچا۔ اس طرح تواضع کی روش اختیار کرنا عملی نتیجہ کے اعتبار سے آدمی کے لیے سرفرازی کا سبب بن جاتا ہے۔

خدا کا پسندیدہ معاشرہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— خدا بندے کی مدد پر ہوتا ہے جب تک کہ وہ اپنے بھائی کی مدد پر ہو (اللّٰہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ) صحیح مسلم

موجودہ دنیا کا نظام خدا نے فطرت کے جس قانون کے تحت بنایا ہے اس میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے کیے ہوئے کا انجام نہ پائے۔ اس قانون کا ایک پہلو یہ ہے کہ کوئی آدمی جب سماج کے دوسرے لوگوں کی مدد کرتا ہے، وہ ان کی ضرورت کے موقع پر ان کے کام آتا ہے تو پورے ماحول میں اس کے موافق فضا بننے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ معاملہ اپنے آپ دوطرفہ بن جاتا ہے۔ جس نے دوسروں کی مدد کی تھی، دوسرے لوگ بھی مزید اضافہ کے ساتھ اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

انسان کی مدد کرنا کسی پتھر کے اسٹیچو کی مدد کرنا نہیں ہے بلکہ زندہ اور حساس انسان کی مدد کرنا ہے۔ انسان کے اندر پائی جانے والی یہی زندگی اور حساسیت معاملہ کو دوطرفہ بنا دیتی ہے۔ مدد پانے والا اپنی فطرت سے مجبور ہو کر مدد دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

سماجی نظام کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا ہر فرد صرف اپنے بارے میں سوچتا ہو۔ اس کو اپنے مفاد کے سوا کسی اور چیز کی خبر نہ ہو۔ وہ وہاں حرکت میں آتا ہو جہاں اس کا ذاتی فائدہ ہے اور جہاں اس کا ذاتی فائدہ نہ ہو وہاں وہ بے حس و بے حرکت بن جائے۔ ایسا سماج خدا کی مدد سے محروم رہتا ہے۔ ایسے سماج میں اعلیٰ انسانیت کی فضا نہیں بنتی۔ اور جہاں اعلیٰ انسانیت کی فضا نہ ہو وہاں ہر ایک کو کہیں نہ کہیں اس کا برا انجام بھگتنا پڑتا ہے۔

دوسرا سماج وہ ہے جہاں ہر آدمی اپنی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے بھی تیار رہتا ہو۔ جہاں ہر آدمی اپنے جذبات کے ساتھ دوسروں کے جذبات کا بھی لحاظ کرتا ہو۔ ایسے سماج میں اپنے آپ ہر طرف انسانیت اور اخلاق کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ ہر ایک کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ماحول میں رہ رہا ہے نہ کہ غیروں کے ماحول میں۔

برائی کے بدلے بھلائی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــ خدا برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو اچھائی سے مٹاتا ہے۔ گندگی، گندگی کو صاف نہیں کرتی (إِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْحُو السَّيِّئَ بِالسَّيِّئِ وَلٰكِنْ يَمْحُو السَّيِّئَ بِالْحَسَنِ إِنَّ الْخَبِيثَ لَا يَمْحُو الْخَبِيثَ) مسند احمد

لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ ہر آدمی خود اپنی فطرت کے زور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ وہ سلوک کرے جو اس کو سماج میں سرخرو بنانے والا ہو۔ پھر آدمی کیوں ایسا کرتا ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق کی روش سے ہٹ جاتا ہے، اس کا سبب جوابی نفسیات ہے۔

سماج میں جب بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے جذبات کو دوسرے آدمی سے کوئی ٹھیس پہنچے تو پہلا آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میری عزت خطرہ میں آگئی۔ اپنی عزت کو محفوظ کرنے کا طریقہ اس کی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وہ دوسرے شخص پر جوابی حملہ کرکے معاملہ کو برابر کرے۔ مگر یہ ایک غلط تدبیر ہے۔ ایسی کسی کارروائی کا کبھی کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلتا۔

جس طرح ایک گندگی کو دوسری گندگی کے ذریعہ پاک نہیں کیا جاسکتا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ ایک غلطی کو دوسری غلطی کے ذریعہ درست کیا جائے۔ بداخلاقی کا جواب بداخلاقی نہیں۔ اس کی اصلاح کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ جس آدمی نے بداخلاقی کا سلوک کیا ہے اس کے ساتھ حسنِ اخلاق کا سلوک کیا جائے۔

جب آپ برے سلوک کا جواب برے سلوک سے دیں تو فریق ثانی کے اندر انتقامی نفسیات جاگ اٹھتی ہے۔ وہ آپ کے لیے پہلے سے بھی زیادہ بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ برے سلوک کا جواب اچھے سلوک سے دیں تو فریق ثانی کے اندر شرمندگی کا احساس جاگ اٹھے گا، وہ خود اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے گا۔ اس کا یہ جذبہ خود ہی اس کو مجبور کرے گا کہ وہ آپ کے بارے میں اپنے رویہ کو درست کرلے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کسی معاملہ کو اپنے انتقامی جذبہ کی تسکین کا مسئلہ نہ بنائے، بلکہ اس کو صرف حل کی نظر سے دیکھے۔

بہترین اخلاق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — کیا میں تم کو بتاؤں کہ دنیا و آخرت میں لوگوں کا بہترین اخلاق کیا ہے۔ کہا گیا کہ ہاں اے خدا کے رسولؐ، آپ نے فرمایا کہ جو تم سے کٹے تم اس سے جڑو، جو تم کو محروم کرے تم اسے دو، اور جو تمہارے اوپر زیادتی کرے تم اسے معاف کرو (عَن عقبة بنِ عامِرٍ قالَ قالَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم الا اخبرُك بافضلِ اخلاقِ اهلِ الدُنيا و الآخِرةِ قالَ نعم قالَ تصلُ مَن قطعك وتُعطي مَن حَرمك وتعفو عمّن ظلمك) البيهقی

دنیا میں آدمی کو بار بار تلخ تجربے پیش آتے ہیں۔ کوئی شخص ایک بات پر ناراض ہو کر آپ سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ کوئی شخص آپ کو محرومی کا تجربہ کراتا ہے۔ کوئی شخص آپ کے ساتھ زیادتی کا معاملہ کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر جوابی غصہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لوگ چاہنے لگتے ہیں کہ جس سے انھیں تلخ تجربہ پیش آیا ہے اس کو بھی اپنی طرف سے تلخ تجربہ کرائیں تاکہ اس کو سبق حاصل ہو۔

مگر یہ اعلیٰ انسانی سوچ نہیں۔ اعلیٰ انسان وہ ہے جو اپنی عقل سے سوچے، جس کا رویہ خود اپنے سوچے سمجھے اصول کے تحت متعین ہوتا ہو نہ کہ دوسروں کے ردعمل کے تحت۔

ایسے انسان کا ذہن دوسروں کے رویے سے برہم نہیں ہوتا۔ اس کی فکری پختگی اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ ردعمل سے اوپر اٹھ کر اپنے لیے جینے کی سطح پا لے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے، خواہ ان کی طرف سے اس کو برے سلوک کا تجربہ ہوا ہو۔

اس کی بلند فکری اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ بھی جڑا رہے جو اس کے ساتھ تعلق توڑنے کا معاملہ کرتے ہوں۔ وہ ان لوگوں کو بھی دینے میں خوشی محسوس کرے جو اس کو نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے ہوں۔ کوئی شخص اس کے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ کرے تب بھی اس کا دل تنگ نہیں ہوتا، بلکہ وہ یک طرفہ طور پر ایسے لوگوں کو معاف کر دیتا ہے۔ —— اعلیٰ اخلاق با اصول انسان کا طریقہ ہے، اور کمتر اخلاق بے اصول انسان کا طریقہ۔

آدابِ کلام

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — خدا اس شخص پر رحم کرے جس نے بھلی بات کہی اور اس کا فائدہ اٹھایا۔ یا وہ چپ رہا اور اس نے سلامتی پائی (رحم اللہ مَن قال خیراً فغنم او سکت فسلم) ادب الدنیا والدین، صفحہ ۲۳۳

اس دنیا میں جس طرح بولنا ایک کام ہے اسی طرح چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ کبھی حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ آدمی بولے اور کبھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ آدمی چپ رہے۔ وہ آدمی خوش قسمت ہے جو اس فرق کو جانے۔ ایسا آدمی خود بھی کامیاب ہوگا اور دوسروں کو بھی اس سے کامیابی کا تحفہ ملے گا۔

آدمی کو کب بولنا چاہیے، اس کی دو لازمی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے پاس کوئی ایسی بات ہو جو سچ مچ کہنے کے قابل ہو، یہ بات وہ ہوتی ہے جس پر آدمی نے مدتوں غور کیا ہو، اس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس کے بارے میں ایک رائے قائم کی ہو، اس کا بولنا اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لیے نہ ہو بلکہ تمام تر سننے والوں کی خیر خواہی میں ہو۔

تاہم بولنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ آدمی کے پاس ایک صحیح بات ہے۔ اسی کے ساتھ آدمی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی بے لاگ جائزہ کے تحت یہ دیکھے کہ اس کا بولنا نتیجہ کے اعتبار سے کیا ہوگا۔ بولنا صرف بولنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ کسی نتیجہ کے لیے ہوتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ صرف اس وقت بولے جب کہ اس کو یقین ہو کہ اس کا بولنا کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرے گا۔

جب آدمی کے پاس بولنے کے لیے کوئی بہت سوچی سمجھی بات نہ ہو یا حالات بتاتے ہوں کہ اس کا بولنا کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرنے کا سبب نہیں بنے گا تو ایسی حالت میں آدمی کے اوپر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ چپ رہے۔ ایسے موقع پر اس کا چپ رہنا ہی اس کے لیے باعثِ خیر ہے نہ کہ بولنا۔

اس دنیا میں خدا کی مدد اس کو ملتی ہے جو دنیا میں قائم کیے ہوئے خدائی قانون کی پابندی کرے۔ یہ دنیا خدا کے مقرر قوانین پر چل رہی ہے۔ یہ قوانین کبھی نہیں بدلتے۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ قانون فطرت سے ٹکرانے کے بجائے اس سے ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کرے۔

دوسروں کے حقوق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص مومن نہیں جو خود سیر ہو کر کھائے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے (عن ابن عباس قال سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لیس المومن بالذی یشبع وجارُہ جائعٌ الیٰ جنبہٖ) البیہقی

جس انسان کے اندر اعلیٰ احساس زندہ ہو وہ کبھی اس کو پسند نہیں کرے گا کہ وہ خود تو فراغت کے ساتھ کھائے اور پیئے جب کہ اس کو معلوم ہو کہ اس کے قریب ایسے افراد موجود ہیں جو بھوک کے مسئلہ سے دوچار ہیں اور ان کے پاس اپنی بھوک مٹانے کے لیے کوئی سامان موجود نہیں۔

یہ ایک انسانی احساس ہے۔ اس کا تعلق محدود طور پر صرف کھانے پینے سے نہیں بلکہ ہر انسانی ضرورت سے ہے۔ سچے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ جب بھی وہ کچھ انسانوں کو ضرورت کی حالت میں دیکھے تو وہ ان کے لیے تڑپ اٹھے۔ اس کو اس وقت تک چین نہ آئے جب تک کہ وہ ان کی ضرورت پوری نہ کر دے۔

اس ضرورت کا تعلق زندگی کے تمام پہلوؤں سے ہے۔ اگر آپ کا یہ حال ہو کہ آپ اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے تو بے حد فکر مند ہوں لیکن اپنے پڑوسیوں یا اپنے ہم وطنوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا جذبہ آپ کے اندر نہ پایا جائے تو یہ بھی اسی کوتاہی میں شامل ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ اپنے گھر والوں کی معاشیات کو درست کرنے کے لیے رات دن ایک کیے ہوئے ہوں لیکن دوسروں کی معاشیات کے بارے میں آپ کچھ نہ سوچیں تو آپ کی یہ روش بھی اسی حدیث کی مصداق قرار پائے گی۔

خدا کی جنت ایک لطیف اور نفیس کالونی ہے۔ اس میں وہی لوگ داخل کیے جائیں گے جو اپنے اندر آفاقی مزاج رکھتے تھے، جو تمام انسانوں کے درد کو اپنا درد بنائے ہوئے تھے۔

اسی طرح موجودہ دنیا میں کوئی اچھا انسانی سماج وہ لوگ بناتے ہیں جن میں یہ صفت ہو کہ وہ خود کھانے کے ساتھ دوسروں کو کھلائیں۔ وہ اپنے لیے سوچنے کے ساتھ دوسروں کے لیے بھی سوچیں۔ وہ اپنی ضرورتوں کی فراہمی کے ساتھ دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کی تڑپ رکھتے ہوں۔ وہ انسانی سماج میں اس طرح رہیں جیسے کہ یہ سماج ایک وسیع کنبہ ہے اور وہ اس کنبہ کے ایک فرد۔

نجات کا ذریعہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیفوں سے اسے بچائے تو اس کو چاہیے کہ وہ قرض دار کو مہلت دے یا وہ اس کو معاف کر دے (عن ابی قتادہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من سرّہ ان ینجیہ اللہ من کرب یوم القیامۃ فلینفّس عن معسرٍ او یضع عنہ) مسلم

ایک آدمی اپنی ضرورت کے لیے کسی سے قرض لے اور جب ادائیگی کا مقرر وقت آئے تو وہ اس کی ادائیگی کی طاقت نہ رکھتا ہو، ایسی حالت میں قرض دینے والے کو چاہیے کہ وہ قرض دار کو مزید مہلت دے۔ اور اگر اس کے حالات کو دیکھتے ہوئے قرض دینے والا اپنے قرض کو معاف کر دے تو اس کا یہ عمل خدا کو بہت پسند ہے۔ خدا ایسے بندوں کے ساتھ آخرت میں آسانی کا معاملہ فرمائے گا جو دنیا میں انسانوں کے ساتھ آسانی کا معاملہ کریں۔

اس اصول کا تعلق صرف قرض سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ سماجی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی مشکل میں پھنس جاتا ہے اور دوسرا آدمی یہ قدرت رکھتا ہے کہ وہ اس کو اس مشکل سے نکالے اور اس کو راحت پہنچائے۔ ایسا ہر موقع آدمی کے لیے اس اعتبار سے نہایت قیمتی ہے کہ وہ اپنے بھائی پر مہربانی کرکے زیادہ بڑے پیمانے پر اپنے لیے خدا کی مہربانی حاصل کر لے۔

دوسرے کا بوجھ اتارنا اپنے انجام کے اعتبار سے اپنے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے۔ دوسرے کے کام آنا آخر کار یہ فائدہ دیتا ہے کہ آدمی کا خود اپنا بگڑا ہوا کام بن جائے۔ جو آدمی دوسروں کی ضرورتیں پوری کرے خدا اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور زیادہ بڑے پیمانے پر اس کی ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔

کسی کو مشکل حالت میں دیکھ کر تڑپنا ایک اعتبار سے انسانیت کی بات ہے۔ جو شخص ایسا کرے اس نے گویا اپنے انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ اسی کے ساتھ اس کا دوسرا عظیم تر فائدہ یہ ہے کہ ایسا کرکے آدمی اپنے آپ کو خدا کی عنایت کا مستحق بنا لیتا ہے۔ یہ گویا دنیوی عمل کی اخروی قیمت ہے اور بلاشبہ کسی انسان کے لیے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں۔

پابند زندگی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— مومن کی مثال اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے کھونٹی کی رسّی سے بندھا ہوا گھوڑا، وہ گھومتا ہے اور پھر اپنی کھونٹی کی طرف واپس آجاتا ہے (مثلُ المومن ومثل الایمان کمثل الفرس فی آخیّتہٖ یجولُ ثم یرجع الیٰ آخیّتہٖ) البیہقی بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۲/۳۲۶

انسان کو دنیا کی زندگی میں کھلے ہوئے گھوڑے کی طرح نہیں رہنا ہے بلکہ بندھے ہوئے گھوڑے کی طرح رہنا ہے۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی کو مقرر اصولوں کا پابند بنالے۔ وہ ایک با اصول انسان کی زندگی گزارے نہ کہ بے اصول انسان کی زندگی۔

یہ با اصول زندگی کیا ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی حرام اور حلال میں تمیز کرے۔ خدا نے جن چیزوں کی اجازت دی ہے ان کو استعمال کرے اور خدا نے جن چیزوں سے روکا ہے ان سے وہ اپنے آپ کو روکے رہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ تعمیری انداز میں سوچے اور تخریبی سوچ سے ہر حال میں اپنے آپ کو باز رکھے۔ وہ اپنی زبان سے صرف درست بات نکالے اور جہاں غلط بات کا موقع ہو وہاں وہ اپنی زبان کو بند کرلے۔ لوگوں سے معاملہ کرنے میں وہ انصاف کے اصولوں کی پابندی کرے، وہ کبھی لوگوں کے ساتھ بے انصافی کا معاملہ نہ کرے، لوگوں کے درمیان اس کا سلوک ذمہ دارانہ سلوک ہو، غیر سنجیدگی اور غیر ذمہ داری کی روش کو وہ ہمیشہ کے لیے ترک کردے۔

گھوڑے کو مادی رسّی باندھتی ہے۔ مگر انسان کو جو چیز باندھتی ہے وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے اخلاقی اور انسانی اصول ہیں۔ گھوڑا مجبور ہوتا ہے کہ وہ رسی کے دائرہ سے باہر نہ جائے۔ یہی کام انسان خود عائد کی ہوئی پابندی کے تحت کرتا ہے۔ انسان کی عظمت یہ ہے کہ وہ اپنی رسّی آپ بن جائے۔ وہ اس پابند زندگی کو آزادانہ طور پر اختیار کرلے جس کو ایک گھوڑا مجبورانہ طور پر اختیار کیے ہوئے ہے۔

ناکام وہ ہے جو آزادی پاکر بے قید ہوجائے اور کامیاب وہ ہے جو آزادی کے باوجود پابند زندگی گزارے۔

نرم روش

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— مومن کی مثال ایک زرعی پودے جیسی ہے جس کو ہوائیں ہلاتی رہتی ہیں۔ ایک جھونکا اس کو زمین پر گرادیتا ہے اور دوسرا جھونکا اس کو سیدھا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا آخری وقت آجائے (مثل المومن کمثل الخامة من الزرع تفیئها الریاح، تصرعها مرة وتعدلها اخری، حتی یاتیه اجله) متفق علیہ بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۱/۴۸۷

خدا پرست انسان اکڑ والا انسان نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک نرم انسان ہوتا ہے۔ اپنی فکر اور عقیدہ پر کامل یقین رکھنے کے باوجود، عملی زندگی میں اس کا رویہ ہمیشہ نرمی والا ہوتا ہے نہ کہ سختی والا۔

سماجی زندگی میں کوئی آدمی اپنے عقیدہ میں تو بے لچک ہو سکتا ہے مگر لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے بے لچک بننا اس کے لیے ممکن نہیں۔ عقیدہ ایک ذاتی معاملہ ہے اور وہ حقیقت واقعہ سے مطابقت کے تحت بنتا ہے مگر عملی روش میں لوگوں کے ساتھ رعایت کرنا ضروری ہے۔ لوگوں کی رعایت کیے بغیر عملی زندگی کا کوئی ڈھانچہ بننا ممکن نہیں۔

عملی زندگی میں کوئی شخص اکڑ کی روش کیوں اختیار کرتا ہے، یہ ہمیشہ انانیت کی بنا پر ہوتا ہے۔ جب بھی کسی سے اختلاف کی صورت پیش آتی ہے تو آدمی فوراً اس کو اپنے لیے غیرت کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اگر میں نے اس معاملہ میں لچک دکھائی تو میں فریق ثانی کے مقابلہ میں چھوٹا بن جاؤں گا۔ یہی احساس اس کو لچک دار رویہ اختیار کرنے سے روک دیتا ہے۔ وہ اپنے موقف کو اصولی موقف قرار دے کر اس پر جم جاتا ہے۔ حالانکہ ایسے موقع پر اصولی موقف یہ ہے کہ معاملہ کو غیرت کا سوال نہ بنایا جائے، بلکہ نرمی اور لچک کا انداز اختیار کرتے ہوئے معاملہ کو حل کیا جائے۔

خدائی عقیدہ کے تحت جو انسان بنتا ہے اس کا احساس یہ ہوتا ہے کہ ساری بڑائی خدا کے لیے ہے۔ میں اس کا صرف بندہ ہوں اور میرے پاس عجز کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ احساس خدا پرست انسان کو ایک نرم انسان بنا دیتا ہے۔ جس کا اظہار لوگوں کے درمیان مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔

نرمی اور رعایت کا طریقہ ایک خدائی طریقہ ہے۔ اس کے برعکس شدت اور کڑے پن کا طریقہ سراسر غیر خدائی طریقہ۔

یکساں انسان

حدیث میں آیا ہے کہ — پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ایک مقام پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دوران وہاں سے ایک جنازہ گزرا، آپ (اس کے احترام میں) کھڑے ہوگئے۔ آپ سے کہا گیا کہ یہ ایک یہودی کا جنازہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کیا وہ انسان نہ تھا (الیست نفساً) فتح الباری ۳/۲۱۴

خدا پرستانہ زندگی کا اصول یہ ہے کہ ہر انسان کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جائے، خواہ وہ ایک مذہب سے تعلق رکھتا ہو یا دوسرے مذہب سے۔ خواہ وہ اپنی قوم کا آدمی ہو یا غیر قوم کا آدمی۔ احترام کا تعلق اس حقیقتِ واقعہ سے ہے کہ خدا نے جس طرح مجھ کو پیدا کیا ہے اسی طرح اس نے دوسرے انسانوں کو بھی پیدا کیا ہے۔ ایک انسان خواہ وہ کوئی بھی مذہب یا کلچر اختیار کرلے اس کی انسانی حیثیت بہر حال باقی رہتی ہے۔ اور اس مشترک حیثیت کی بنا پر وہ تمام لوگوں کے لیے بدستور قابل احترام بنا رہتا ہے۔

جب آپ کسی آدمی کو دیکھیں اور آپ کی نظر اس کے اختلافی پہلو پر چلی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ اس کے بارے میں نفرت اور توحش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ آپ اس کو اس نظر سے دیکھیں کہ وہ ایک انسان ہے۔ وہ خدا کا ایک تخلیقی شاہکار ہے۔ اس کا موجود ہونا وجود خدا کی اعلیٰ صفات کی یاد دلاتا ہے۔ تو ایسی حالت میں آپ ظاہری اختلافات کو بھول کر خدا کی خدائی میں گم ہو جائیں گے۔

اب مخلوق کے آئینہ میں آپ کو خالق دکھائی دینے لگے گا۔ انسان کی صورت میں آپ ایک ایسی ہستی کا تصور کرنے لگیں گے جو آپ ہی کی طرح خدا کی پیدا کی ہوئی ہے جو اتنا ہی محترم ہے جتنا آپ خود اپنے کو محترم سمجھتے ہیں۔ جس کا تعلق خدا کے ساتھ اتنا ہی ہے جتنا خود آپ کا تعلق خدائے رحمٰن و رحیم کے ساتھ ہے۔

کسی انسان کا احترام انسان کے لیے نہیں ہوتا بلکہ خدا کے لیے ہوتا ہے۔ مومن جب کسی انسان کا احترام کرتا ہے تو یہ اس کی طرف سے در اصل اس کے خدائی احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ اور خدائی احساسات کے اظہار کی کوئی حد نہیں۔ اس کا تعلق کانٹے سے بھی اتنا ہی ہے جتنا پھول سے، وہ ایک انسان کے معاملہ میں بھی اسی طرح ظاہر ہوتا ہے جس طرح کسی دوسرے انسان کے معاملہ میں۔

تربیت گاہ

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خیرکم خیرکم لاھلہ (مشکوٰۃ المصابیح ۲/۳۲۵۱) تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو۔ یعنی جو آدمی اپنے گھر کے لوگوں سے معاملہ کرنے میں بہتر ہوگا وہی باہر والوں سے معاملہ کرنے میں بھی بہتر ثابت ہوگا۔

گھر ہر آدمی کی فطری تربیت گاہ ہے۔ گھر کے اندر محدود سطح پر وہ سارے معاملات پیش آتے ہیں جو باہر سماج کے اندر زیادہ وسیع طور پر پیش آتے ہیں۔ اس لیے جو آدمی محدود دائرہ میں بہتر انسانیت کا ثبوت دے گا، وہ باہر کے وسیع تر دائرہ میں بھی بہتر انسانیت والا بن کر رہ سکے گا۔

ایک صاحب گورنمنٹ سروس میں تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ بیوی کو دبا کر رکھنا چاہیے۔ گھر کے اندر وہ روزانہ اپنے اسی نظریہ پر عمل کرتے۔ وہ ہمیشہ گھر کی خاتون کے ساتھ سخت انداز میں بولتے۔ وہ ان کے ساتھ شدت والا سلوک کرتے۔ تاکہ وہ ان کے مقابلہ میں دب کر رہیں۔

گھر کی تربیت گاہ میں ان کا جو مزاج بنا اسی کو لے کر وہ دفتر میں پہنچے۔ یہاں ان کی افسر (باس) اتفاق سے ایک خاتون تھیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہاں بھی ان کا وہی گھر والا مزاج قائم رہا۔ وہ اپنی افسر خاتون کے ساتھ بھی اسی قسم کا "مردانہ" معاملہ کرنے لگے جس کے عادی وہ اپنے گھر کی خاتون کے ساتھ ہو چکے تھے۔

لیڈی افسر ابتداءً ان کے ساتھ ٹھیک تھی۔ مگر ان کے غیر معتدل انداز نے لیڈی افسر کو بھی ان سے برہم کر دیا۔ اس نے بگڑ کر ان کا ریکارڈ خراب کر دیا۔ ان کا پروموشن رک گیا۔ وہ طرح طرح کی دفتری مشکلات میں پھنس گئے۔

صحیح اصول وہ ہے جو گھر کے اندر اور گھر کے باہر دونوں جگہ یکساں طور پر مفید ہو۔ یہ اصول شرافت کا اصول ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ گھر کے اندر شرافت کے ساتھ رہے۔ وہ بڑوں کو عزت دے اور چھوٹوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرے۔ یہ اصول گھر کے اندر بھی کامیاب ہے اور گھر کے باہر بھی۔ یہ آدمی کی اپنی ضرورت ہے کہ وہ گھر کے اندر اعتدال کے ساتھ رہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو باہر کی دنیا میں بھی لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک غیر معتدل ہو جائے گا۔

ناقابل معافی جرم

سنن ابی داؤد میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ خدا نے فرمایا: کبر میری چادر ہے، اور عظمت میری ازار ہے، پس ان دونوں میں سے کسی میں جو شخص مجھ سے نزاع کرے گا میں اس کو آگ میں پھینک دوں گا (الکبریاءُ ردائی، والعظمۃ ازاری، فمن نازعنی واحداً منہما قذفتُہ فی النار) کتاب اللباس ۴/۵۶

اس حدیث میں تمثیل کی زبان میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر قسم کی بڑائی اور ہر قسم کی برتری صرف ایک خدا کا حق ہے۔ جو شخص اس معاملہ میں کلی یا جزئی طور پر خدا کا ہمسر بننا چاہے وہ نہ صرف دنیا میں ذلیل ہوگا بلکہ آخرت میں اس کو شدید تر عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مثال کے طور پر خدا کی عظمت و کبریائی کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہی عزت دینے والا ہے اور وہی ذلت دینے والا۔ وہی کسی کو رزق دیتا ہے اور کسی کو رزق سے محروم کر دیتا ہے۔ اس کے سوا کسی کو یہ طاقت نہیں کہ کسی کو کچھ دے یا اس سے کوئی چیز چھین لے۔

مثلاً ایک شخص کو کسی آدمی پر غصہ آگیا۔ یہ غصہ انتقام تک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کے درپے ہوگیا کہ مذکورہ آدمی کو بے عزت کرے، اس کے رزق کا ذریعہ اس سے چھین لے۔ وہ اس کو اس کے ماحول میں بے جگہ بنا دے۔ کسی شخص کی طرف سے اس قسم کی تخریبی کوشش خدا کی عظمت و کبریائی سے گویا نزاع کرنا ہے۔ یہ نعوذ باللہ خدا کے اختیارات کو اس سے چھیننے کی جسارت کرنا ہے۔

اس قسم کا فعل حد درجہ سنگین ہے۔ جو شخص ایسا کرنے کی کوشش کرے وہ بظاہر اپنے حریف کے ساتھ یہ فعل کر رہا ہوتا ہے۔ مگر حدیث کی زبان میں وہ براہ راست خدا سے نزاع کر رہا ہے۔ وہ خدا کے اس نظام میں دخل دینے کی کوشش کر رہا ہے جس میں خدا نے کسی دوسرے کو شریک نہیں کیا۔ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے خدا کی خدائی میں شریک ہونے کی کوشش کرنا ہے۔ اور خدا کی خدائی میں شریک بننے کی کوشش بلاشبہہ ایک ایسا جرم ہے جو ہرگز قابل معافی نہیں۔

انسان کی بڑائی کبر میں نہیں ہے بلکہ تواضع میں ہے۔ انسانیت کی تمام ترقیاں متواضع انسان کے لیے مقدر ہیں نہ کہ متکبر انسان کے لیے۔

لایعنی سے پرہیز

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— آدمی کے اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ان کاموں کو چھوڑ دے جن میں کوئی فائدہ نہیں (من حُسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ) ادب الدنیا والدین للبصری صفحہ ۸۳۔

سچا انسان ایک بامقصد انسان ہوتا ہے۔ اس کی ساری توجہ ایک متعین مقصد کی طرف لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ مقصدیت اس کے اندر یکسوئی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ اس کام میں مشغول ہوتا ہے جس کا اس کے مقصد سے واضح تعلق ہو اور جو چیز اس کے مقصد کے اعتبار سے غیر متعلق ہو اس سے وہ اپنے آپ کو دور کر لیتا ہے۔

ایسا آدمی ضروری اور غیر ضروری میں فرق کرتا ہے۔ کسی کام کو کرنے سے پہلے وہ دیکھتا ہے کہ یہ کام اس کے مقصد کے اعتبار سے کس حد تک ضروری ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو بولنے سے پہلے سوچتا ہے کہ اس کا بولنا کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے والا ہے یا وہ ایک بے فائدہ کلام کی حیثیت رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے مقصد کے بارے میں اس کی حساسیت اس کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنی سوچ کے اوپر بھی نگراں بن جائے۔ وہ اپنے دماغ کو ایسی باتیں سوچنے میں استعمال نہ کرے جس کا کوئی مثبت فائدہ اس کو یا انسانیت کو ملنے والا نہیں۔

بے مقصد انسان اور بامقصد انسان کا فرق یہ ہے کہ بامقصد انسان سوچی سمجھی زندگی گزارتا ہے اور بے مقصد انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی واضح نشانہ نہیں ہوتا۔ وہ کسی منزل کے بغیر اپنی زندگی کے دن گزارتا رہتا ہے یہاں تک کہ اسی حال میں مر جاتا ہے۔

سچا انسان وہ ہے جو بااصول انسان ہو۔ ایسے انسان کی سرگرمیاں اصول کے تحت ہوتی ہیں نہ کہ محض ذاتی خواہش کے تحت۔ ایسا انسان اپنی ذاتی خواہش کو الگ رکھ کر چیزوں کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ ایسے انسان کا حال فطری طور پر یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف انہی چیزوں کو لیتا ہے جن کی کوئی اصولی اہمیت ہو اور جو چیزیں اصول کے اعتبار سے غیر اہم ہوں ان کو وہ چھوڑ دیتا ہے، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی بارونق دکھائی دیتی ہوں۔

اچھا انسان، برا انسان

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — کیا میں تم کو بتاؤں کہ تم میں سب سے زیادہ برے لوگ کون ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسولؐ۔ آپ نے فرمایا۔ تم میں سب سے زیادہ برے وہ ہیں جو چغلی کرتے پھریں، جو دوستوں کے درمیان بگاڑ ڈالیں۔ جو لوگوں کے عیوب تلاش کریں (عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: الا اخبرکم بشرارکم، قالوا بلیٰ یا رسول اللہ، قال: من شرارکم المشاؤون بالنمیمۃ، المفسدون بین الاحبۃ الباغون العیوب) ادب الدنیا والدین للبصری صفحہ ۲۲۲

فطرت کے نقشہ میں ہر انسانی کردار کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ مثالیں اس لیے ہیں کہ انسان ان پر غور کرے، وہ ان سے نصیحت لے۔ اور پھر وہ اچھے کردار کو اپنائے اور جو برا کردار ہے اس سے دور رہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ دنیا میں دو قسم کی مکھیاں ہوتی ہیں۔ ایک شہد کی مکھی، جو ہمیشہ خوشبو اور مٹھاس کی تلاش میں ہوتی ہے۔ وہ جس پھول میں خوشبو اور مٹھاس دیکھتی ہے فوراً اڑ کر وہاں پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح وہ پھولوں کی مٹھاس لے کر اسے جمع کرتی ہے تاکہ وہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچا سکے۔ دوسری مثال عام مکھی کی ہے۔ اس کو گندگی سے دل چسپی ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت اڑتی رہتی ہے۔ صرف اس لیے کہ جہاں وہ گندگی پائے وہاں پہنچ کر اس سے اپنا حصہ وصول کرے۔

اسی طرح انسانوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ انسان جو بھلائی کو پسند کرتا ہو۔ وہ لوگوں کے درمیان جائے تو ان سے ان کی بھلی باتوں کو لے اور اسے دوسروں تک پہنچائے۔ وہ لوگوں کے درمیان اچھی اور بھلی باتوں کا سفیر بن جائے۔ یہی وہ انسان ہے جس کو بہتر انسان کہا جائے۔ ایسا انسان فطرت کا مطلوب انسان ہے۔ فطرت کے تمام اعلیٰ امکانات ایسے ہی لوگوں کے لیے مقدر کیے گئے ہیں۔

دوسرا انسان وہ ہے جس کی روح کو برائیوں کے تذکرہ سے غذا ملتی ہو۔ ایسا انسان جب لوگوں سے ملتا ہے تو اس کی ساری دل چسپی یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی برائیوں کو تلاش کرے اور اگر کوئی برائی نہ ملے تو فرضی طور پر خود ساختہ برائیوں کو ان کی طرف منسوب کر دے، اور پھر ان فرضی یا واقعی برائیوں کو لوگوں سے بیان کرتا رہے۔

فخر و ناز

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فخر و ناز نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو (ان العُجب لیأکل الحسنات کما تأکل النارُ الحطبَ) ادب الدنیا والدین للبصری صفحہ ۱۱۳

انسان کے اندر فطری طور پر اَنا کا جذبہ رکھا گیا ہے، کوئی بھی شخص "میں" کے اس احساس سے خالی نہیں۔ یہ جذبہ انسان کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے، وہ اس لیے ہے کہ آدمی کے اندر عزم و ہمت پیدا ہو۔ وہ جوکھم کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھے۔ وہ خود اعتمادی کی طاقت سے مسلسل آگے بڑھتا رہے۔

مگر اکثر لوگ اس جذبہ کا برا استعمال کرتے ہیں۔ ان کا اَنا کا جذبہ خود اعتمادی کے بجائے خود پسندی اور ذاتی فخر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ انا کے جذبہ کا غلط استعمال ہے۔ اور کسی چیز کا غلط استعمال ہمیشہ اس کو برا بنا دیتا ہے، خواہ حقیقت کے اعتبار سے وہ چیز کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔

فخر و ناز کا جذبہ کوئی سادہ چیز نہیں۔ وہ انسان کی تمام خوبیوں کو کھا جاتا ہے، وہ انسان کے اندر اعلیٰ خصوصیات کے ارتقاء میں ایک مستقل رکاوٹ ہے۔ فخر کی نفسیات آدمی کو خود پسند بنا دیتی ہے، اور جو آدمی خود پسند ہو جائے اس نے گویا اپنے آپ کو ذاتی خول میں بند کر لیا۔ ایسا آدمی اس صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے کہ وہ خارجی حقیقتوں کو سمجھے، وہ دوسروں سے فائدہ اٹھائے، وہ اپنے سے باہر کی چیزوں کو اپنی ترقی کا زینہ بنا سکے۔

ایسا آدمی کوئی نیکی کا کام کرتا ہے تو اس میں بھی اس کا فخر کا جذبہ شامل رہتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے خود نمائی کے لیے کرتا ہے۔ اس کی سرگرمیوں کا محور اس کی اپنی ذات بن جاتی ہے، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ آدمی کی سرگرمیوں کا محور وہ حقیقت ہو جو اس کے باہر اعلیٰ سطح پر قائم ہے۔

فطرت انسان کے اندر تواضع دیکھنا چاہتی ہے۔ لیکن فخر پسند آدمی کبر کی تصویر بنا ہوا ہوتا ہے۔ فطرت حقیقتوں کے اعتراف کو پسند کرتی ہے۔ مگر ایسا آدمی بے اعترافی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ فطرت تمام انسانوں کو ایک نظر سے دیکھتی ہے اور ایسا آدمی چاہتا ہے کہ اس کو استثنائی مقام دیا جائے۔ فطرت کے ساتھ اس قسم کی عدم مطابقت موجودہ دنیا میں قابل عمل نہیں۔

پڑوسی کا حق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کون۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جس کا پڑوسی اس کی زیادتیوں سے امن میں نہ ہو (قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ لا یومن، واللہ لا یومن، واللہ لا یومن، قیل من یا رسول اللہ؟ قال الذی لا یأمن جارہ بوائقہ) بخاری، کتاب الادب۔ مسلم، کتاب الایمان۔

انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔ وہ جہاں بھی رہتا ہے ایک سماج کے اندر رہتا ہے حتی کہ آدمی جب سفر کرتا ہے اس وقت بھی کچھ لوگ اس کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ یہ تمام لوگ انسان کے پڑوسی ہیں۔

اب ایک انسان وہ ہے جو لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے ان کی پوری طرح رعایت کر رہا ہو۔ وہ ایسی بات نہ کہے جس سے لوگوں کے جذبات بھڑکیں۔ وہ ایسا کام نہ کرے جو اس کے قریبی لوگوں کے لیے مسئلہ پیدا کرنے والا ہو، وہ اپنی زندگی کے لیے سرگرم ہو مگر اس طرح کہ اس کی سرگرمی دوسروں کے لیے نقصان یا پریشانی کا سبب نہ بنے۔ یہ وہ انسان ہے جس نے اپنے پڑوسی کا حق ادا کیا۔

دوسرا انسان وہ ہے جو صرف اپنی رعایت کرنا جانتا ہو، دوسروں کی رعایت سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ایسا انسان دوسروں کے لیے مستقل مسئلہ بنا رہے گا۔ وہ اپنے غیر محتاط بول سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے گا۔ وہ ایسی کارروائیاں کرے گا جو دوسروں کا امن و سکون چھین لینے والی ہوں، وہ جب اپنا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہے گا تو اس کے لیے وہ ایسی غیر ذمہ دارانہ کارروائیاں کرے گا جو دوسروں کی زندگی میں خلل ڈالنے والی ہوں۔ ایسا انسان اپنے قریبی لوگوں کے لیے برا پڑوسی ہے۔

جو آدمی اپنے پڑوسی کے لیے اچھا ہو، وہی اچھا انسان ہے، اور جو آدمی اپنے پڑوسیوں کے لیے برا ہو وہی برا انسان۔ اپنے فائدہ کے لیے دوسرے کو نقصان پہنچانا بلاشبہ ایک جرم ہے اور کون شخص اس جرم کا مجرم ہے، اس کو جاننے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ اس آدمی کا پڑوس ہے۔ پڑوسی انسان گویا خدا کی عدالت ہے۔ جس انسان کے بارہ میں اس کے پڑوسی اچھی رائے رکھیں وہ اچھا انسان ہے اور جس انسان کو اس کے پڑوسی برا سمجھیں وہ بلاشبہ برا انسان۔

اخلاقی کنٹرول

ابومسعود البدری ایک صحابی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک بار وہ اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت وہاں آ گئے۔ آپ نے یہ دیکھ کر کہا کہ اے ابومسعود جان لو کہ اللہ تمہارے اوپر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنا تم اس غلام پر قدرت رکھتے ہو۔ یہ سن کر ابومسعود کے ہاتھ سے کوڑا گر گیا۔ انھوں نے کہا کہ آئندہ میں کبھی کسی غلام کو نہیں ماروں گا۔ اس کے بعد انھوں نے غلام کو آزاد کر دیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرتے تو آگ تم کو پکڑ لیتی (صحیح مسلم بحوالہ ریاض الصالحین، صفحہ ۳۹۸)

دنیا میں ظلم و زیادتی کی جتنی صورتیں ہیں ان سب کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک انسان کا سابقہ جب کسی دوسرے انسان سے پیش آتا ہے تو وہ اس کو صرف ایک انسانی معاملہ سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ بس ایک انسان ہے اور اگر میں اس کے ساتھ ظلم یا بے انصافی کروں تو اس کے آگے کہیں میری پکڑ ہونے والی نہیں۔

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ تمام انسانوں کے اوپر ایک برتر طاقت ہے اور وہ خدا ہے جو ہر انسان کی نگرانی کر رہا ہے۔ جو شخص کسی دوسرے کو ناحق ستائے یا اس کے ساتھ بے انصافی کرے تو خدا ایسے شخص کو پکڑے گا اور اس کو اس کے فعل کی سخت سزا دے گا۔

خدائی پکڑ کا یہ احساس کسی انسان کے لیے سب سے بڑا روک ہے۔ وہ انسان کو بتاتا ہے کہ جس معاملہ کو تم صرف ایک انسانی معاملہ سمجھ رہے ہو وہ حقیقۃً ایک خدائی معاملہ ہے۔ کسی انسان کے مقابلہ میں تم طاقت ور ہو سکتے ہو، مگر خدا کے مقابلہ میں کوئی بھی طاقت ور نہیں۔ خدا کی پکڑ جب ظاہر ہوگی تو نہ کوئی طاقت والا اس کی زد سے بچے گا اور نہ کوئی بے طاقت والا۔

مذکورہ عقیدہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اخلاقی کنٹرول میں رکھے۔ وہ اپنی آزادی کو کسی بھی حال میں غلط طور پر استعمال نہ کرے۔ اگر آپ کو اس حقیقت کا یقین ہو جائے تو کوئی انسان آپ کو کمزور نہیں دکھائی دے گا جس کو آپ دبائیں، اور نہ کوئی انسان آپ کو بے یار و مددگار نظر آئے گا جس کے اوپر اپنی ظالمانہ کارروائیوں کے لیے آپ دلیر ہو جائیں۔

غصہ نہیں

حدیث میں ہے کہ ایک شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اے خدا کے رسولؐ مجھے کچھ ایسی باتیں بتائیے جن کے تحت میں زندگی گزاروں اور وہ زیادہ نہ ہوں کہ میں بھول جاؤں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم غصہ نہ کرو (عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ أَنَّ رَجُلًا أَتَىٰ إِلَىٰ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ عَلِّمْنِي كَلِمَاتٍ أَعِيشُ بِهِنَّ وَلَا تُكْثِرْ عَلَيَّ فَأَنْسَىٰ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "لَا تَغْضَبْ") موطا امام مالک، صفحہ ۶۵۲

غصہ تمام انسانی خرابیوں کی جڑ ہے۔ جو آدمی اپنے غصہ پر قابو پالے وہ بقیہ تمام خرابیوں سے اپنے آپ بچ جائے گا۔ کسی آدمی کو اگر صرف ایک جامع اور کلیدی نصیحت کرنی ہو تو وہ صرف یہ ہوگی ——— اپنے آپ کو غصہ سے بچاؤ۔

غصہ کا مزاج ہر انسان میں ہوتا ہے۔ مگر عام حالات میں غصہ آدمی کے اندر سویا ہوا ہوتا ہے۔ یہ غصہ صرف اس وقت جاگتا ہے جبکہ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آکر اس کو جگا دے۔

دنیا کی زندگی میں یہی آدمی کا امتحان ہے جب وہ کسی کی زبان سے کڑوی بات سنے اور اس کے سینہ میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھے تو آدمی کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ غصہ کی آگ کو بجھائے نہ یہ کہ غصہ کی آگ کو اتنا بھڑکائے کہ خود بھی اس میں جل کر ختم ہو جائے۔

کامیاب انسان وہ ہے جس کا یہ حال ہو کہ غصہ کے حالات میں بھی وہ غصہ نہ کرے۔ اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مشتعل نہ ہو۔ ایسا آدمی معاملہ کو بڑھائے بغیر ابتدائی مرحلہ ہی میں اس کو ختم کر دے گا۔ غصہ نہ کرنے کی عادت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بے فائدہ طور پر ضائع ہونے سے بچا لیتا ہے۔ وہ ناموافق حالات میں بھی اپنے لیے موافق امکانات دریافت کر لیتا ہے۔

غصہ نہ کرنا عالی ظرفی کی علامت ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو آدمی غصہ کرے وہ اپنے اس عمل سے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ ظرف کی بلندی کی صفت اس کے اندر موجود نہیں۔

انسان کو ستانا

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — تم لوگ خدا کے بندوں کو تکلیف نہ دو، اور ان کو عار نہ دلاؤ۔ اور ان کی پوشیدہ باتوں کو تلاش نہ کرو (لا تؤذوا عباد اللہ ولا تعیّروھم ولا تطلبوا عوراتھم) مسند احمد بحوالہ جامع العلوم والحکم، صفحہ ۲۹۲

اچھا انسانی سماج بنانے کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے اندر اخلاقی احساس زندہ ہو۔ وہ دوسروں کی رعایت کرنا جانتے ہوں، وہ اپنے اوپر دوسروں کا یہ حق سمجھتے ہوں کہ انھیں دوسروں کے لیے ہرگز مسئلہ نہیں بننا ہے، حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ ان کے پاس بظاہر اس کے لیے کوئی عذر موجود ہو۔

ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ سماج کے اندر اس طرح رہے کہ اس سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اس کو اپنی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکالنے چاہئیں جس سے دوسروں کے جذبات مجروح ہونے والے ہوں۔ اس کو ایسی کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہیے جس میں اس کی اپنی ذات کے لیے تو فائدہ ہو مگر دوسروں کے لیے وہ نقصان کا سبب بن جائے۔ ایسا ہر قول اور عمل گویا دوسروں کو ستانا ہے اور جو آدمی دوسرے انسانوں کو ستائے وہ ایک بے قیمت آدمی ہے خدا کی نظر میں بھی اور بندوں کی نظر میں بھی۔

آدمی کے ساتھ کبھی ایسا واقعہ پیش آتا ہے یا اس سے کوئی ایسی غلطی ہو جاتی ہے جس کے بارہ میں اس کو شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی بات کا تذکرہ کرکے اس کو عار دلانا درست نہیں۔ تم وہی تو ہو جس نے ایسا کیا یا جس کے باپ نے ایسا کیا، اس قسم کی باتیں کہہ کر کسی کو شرمندہ کرنا ایک غیر انسانی فعل ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دوسرے کی عزت و حرمت کا بھی اتنا ہی لحاظ کرے جتنا وہ خود اپنی عزت و حرمت کا لحاظ کرتا ہے۔ ہر آدمی کی کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں، جن کو وہ پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ دوسرے لوگ اسے جانیں۔ جو شخص لوگوں کی ایسی باتوں کے پیچھے پڑے، وہ کھود کرید کر ان کا پتہ لگائے اور لوگوں کے درمیان ان کو پھیلائے، وہ ایک ایسا غیر اخلاقی فعل کرتا ہے جو اچھا سماج بنانے کی راہ میں مستقل رکاوٹ ہے۔

زبان کا استعمال

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــ سب سے بڑے گناہ گار وہ لوگ ہیں جو بہت زیادہ بے فائدہ باتیں کریں (اکثر الناس ذنوباً اکثرھم کلاماً فیما لا یعنیہ) جامع العلوم والحکم، صفحہ ۹۹

انسان کو جو قیمتی چیزیں دی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک نہایت قیمتی چیز زبان ہے۔ زبان کے ذریعہ آدمی بولتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ دوسروں سے تبادلۂ خیال کرتا ہے۔ زبان دوسروں سے تعلق قائم کرنے کا سب سے زیادہ اہم ذریعہ ہے۔ اس اعتبار سے زبان ایک ایسی نعمت ہے جو اس دنیا میں انسان کے سوا کسی اور کو نہیں دی گئی۔

زبان کو اگر بقدر ضرورت استعمال کیا جائے تو اس میں انسان کے لیے نہایت عظیم فائدے ہیں۔ لیکن اگر زبان کو غیر ضروری کاموں میں استعمال کیا جانے لگے تو یہ انتہائی مفید چیز انسان کے لیے ایک انتہائی مضر چیز بن جائے گی۔

زیادہ بولنے کا مطلب دوسرے لفظوں میں کم سوچنا ہے۔ جو آدمی ہر وقت بولتا رہے وہ اس سے محروم ہو جائے گا کہ وہ دوسروں کی باتیں سنے اور اس سے اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔ زیادہ بولنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر علم و فکر کی صلاحیت ترقی نہ کر سکے۔

یہ زبان کے بے ضرورت استعمال کا نتیجہ تھا۔ لیکن جب زبان کو غلط طور پر استعمال کیا جانے لگے تو اس کا نقصان اتنا زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ اس کا حساب لگانا ممکن نہیں۔

زبان کا غلط استعمال یہ ہے کہ آدمی اس کو دوسروں کی برائی کرنے میں استعمال کرے۔ وہ افواہوں کو پھیلائے اور غلط معلومات کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کرے۔ وہ زبان کے ذریعہ ایسی باتیں کرے جس سے لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے خلاف بے اعتمادی پیدا ہو۔ لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں، لوگ ایک دوسرے کے خلاف غیر ضروری شک میں مبتلا ہو جائیں۔

بے فائدہ کلام اگر زبان کی نعمت کی ناقدری ہے تو غلط کلام زبان کی نعمت کا برا استعمال ہے۔ اور خدا کی نظر میں دونوں ہی یکساں طور پر جرم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بدلہ لینا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ (اگر تم بدلہ لو تو اسی کے مثل بدلہ لو جو تمہارے ساتھ کیا گیا ہے، النحل ۱۲۶)

یہاں الفاظ بظاہر عام ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب لینا سراسر غلط ہوگا کہ کوئی شخص آپ کو گالی دے تو آپ بھی اس کے جواب میں اس کو اسی طرح گالی دینے لگیں۔ یہاں اگرچہ کوئی شرط مذکور نہیں مگر وہ یہاں مفہوم (understood) ہے۔ وہ شرط یہ کہ تم جو بدلہ لو وہ اسلامی اخلاق کے دائرہ میں ہو نہ کہ اس سے باہر۔ معروف اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی ہم اپنے کسی مخالف کا جواب دے سکتے ہیں نہ کہ معروف اسلامی اور اخلاقی حدود کے باہر۔

مثلاً اگر کسی نے ہمارے خلاف نعرہ لگایا ہے تو ہم اس کو پتھر نہیں مار سکتے۔ کسی سے ہم کو اصولی اختلاف ہے تو ہم الزام تراشی کے انداز میں اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ کسی قوم کے ایک فرد نے زیادتی کی ہے تو ہم اس قوم کے دوسرے افراد سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے۔ کسی نے الفاظ کے ذریعہ ہماری دل آزاری کی ہے تو ہم گولی اور بم سے اس کو سزا نہیں دے سکتے۔ کسی نے ہم کو مالی نقصان پہونچایا ہے تو ہم اس کو قتل کرکے اس سے انتقام نہیں لے سکتے۔

اسی کے ساتھ اس کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بدلہ لینے کی بھی ایک حد ہے۔ مومن اسلامی اخلاق کے باہر جاکر کسی سے بدلہ نہیں لے سکتا۔ مثلاً کوئی گالی دے تو وہ اس کو گالی نہیں دے گا۔ کوئی الزام تراشی کرے تو وہ اس کے جواب میں الزام تراشی نہیں کرے گا۔ کوئی شخص کمینہ پن کا انداز اختیار کرے تو وہ اس کے لیے کمینہ نہیں بن جائے گا۔

ایسے مواقع پر مومن کو بدلہ لینے کے بجائے اعراض کرنا ہے۔ مومن اسلامی اخلاق کے دائرہ میں بدلہ لے سکتا ہے۔ اگر معاملہ اسلامی اخلاق کے دائرہ کے باہر کا ہو تو وہ خود صبر کرے گا اور معاملہ کو خدا کے حوالے کرکے خاموش ہو جائے گا۔

برابر کا بدلہ لینا اسلام میں جائز ہے۔ مگر بدلہ لینا اتنا نازک کام ہے کہ جو شخص خدا سے ڈرتا ہو وہ اس کو زیادہ محفوظ طریقہ سمجھے گا کہ بدلہ لینے کے بجائے اسے معاف کر دے۔

شک سے بچیے

جو لوگ آخرت کو (یا امور غیب کو) نہیں مانتے، وہ کس نفسیات کے تحت ایسا کرتے ہیں، اس کو قرآن کی سورہ نمبر ۲۷ میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کے بارہ میں ان کا علم الجھ گیا ہے۔ بلکہ وہ اس کے بارہ میں شک میں مبتلا ہیں بلکہ وہ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں (بل ادّارك علمهم في الآخرة بل هم في شك منها بل هم منها عمون) النمل ۶۶

اس آیت میں اِدّارک کا لفظ بے حد اہم ہے۔ ادّارک کی اصل تدارک ہے۔ پھر ادغام کے اصول کے مطابق، ت کا حرف دال میں مدغم ہو گیا (لسان العرب ۱۰/۴۱۹) ادّارک یا تدارک کے ابتدائی معنی ہیں باہم مل جانا۔ قرآن میں ہے کہ حتیٰ اذا ادّارکوا فیہا جمیعاً (یہاں تک جب وہ سب لوگ اس میں اکٹھا ہو جائیں گے)

مختلف چیزیں جب اکٹھا ہوتی ہیں تو اس کا ایک نتیجہ اختلاط کی صورت میں نکلتا ہے۔ یعنی چیزیں باہم مل کر گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ادّارک میں اختلاط اور گڈمڈ ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ مذکورہ آیت میں اس لفظ کا یہی نتیجہ والا مفہوم مراد ہے۔ یعنی آخرت کے بارہ میں مختلف رایوں کی وجہ سے ان کے اندر ذہنی الجھن کی کیفیت پیدا ہوئی جو بالآخر شک اور اندھے پن تک پہنچ گئی۔

موجودہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اس مصلحت کی بنا پر یہاں التباس (الانعام ۹) کا قانون جاری ہے۔ یہاں حقیقتوں کو برہنہ صورت میں نہیں لایا جاتا بلکہ ملتبس صورت میں لایا جاتا ہے۔ کوئی حقیقت خواہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ ثابت کر دی جائے، ایک عنصر اس میں اشتباہ و التباس کا باقی رہتا ہے۔ یہی چیز شک کا باعث بنتی ہے۔ آدمی اس شک والے پہلو کو لے کر طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ایسا ہو جاتا ہے گویا وہ اندھا ہے اور اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

یہ شک کا پہلو امتحان کا تقاضا ہے۔ اس لیے وہ لازماً موجود رہے گا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر شک کے پردہ کو پھاڑے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ اس دنیا میں کبھی یقین کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔

شک سے بچیے۔ شک تمام گمراہیوں کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔

صبر و تقویٰ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کی ہے (الذاریات ۴۹) یہ فطرت کا ایک آفاقی اصول ہے۔ یہاں جب بھی کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے وہ دو چیزوں کے تعامل سے رونما ہوتا ہے۔ کوئی بھی چیز تنہا اس دنیا میں کوئی واقعہ یا نتیجہ ظاہر نہیں کر سکتی۔

اس اصول کا تعلق اجتماعی زندگی سے بھی ہے۔ اسی کو ایک پرانی مثل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ایک آدمی اپنا ہاتھ فضا میں ہلا تا رہے تو اس سے تالی نہیں بجے گی۔ تالی بجنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرا ہاتھ اس سے ٹکرائے۔ جب تک دوسرا ہاتھ نہ اٹھے تالی کا بجنا بھی رکا رہے گا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف کی ضرر رسانی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ مخالف کی ضرر رسانی کا ارادہ اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ فریق ثانی بھی اپنی نادانی یا سادہ لوحی سے اس کے ساتھ تعاون کا معاملہ کر بیٹھے۔ فریق ثانی اگر "دوسرا ہاتھ" بننے سے رک جائے تو دشمن کی مخالفانہ تالی بھی بجنے والی نہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ اہل اسلام کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کو اہل اسلام سے سخت بغض اور عداوت ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ :

وان تصبروا و تتقوا لا یضرکم کیدھم شیئا ان اللہ بما یعملون محیط (آل عمران ۱۲۰)	اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے۔

اس آیت کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ـــــ دشمن کی سازش صرف ۵۰ فی صد کی حد تک کارگر ہے۔ وہ اپنی تکمیل تک صرف اس وقت پہنچتی ہے جب کہ فریق ثانی اپنی کسی غلطی سے اس کے منصوبہ کا بقیہ ۵۰ فی صد حصہ پورا کر دے۔ صبر و تقویٰ اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے منصوبہ کا یہ بقیہ نصف حصہ دشمن کو حاصل نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تو اس کی مخالفانہ تدبیر لازمی طور پر بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔

اس قانون کے تحت اللہ تعالیٰ نے آپ کے معاملہ کو خود آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔

حدیدی کردار

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ان اللہ قوی عزیز (الحدید)

ہم نے اپنے رسول بھیجے نشانیوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتارا تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا اس میں سخت طاقت ہے اور لوگوں کے لئے فائدہ ہے۔ اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اللہ اور رسول کی بن دیکھے۔ بے شک اللہ قوی اور زبردست ہے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مادی چیزیں انسانی اخلاقیات کے لئے تمثیل کا کام کرتی ہیں۔ اوپر کی آیت میں اس سلسلہ میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک میزان (ترازو) اور دوسرے حدید (لوہا)

ترازو کیا کام کرتا ہے۔ ترازو تولنے کا ذریعہ ہے۔ کسی چیز کے متعلق جاننا ہو کہ وہ وزن میں پوری ہے یا کم ہے تو اس کو ترازو میں رکھ کر تولتے ہیں۔ اس سے اس کی حالت پوری طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ خدا کی کتاب اسی طرح انسانی اخلاقیات کے لئے ترازو ہے۔ عام ترازو چیزوں کے وزن کو بتاتا ہے اور خدا کی کتاب اعمال کے صحیح یا غلط ہونے کو۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا رویہ موجودہ دنیا میں درست رہے تاکہ وہ آخرت کی کامیابی حاصل کرے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ خدا کے ترازو سے اپنے قول و عمل کو تولتا رہے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ اگلی دنیا میں ناکام و مراد ہو کر رہ جائے گا۔

دوسری تمثیل حدید (لوہے) کی ہے۔ حدید کی معروف حیثیت کیا ہے۔ وہ قابل اعتماد شدت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جس پل یا عمارت کو لوہے پر کھڑا کیا جاتے اس کے بارہ میں پورا اعتماد رہتا ہے کہ وہ طوفانوں کے مقابلہ میں بھی پوری طرح قائم رہے گی۔ اسی قسم کے انسان خدا کے دین کی نصرت کے لئے درکار ہیں۔ خدا کے دین کی نصرت وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے اندر حدیدی کردار ہو۔ جن کے قول پر پورا اعتماد کیا جا سکے۔ جو مشکل حالات میں بھی کوئی کمزوری نہ دکھائیں، جو نفس اور شیطان کے دباؤ کے مقابلہ میں اسٹیل کی طرح بے لچک ثابت ہوں۔

شکرگزاری

عن ابی هریرة، قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم : مَن لَم یَشکرِ النَّاسَ لَم یَشکُرِ اللّٰہَ (رواہ احمد والترمذی)

ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو آدمی لوگوں کا شکر نہ کرے وہ خدا کا شکر بھی نہیں کرے گا۔

شکر ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہ کیفیت کسی آدمی کے دل میں پیدا ہو جائے تو وہ منقسم ہو کر نہیں رہ سکتی۔ اگر وہ ایک معاملہ میں ظاہر ہوگی تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اسی قسم کے دوسرے معاملہ میں ظاہر نہ ہو۔ جب آدمی ایک کا شکر گزار ہوگا تو وہ دوسرے کا بھی ضرور شکر گزار ہوگا۔

بندہ کا احسان آنکھ سے دکھائی دیتا ہے، وہ ایک براہِ راست تجربہ ہے۔ اس کے برعکس خدا کا جو احسان ہے وہ ظاہری آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا، وہ آدمی کے لیے براہِ راست تجربہ نہیں۔ خدا کے احسان کو سوچ کر جاننا پڑتا ہے۔ بندہ کے احسان کو آدمی بذریعہ مشاہدہ جانتا ہے اور خدا کے احسان کو بذریعہ تفکّر۔

جو آدمی براہِ راست مشاہدہ میں آنے والے واقعہ کا احساس نہ کر سکے، وہ ایسے واقعہ کو کیوں کر محسوس کرے گا جس کو صرف بالواسطہ غور وفکر کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

کوئی احسان کرنے والا جب احسان کرتا ہے تو آدمی اس کے احسان کا اعتراف اس لیے نہیں کرتا کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح میں محسن کے مقابلہ میں چھوٹا ہو جاؤں گا۔ حالاں کہ ایسا کر کے وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے ضمیر کی نگاہ میں چھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے نزدیک کم بن جاتا ہے۔ اور بلاشبہ اپنے ضمیر کے نزدیک کم ہونا، دوسرے کے نزدیک کم ہونے سے زیادہ سخت ہے۔

اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہے کہ بندوں کے احسان نہ ماننے سے آدمی کے اندر بے اعترافی کا مزاج بنتا ہے۔ اولاً وہ انسان کا اعتراف نہیں کرتا۔ اور اس کے بعد اس کا بگڑا ہوا مزاج اس کو یہاں تک لے جاتا ہے کہ وہ ربُّ العالمین کا بھی سچا اعتراف نہیں کر پاتا۔ اور بلاشبہ اس سے زیادہ گھاٹا اٹھانے والا اور کوئی نہیں جو اپنے رب کا اعتراف کرنے سے عاجز رہے۔

عفو و تواضع

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے جس طرح عبادت کے وہ طریقے بتائے جن کو اپنا کر آدمی خدا کی نظر میں پسندیدہ بن سکتا ہے ، اسی طرح آپ نے وہ اخلاقی اصول بھی بتائے ہیں جن کو اگر اختیار کر لیا جائے تو انسان دوسرے انسانوں کے درمیان عزت اور سربلندی کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث یہاں نقل کی جاتی ہے :

وما زاد اللہ عبداً بعفوٍ الا عزاً، وما تواضع احدٌ للہ عزوجل الا رفعہ اللہ تعالیٰ (تفسیر ابن کثیر ۴/ ۱۸۴)	اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے کی صرف عزت کو بڑھاتا ہے اور جو شخص خدا کے لیے تواضع اختیار کرے اسس کو خدا صرف اونچا ہی کرتا ہے۔

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص برائی کرے اور اس سے بدلہ نہ لیا جائے تو وہ دلیر ہو جائے گا اور پہلے سے زیادہ برائی کرے گا۔ مگر حدیث رسولؐ اس کے برعکس یہ بتاتی ہے کہ جو شخص برائی کرنے والے کو معاف کر دے تو اس کے بعد معاف کرنے والے کی عزت میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

اسی طرح عام آدمی یہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں کبھی جھکنا نہیں چاہیے۔ اگر جھکے تو لوگ اور زیادہ جھکانے کی کوشش کریں گے۔ مگر پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تواضع کا انداز اختیار کرو۔ اگر تم تواضع کا انداز اختیار کروگے تو خدا کی مدد سے تم کو اور زیادہ سربلندی حاصل ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عفو اور تواضع کا طریقہ فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ اس کے اندر انسان کو مسخر کرنے کی طاقت ہے۔ وہ انسان کو اندر سے زیر کر دینے والا ہے۔ جو شخص عفو اور تواضع کا طریقہ اختیار کرے اس نے گویا اس فطرت کو مخاطب بنایا جو ہر آدمی کے اندر اس کے خالق نے رکھ دی ہے۔ جو عین اپنی سرشت کے مطابق حق کے آگے جھکنے اور صاحب حق کا اعتراف کرنے کا مزاج رکھتی ہے۔

فطرت فریق ثانی کے اندر آپ کا نمائندہ ہے۔ جب آپ عفو اور تواضع کا طریقہ اختیار کرتے ہیں تو اپنے اس نمائندہ کو آپ اپنی حمایت میں کھڑا کر لیتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ طاقت ور حمایت کیا ہو سکتی ہے کہ خود فریق ثانی کے اندر آپ کا ایک حامی کھڑا ہو جائے۔

حکمت اسلام

زندگی کی حکمتیں اسلام کی روشنی میں

اخلاقیات

اصلاحی اور اخلاقی تعلیمات

تحقیق ضروری

عَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ جَاءَتْ اِمْرَأَةٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ عِنْدَہٗ، فَقَالَتْ زَوْجِی صَفْوَانُ بْنُ الْمُعَطَّلِ یَضْرِبُنِی اِذَا صَلَّیْتُ، وَیُفَطِّرُنِی اِذَا صُمْتُ، قَالَ وَصَفْوَانُ عِنْدَہٗ، قَالَ فَسَأَلَہٗ عَمَّا قَالَتْ، فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَمَّا قَوْلُہَا "یَضْرِبُنِی اِذَا صَلَّیْتُ"، فَاِنَّہَا تَقْرَأُ بِسُوْرَتَیْنِ وَقَدْ نَہَیْتُہَا، قَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْ کَانَتْ سُوْرَۃٌ وَاحِدَۃٌ لَکَفَتِ النَّاسَ، قَالَ وَاَمَّا قَوْلُہَا "یُفَطِّرُنِی اِذَا صُمْتُ" فَاِنَّہَا تَنْطَلِقُ تَصُوْمُ وَاَنَا رَجُلٌ شَابٌّ فَلَا اَصْبِرُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَصُوْمُ اِمْرَأَۃٌ اِلَّا بِاِذْنِ زَوْجِہَا۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک صفوان بن معطل ہیں۔ اس درمیان ایک عورت آتی ہے۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہتی ہے کہ صفوان بن معطل میرے شوہر ہیں۔ جب میں نماز پڑھتی ہوں تو وہ مجھ کو مارتے ہیں اور جب میں روزہ رکھتی ہوں تو میرا روزہ کھلوا دیتے ہیں۔

عورت کے اس بیان کے مطابق، بظاہر عورت صحیح تھی اور اس کا شوہر غلط، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شوہر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ صفوان بن معطل چوں کہ مجلس میں موجود تھے، آپ نے عورت کی شکایت کے بارہ میں ان سے دریافت کیا۔

انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، نماز کے لیے مارنے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ دو دو سورتیں پڑھتی ہے، حالاں کہ اس سے میں اس کو منع کر چکا ہوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ہی سورہ کافی ہے۔ پھر صفوان نے کہا کہ، روزہ کھلوانے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلسل روزہ رکھتی ہے اور میں جوان آدمی ہوں، صبر نہیں کر سکتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت کے لیے درست نہیں کہ وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر (نفل) روزہ رکھے۔

کسی کے خلاف شکایت کی بات معلوم ہو تو صرف سن کر اس کو نہیں مان لینا چاہیے، بلکہ تحقیق کرنا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ تحقیق کے بعد شکایت غلط ثابت ہو۔

دو طریقے

عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یؤمن أحدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ (مشکاۃ المصابیح ۱/۵۹)

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اس کی خواہش اس چیز کے تابع ہوجائے جو میں لایا ہوں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں عمل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے ھویٰ (اپنی خواہش) پر عمل کرنا، اور دوسرا ہے ماجاء بہ الرسول (پیغمبر کے لائے ہوئے دین) پر عمل کرنا۔

آپ کے سامنے ایک حق آیا۔ آپ کے دل نے گواہی دی کہ یہ حق ہے۔ مگر اسی کے ساتھ شعوری یا غیر شعوری طور پر، یہ احساس پیدا ہوا کہ اگر میں اس حق کا اعتراف کرلوں تو میرا درجہ نیچا ہوجائے گا۔ اب اگر آپ نے حق کو مان لیا تو آپ نے ماجاء بہ الرسول پر عمل کیا اور اگر آپ نے حق کا انکار کیا تو آپ نے اپنی ھویٰ کی پیروی کی۔

ایک شخص نے آپ کے اوپر تنقید کی۔ اس سے آپ کی انا کو چوٹ لگی۔ آپ برہم ہوگئے۔ اسی کے ساتھ رسول کی لائی ہوئی شریعت کا یہ حکم آپ کے سامنے آیا کہ متکبر نہ بنو بلکہ متواضع بن کر لوگوں کے درمیان رہو۔ اب اگر آپ نے تنقید کے جواب میں تواضع کا انداز اختیار کیا تو آپ نے ماجاء بہ الرسول پر عمل کیا اور اگر آپ نے تنقید کے جواب میں گھمنڈ کا انداز اختیار کیا تو آپ نے ھویٰ کی پیروی کی۔

ایک شخص کے کسی رویہ سے آپ کو شکایت پیدا ہوئی۔ آپ مشتعل ہوگئے۔ اس وقت آپ کے سامنے شریعت کا یہ حکم آیا کہ لوگ اشتعال انگیزی کریں تب بھی تم صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ اب اگر آپ نے اشتعال کے باوجود صبر کیا تو آپ نے ماجاء بہ الرسول پر عمل کیا۔ اور اگر آپ مشتعل ہوکر فریق ثانی سے لڑنے لگے تو آپ نے ھویٰ کی پیروی کی۔

یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ ہر معاملہ جو آدمی کے ساتھ پیش آتا ہے، اس میں اس کے لیے دو میں سے ایک رویہ اختیار کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ ایک رویہ اختیار کرنے کے بعد وہ خدا کے یہاں مومن لکھ دیا جاتا ہے اور دوسرا رویہ اختیار کرنے کے بعد غیر مومن۔

اخلاقی انحراف

ہر انسان اپنی اندرونی شخصیت کے اعتبار سے انسان ہے، خواہ بظاہر وہ کچھ بھی دکھائی دیتا ہو۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے تمام انسانوں کو صحیح اور درست فطرت پر پیدا کیا ہے (الروم ۳۰)
یہی بات حدیث میں اس طرح آئی ہے :

ما مِن مولود الاّ یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ وینصرانہ ویمجسانہ۔	ہر آدمی جو پیدا ہوتا ہے وہ فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی اور نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کی فطرت صرف خدا کے مطلوب دین کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے، وہ پیدائشی طور پر اس کی طرف مائل ہے۔ کوئی شخص جب کسی غیر مطلوب دین کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی فطرت سے منحرف ہو کر ایسا کرتا ہے، ایسا اختیار اس کے لیے مذہبی انحراف کے ہم معنی ہے۔

یہی بات انسانی اور اخلاقی پہلو سے بھی درست ہے۔ آدمی پیدائشی طور پر انسانی قدروں کا تصور لیے ہوئے ہے۔ تخلیقی اعتبار سے وہ ایک با اخلاق انسان ہے۔ وہ حق کا اعتراف کرنے والا ہے۔ دوسروں کے لیے اس کے دل میں خیر خواہی کا جذبہ موجود ہے۔ وہ دوسروں کو سکھ پہنچانا چاہتا ہے۔ دوسروں کے لیے نفع بخش بننا اس کے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی جب دوسروں کے ساتھ برائی کرتا ہے تو یہ اس کے لیے اپنی فطرت کی خلاف ورزی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس قسم کا ہر فعل آدمی کے لیے گویا اخلاقی انحراف ہے۔

جب صورت حال یہ ہے تو آپ کے لیے دوسروں کے ضرر سے بچنے کی آسان تدبیر یہ ہے کہ اس کو اخلاقی انحراف میں مبتلا ہونے سے بچائیں۔ اس کو اپنے فطری اخلاق پر رہنے دیں۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر آپ کا دوست ہے۔ وہ دشمن صرف اس وقت بنتا ہے جبکہ اس کو اس کی فطرت سے ہٹا دیا جائے۔

قرآن و حدیث کی شہادت کے مطابق، ہر آدمی ایک ہی فطرت پر پیدا ہوا ہے۔ ہر آدمی اپنے اندر صحیح شخصیت لیے ہوئے ہے۔ اس فطری شخصیت کے اوپر سے اس کا پردہ ہٹا دیجئے، اور پھر ہر آدمی آپ کا مطلوب انسان ہوگا۔

بدگمان کرنا

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک خدا نے ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون اور اس کی آبرو کو حرام کر دیا ہے اور یہ بھی حرام کیا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے بارہ میں برا گمان کرے (ان اللہ حرّم من المسلم دمه وعرضه وان يظنّ به ظنّ السوء، تفسیر قرطبی)

اس قسم کی ہدایات کا نتیجہ یہ تھا کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب گمان قائم کرنے کے بارہ میں بے حد حساس تھے۔ وہ اس معاملہ میں آخری حد تک احتیاط برتتے تھے کہ کسی کے بارہ میں غلط گمان اپنے ذہن میں قائم کرلیں۔ حسن بصری تابعی نے بعد کے لوگوں سے کہا کہ پہلے ہم ایسے زمانہ میں تھے کہ بدگمانی کو حرام سمجھا جاتا تھا۔ اور آج بدگمانی اتنی ہلکی چیز بن گئی ہے کہ تم کسی کے بارہ میں جو غلط رائے چاہو قائم کرلو (كنّا في زمن الظن بالناس فيه حرام وانت اليوم في زمن ظنّ في الناس ما شئت)

بدگمانی اکثر اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ ایک واقعہ کو غلط رنگ دیدیا جاتا ہے۔ ایک بار حضرت سلمان فارسی اور ان کے دو ساتھیوں کو کھانے کی ضرورت پیش آئی۔ ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ موجود نہ تھا۔ حضرت سلمان فارسی حضرت اسامہ کے پاس گیے جو پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے خازن تھے۔ حضرت سلمان نے ان سے کھانا طلب کیا۔ مگر اتفاق سے اس وقت سب کھانا ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ کوئی کھانے کی چیز انھیں نہ دے سکے۔ حضرت سلمان جب اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف لوٹے اور ان کو قصہ بتایا تو دونوں نے کہا کہ اسامہ کے پاس کھانا موجود تھا مگر انھوں نے بخل سے کام لیا (قد كان عنده ولكنه بخل) تفسیر القرطبی ۳۳۱/۸

مذکورہ دونوں افراد اگر حضرت اسامہ کے انکاری جواب کو عذر پر محمول کرتے تو وہ بدگمانی میں نہ پڑتے۔ مگر انھوں نے ان کے جواب کو بخل سمجھا اس لیے وہ ایک صالح انسان کے بارہ میں بدگمانی میں پڑ گیے۔ اس طرح کی بدگمانی اسلام میں سراسر حرام ہے۔ آدمی پر لازم ہے کہ اس طرح کے معاملات میں وہ اپنے بھائی کے بارہ میں اچھی رائے قائم کرے ورنہ خاموش رہے۔ اس کے سوا کوئی تیسرا رویہ اس کے لیے درست نہیں۔

دل جیتنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب توحید کا مشن اٹھایا تو عرب میں آپ کی بہت زیادہ مخالفتیں کی گئیں۔ آپ کے خلاف ہر قسم کا تشدد کیا گیا۔ لیکن آپ نے ان کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اس کے بجائے آپ نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تاکہ ان کا دل جیت سکیں۔

آپ کا وطن مکہ تھا۔ مکہ والوں نے آپ کے خلاف ظلم و زیادتی کر کے آپ کو اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ آپ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ مکہ پر آپ کا قبضہ ہو گیا۔ اس وقت مکہ کے مخالفین آپ کے سامنے لائے گئے۔ وہ سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔ مگر آپ نے ان کو کسی قسم کی کوئی سزا نہیں دی بلکہ سب کو عزت کے ساتھ آزاد کر دیا۔ اس سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب کے سب لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔

اسی طرح قبیلۂ ہوازن کے لوگوں نے سرکشی کر کے آپ کے اوپر حملہ کر دیا۔ ان سے جنگ کی نوبت آگئی۔ اسلام کی تاریخ میں اس کو حنین کی جنگ کہا جاتا ہے۔ آخر میں آپ کو فتح حاصل ہوئی۔ اور ہوازن کے لوگ چھ ہزار کی تعداد میں گرفتار ہو کر آپ کے سامنے لائے گئے۔ ان کے ساتھ بھی آپ نے انتقام کا معاملہ نہیں کیا۔ بلکہ سب کو عزت کے ساتھ رہا کر دیا۔ اس اعلیٰ اخلاق کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ پورے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا۔

انتقام لینا، سبق سکھانا، اسلام کا طریقہ نہیں۔ اس طرح کی کارروائی سے مسئلہ اور زیادہ بڑھتا ہے۔ مگر جب برے سلوک کے جواب میں اچھا سلوک کیا جائے تو آدمی اندر سے مفتوح ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام دل جیتنا ہے۔ اور دل جیتنے کا طریقہ ہمیشہ زیادہ طاقت ور ثابت ہوتا ہے، خواہ انفرادی معاملہ ہو یا اجتماعی معاملہ۔

انتقام کا طریقہ پورے سماج کو منفی کارروائیوں کا جنگل بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس دل جیتنے والا طریقہ پورے سماج میں اخلاق اور انسانیت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ انتقام سے مسئلہ صرف بڑھتا ہے۔ جبکہ دل جیتنے والا طریقہ مسئلہ کو آخری حد تک ختم کر دیتا ہے۔

حکمت کا سرچشمہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— جب بھی کوئی بندہ دنیا سے بے رغبتی اختیار کرتا ہے تو خدا اس کے دل میں حکمت اُگا دیتا ہے۔ اور اس کی زبان پر حکمت جاری کر دیتا ہے۔ اور اس کو دنیا کا عیب اور اس کا مرض اور اس کا علاج دکھا دیتا ہے، اور اس کو حفاظت کے ساتھ سلامتی کے گھر تک پہنچا دیتا ہے (ما زهد عبدٌ في الدنيا إلا أنبت الله الحكمة في قلبه، وانطق بها لسانه، وبصّره عيب الدنيا وداءها ودواءها، واخرجه منها سالماً الى دار السلام) البیہقی بحوالہ مشکاۃ المصابیح، صفحہ ۱۴۳۵

حکمت کیا ہے، حکمت دراصل حقیقت پسندی اور دور اندیشی کا دوسرا نام ہے۔ کسی شخص کا ذہنی ارتقار جب اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ مسائل کا بے لاگ جائزہ لے سکے اور ان کے بارہ میں گہری بنیادوں پر فیصلہ کرنے لگے تو اسی کا نام حکمت ہے۔

اس حکمت کا سرچشمہ دنیا سے بے رغبتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے اوپر دنیا کی کسی چیز کی محبت اتنی غالب آتی ہے کہ وہ اس کو باتوں کی حقیقت سمجھنے کے لیے اندھا بہرا بنا دیتی ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی تجربہ اس کو کچھ لوگوں کے معاملہ میں بغض کی نفسیات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے بغض کی بنا پر اس قابل نہیں رہتا کہ وہ معاملہ کو اس کی اصل صورت میں دیکھ سکے۔

جو آدمی اس قسم کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھے جیسا کہ وہ ہیں۔ وہ ان کے بارے میں وہی رائے قائم کرے جو از روئے حقیقت ہونا چاہیے۔ ان کے مقابلہ میں وہ وہی صحیح ترین روش اختیار کرے جو حق اور انصاف کا تقاضا ہے۔

زہد یا دنیا سے بے رغبتی آدمی کو بے پناہ بنا دیتی ہے۔ ایسا آدمی عقلی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ انسان ہوتا ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ حقیقت پسند ہوتا ہے اور اپنے اقدام کے بارے میں سنجیدہ اور محتاط۔ جو لوگ اس بلند کردار کے حامل ہوں ان کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ دنیا میں بھی کامیاب ہوں اور آخرت میں بھی کامیاب۔

زہد ترکِ دنیا نہیں، وہ ذہنی ارتقار کا ذریعہ ہے۔

حالات کی رعایت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی تو آپ کو خدا کی طرف سے حکم دیا گیا کہ ایک خدا کی عبادت کرو اور خدا کے پیغام کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا کہ فوراً کھلے مقامات پر جائیں، سب کے سامنے نماز پڑھیں یا بلند آواز سے لوگوں کو خدا کی طرف پکارنا شروع کر دیں۔ اس کے برعکس آپ نے ابتدائی چند سال تک چھپ کر نماز پڑھی اور انفرادی ملاقاتوں کے ذریعہ خفیہ انداز میں تبلیغ کی۔

یہ حالات کی رعایت تھی۔ حالات کی رعایت اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔ قرآن و حدیث میں کوئی حکم مطلق انداز میں دیا گیا ہو تب بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ ہمارے حالات کے لحاظ سے اس کی تعمیل کا حکیمانہ طریقہ کیا ہے۔ حالات کے اعتبار سے جو قابل عمل صورت ہو اسی کے مطابق حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے آزادانہ انداز اختیار کرنا نہ اسلام کا طریقہ ہے اور نہ پیغمبر اسلام کی سنت۔

اس طریقہ کو دوسرے الفاظ میں فطری طریقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس دنیا میں کسی بھی معاملہ میں نتیجہ خیز جدوجہد وہی ہو سکتی ہے جس میں حالات کی پوری رعایت شامل ہو۔ حالات کی رعایت نہ کرنا فطرت سے ٹکرانا ہے اور فطرت سے ٹکرانے کی تعلیم اسلام میں نہیں دی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری ۲۳ سال کی پیغمبرانہ مدت میں اسی طرح حالات کی رعایت سے کام کیا۔ آئندہ بھی آپ کے ماننے والوں کے لیے یہی صحیح طریقہ ہے کہ وہ جس ماحول میں ہوں اس کو سمجھیں اور اس کو بخوبی سمجھ کر حالات کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔ اس کے بغیر انھیں خدا کی نصرت نہیں مل سکتی۔

حالات کی رعایت، دوسرے لفظوں میں فطرت کی رعایت ہے۔ اس دنیا کے خالق نے جس قانون کے تحت اپنی دنیا کو بنایا ہے، اس سے مطابقت کرنے کا نام حالات کی رعایت ہے۔ یہ رعایت کسی مقصد میں کامیابی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے، خواہ وہ مقصد دین سے تعلق رکھتا ہو یا دنیا سے۔

نظرانداز کرنا

پیغمبر اسلام مکہ میں ۱۳ سال رہے۔ اس مدت میں وہ تقریباً روزانہ کعبہ میں جاتے تھے۔ وہاں اس وقت ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ یہ عربوں کے مختلف قبائل میں پوجے جانے والے بت تھے۔ مکہ کی مرکزیت قائم کرنے کے لیے اہل مکہ کے سرداروں نے یہ تمام بت کعبہ میں اکٹھا کر دیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ ان کو دیکھتے تھے مگر مکی دور میں کبھی آپ نے ان کو توڑنے یا پھینکنے کی کوشش نہیں کی۔

اس سے اسلام کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ وقت سے پہلے کوئی کام نہ چھیڑا جائے۔ مکی دور میں آپ نے ان بتوں کو نظرانداز کیا۔ مگر بعد کو جب مکہ فتح ہو گیا تو آپ نے فوراً ان کو نکال کر کعبہ کو ان مشرکانہ علامتوں سے پاک کر دیا۔

اسلام میں اقدام کرنا بھی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اسلام میں نظرانداز کرنا بھی ہے۔ اقدام کے وقت اقدام کرنا ضروری ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ جہاں اقدام کا موقع نہ ہو وہاں سختی کے ساتھ نظرانداز کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ خواہ بظاہر وہ کتنا ہی سنگین یا اشتعال انگیز معاملہ کیوں نہ ہو۔

حال میں کسی مسئلہ کو اعراض کے خانہ میں ڈالنا مستقبل میں اس کے حل کا دروازہ کھولنا ہے۔ اور بے وقت اقدام کرنا حال اور مستقبل دونوں میں صرف نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

نظرانداز کرنے کی پالیسی دراصل انتظار کرنے کی پالیسی کا دوسرا نام ہے۔

نظرانداز کرنا ایک دانش مندانہ پالیسی ہے۔ نہ کہ کسی قسم کی بزدلی۔ نظرانداز کرنا دوسرے لفظوں میں نظام فطرت سے مطابقت ہے۔ اور نظرانداز نہ کرنا، نظام فطرت کے خلاف جنگ۔ کوئی شخص یا گروہ اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ فطرت سے لڑ کر کامیاب ہو سکے۔ اس دنیا میں ہر ایک کے لیے صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ نظام فطرت سے مطابقت رکھنا ہے۔ اس کے بغیر موجودہ دنیا میں کسی کے لیے حقیقی کامیابی ممکن نہیں۔

نظرانداز کرنا بے عملی نہیں، نظرانداز کرنا باعمل انسان کا ایک اصول ہے۔

کرائٹیرین کا مسئلہ

کرائٹیرین (معیار) کا مسئلہ بے حد اہم مسئلہ ہے۔ بیشتر فکری گمراہیاں صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ لوگوں کے ذہن میں کرائٹیرین واضح نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو صحیح سمجھ رہا ہوتا ہے حالاں کہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو جانچنے کے لیے غلط کرائٹیرین استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی بات کو درست کرائٹیرین پر جانچے تو وہ جان لے گا کہ اس کی سوچ صد فی صد غلط ہے۔

مثال کے طور پر خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ نے جب حضرت عمر فاروقؓ کو امیر المومنین مقرر کیا تو بیشتر صحابہ اس رائے سے اتفاق نہ کر سکے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ عمر ایک سخت گیر انسان ہیں اور سخت گیر انسان کو امیر المومنین نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ سخت گیر ہیں مگر "سریرتہ خیر من علانیتہ" ان کا اندر ان کے باہر سے بہتر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ عمر فاروق کی امارت کے مخالف تھے وہ اپنی رائے کے حق میں غلط کرائٹیرین استعمال کر رہے تھے۔ امیر کے لیے اصل کرائٹیرین یہ نہیں ہے کہ وہ سخت ہے یا نرم۔ اس کے بجائے اصل کرائٹیرین یہ ہے کہ وہ نیک نیت ہو۔ وہ خدا سے ڈرنے والا ہو۔ وہ اپنے اندر بصیرت کی صفات رکھتا ہو۔ وہ حق اور ناحق میں فرق کرنا جانتا ہو۔

صحیح کرائٹیرین (معیار) کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خلافت کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کا انتخاب نہایت درست تھا۔ کیوں کہ خلیفہ کی سب سے اہم صفت اس کا مدبر ہونا ہے، اور یہ صفت ان کے اندر پوری طرح موجود تھی۔ اس کے برعکس اگر اس معاملے کو غلط کرائٹیرین سے دیکھا جائے تو ایک شخص کہے گا کہ خلافت کے لیے عمر فاروق کا انتخاب درست نہ تھا کیوں کہ ان کے مزاج میں بہت زیادہ شدت تھی۔ حالاں کہ یہ کرائٹیرین ہی اس معاملے میں بجائے خود درست نہیں۔

جیسا کام ہو ویسی ہی اہلیت درکار ہوتی ہے۔

اقدام کب

اسلامی شریعت کا ایک اہم اصول وہ ہے جس کو سدّ الذرائع کہا جاتا ہے۔ یعنی برائی پیدا ہونے والے اسباب کو روکنا۔ قرآن (الانعام ۱۰۸) کی ہدایت کے تحت علمار اسلام کا اتفاق ہے کہ اگر حالات ایسے ہوں کہ ایک جائز کام کو کرنے سے ایک زیادہ بڑی برائی پیدا ہوتی ہو تو لازم ہے کہ مسلمان ایسے جائز کام سے باز رہیں:

إن المحقَّ يكفُّ عن حقٍّ له إذا أدّى الى ضررٍ
(الجامع لاحکام القرآن ۴/۶۱)

حق دار اپنے حق سے رکا رہے گا جبکہ وہ ایک ضرر پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اقدام صرف اس بنا پر صحیح نہیں ہو جاتا کہ بظاہر وہ حق کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ اس طرح کے معاملے میں یہ دیکھنا لازمی طور پر ضروری ہے کہ اقدام کا عملی نتیجہ کیا نکلے گا۔ جو اقدام عملاً منفی نتیجہ ظاہر کرے۔ وہ ایک غیر مطلوب اقدام ہے، خواہ نظری طور پر وہ کتنا ہی زیادہ مطلوب نظر آتا ہو۔

ایک شخص اسلام کے خلاف گستاخی کرے، لیکن حالات کے اعتبار سے یہ اندیشہ ہو کہ اس کے خلاف کارروائی کرنا شدید تر برائی پیدا کرنے کا سبب بن جائے گا، تو ایسے موقع پہ لازم ہوگا کہ گستاخی کے خلاف خاموشی کا رویہ اختیار کیا جائے۔

ایک شخص آپ کو ایک چھوٹا نقصان پہنچائے، اور حالات بتاتے ہوں کہ اس کے خلاف جوابی کارروائی کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زیادہ بڑی برائی کا سامنا پیش آ جائے گا، تو ایسی حالت میں چھوٹی برائی کو برداشت کر لیا جائے گا تاکہ زیادہ بڑی برائی کو برداشت کرنے کی نوبت نہ آئے۔

ایک شخص علی الاعلان آپ کے خلاف ہنگامہ کھڑا کرے، اور حالات کے اعتبار سے یقینی نظر آتا ہو کہ اگر آپ نے جوابی کارروائی کی تو ہنگامہ بڑھ کر جان و مال کی تباہی تک پہنچ جائے گا، ایسی حالت میں ضروری ہوگا کہ پرشور کارروائی کا جواب خاموش کارروائی کے ذریعے دیا جائے تاکہ نقصان کو اس کی ابتدائی حد پر روکا جا سکے —— یہ اسلام کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے۔ اسلامی عمل وہی ہے جس میں اس حکمت کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہو۔

فرصت عمل

جب بھی زیادہ لوگ ساتھ مل کر زندگی گزاریں گے تو ان کے درمیان شکایت اور اختلاف کے واقعات بھی ضرور پیدا ہوں گے۔ ایسا ایک گھر کے اندر ہوگا، سماج کے اندر ہوگا، پورے ملک میں ہوگا، اور اسی طرح بین اقوامی زندگی میں بھی ہوگا۔ انسان خواہ جس سطح پر بھی ایک دوسرے سے ملیں اور تعلقات قائم کریں، ان کے درمیان ناخوش گوار واقعات کا پیش آنا بالکل لازمی ہے۔

ایسی حالت میں کیا کیا جائے، ٹالرنس اسی سوال کا جواب ہے۔ ایسی حالت میں ایک شخص دوسرے شخص کے ساتھ اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ رواداری اور برداشت کا معاملہ کرے۔ مل جل کر زندگی گزارنے اور مل جل کر ترقی کرنے کی یہی واحد قابل عمل صورت ہے۔ اس اسپرٹ کے بغیر انسانی تمدن کی تعمیر اور اس کی ترقی ممکن نہیں۔

ٹالرنس کوئی انفعالی رویہ نہیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی کے لیے زیادہ بہتر چوائس لینے کا موقع تھا اور اس نے کمتر چوائس کو اختیار کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں اس کے سوا کوئی اور چوائس ہمارے لیے ممکن ہی نہیں۔ ٹالرنس ہماری ایک پریکٹیکل ضرورت ہے نہ کہ انفعالی پسپائی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک صورت حال کو اپنے لیے ناخوش گوار پاکر اس سے لڑنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری جدوجہد موجودہ صورت حال کو ہٹا کر دوسری زیادہ پسندیدہ صورت کو لانے کی جدوجہد ہے۔ مگر جب موجودہ صورت حال ختم ہوتی ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صورت حال میں بھی دوبارہ اسی قسم کا ناخوش گوار پہلو موجود ہے جس کو برداشت نہ کرنے کی بنا پر وہ اس سے لڑ گیا تھا۔

ٹالرنس کا طریقہ ہم کو فرصت عمل دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہم ناموافق حالات سے ایڈجسٹ کر کے اپنی زندگی کا سفر جاری رکھیں۔ اس کے برعکس اگر ہم ٹالرنس کو چھوڑ دیں اور جو چیز بھی ہم کو ناموافق نظر آئے اس سے لڑنے لگیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ہم ایک چیز کو "برائی" کے نام سے ختم کریں گے، صرف اس لیے کہ اس کے بعد ایک اور شدید تر برائی میں اپنے کو مبتلا کر لیں۔

تغییر منکر

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ (صحیح البخاری) یعنی تم میں سے جو شخص منکر کو دیکھے تو وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے۔
اب ایک اور حدیث دیکھئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ قریش نے جب کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی تو انھوں نے اس کو ابراہیمی بنیاد سے گھٹا کر بنایا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپ اس کو ابراہیمی بنیاد کی طرف کیوں نہیں لوٹا دیتے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر قریش ابھی نئے نئے مسلمان نہ ہوئے ہوتے تو میں ایسا کر دیتا (فتح الباری ۵۱۳/۳)

ان دونوں حدیثوں کا تقابلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تغییر منکر کا حکم مطلق معنوں میں نہیں ہے بلکہ وہ ایک مقید حکم ہے۔ اگر وہ کوئی مطلق حکم ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور ایسا کرتے کہ مشرکین مکہ نے کعبہ کی تعمیر ثانی میں جو تبدیلی کی تھی اس کو ختم کر کے دوبارہ اس کو حضرت ابراہیمؑ کی ابتدائی اساس پر کھڑا کرتے۔

اس تقابلی مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تغییر منکر میں صرف "استطاعت" ہی کی شرط نہیں ہے بلکہ حکمت کی شرط بھی ہے۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے حکمراں ہو چکے تھے۔ آپؐ کو یہ استطاعت حاصل ہو چکی تھی کہ آپؐ کعبہ کو ڈھا کر اسے ابراہیمی بنیاد پر تعمیر کر دیں۔ مگر آپؐ نے استطاعت کے باوجود ایسا نہیں کیا، کیوں کہ، حدیث کے الفاظ میں، ایسا کرنا حکمت کے خلاف ہوتا۔

تغییر منکر کے حکم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی جب کسی منکر کو دیکھے تو فوراً اس کے خلاف اقدام شروع کر دے۔ اجتماعی زندگی میں کوئی اقدام صرف برائی کو دیکھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ حالات کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ مومن پر لازم ہے کہ جب وہ کسی منکر کو دیکھے تو اس کے خلاف اقدام سے پہلے یہ سوچے کہ میرے اندر اس کی حقیقی استطاعت ہے یا نہیں، اور اگر بظاہر استطاعت ہو تب بھی ایسا کرنا حکمت کے مطابق ہے یا نہیں۔ استطاعت اور حکمت کی دوگونہ شرط کا لحاظ کیے بغیر تغییر منکر کے لیے اٹھنا فساد ہے نہ کہ اسلامی حکم کی تعمیل۔

دوقسمی طرزِ فکر

بیسویں صدی کے نصف اول میں کمیونسٹ دنیا کا عام طرزِ فکر یہ تھا کہ جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے۔ اس طرزِ فکر کو نفسیات کی اصطلاح میں دوقسمی طرزِ فکر (dichotomous thinking) کہا جاتا ہے۔ یہ طرزِ فکر ہلاکت خیزی کی حد تک غلط ہے چنانچہ تقریباً پچاس سال تک تمام کمیونسٹ اس حماقت میں مبتلا رہے کہ جہاں انھیں اقتدار حاصل تھا وہاں وہ ہر غیر ساتھی کو تہہ تیغ کرتے رہے۔ سابق سوویت یونین میں انھوں نے ۲۵ ملین انسانوں کو ذبح کر ڈالا اور بے شمار خاندانوں کی زندگیاں تباہ کر دیں۔

اس کے علاوہ جن ملکوں میں انھیں اقتدار حاصل نہ تھا وہاں انھوں نے اپنے غیر ساتھیوں کے خلاف لامتناہی قسم کی لفظی جنگ چھیڑ دی۔ تمام غیر ساتھیوں پر جھوٹی تنقیدیں کرنا، ان کی کردارکشی کرنا، ان کے خلاف جھوٹا لٹریچر چھاپنا، ان کے خلاف ہر الزام کو اپنا حق سمجھ لینا، یہ ان کا شیوہ بن گیا۔ اس راہ میں انھوں نے اپنی بہترین صلاحیت اور بہترین اثاثہ کو ضائع کر دیا۔

یہ طرزِ فکر سراسر غیر فطری ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ انسان کی سوچ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ آج وہ ایک ڈھنگ پر سوچتا ہے اور کل وہ دوسرے ڈھنگ پر سوچنے لگتا ہے۔ معلومات میں اضافہ اور نئے دلائل سے واقفیت، اس طرح کے اسباب آدمی کے ذہن کو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ انسان کوئی جامد اسٹیچو نہیں ہے۔ وہ ایک زندہ ہستی ہے۔ وہ بار بار خارجی اثرات کو قبول کرتا ہے۔

کوئی انسان یا کوئی گروہ اگر بظاہر آپ کا مخالف نظر آئے تو آپ اس کو مستقل طور پر اپنا مخالف نہ سمجھ لیجیے بلکہ اس کی مخالفت کو کم علمی یا غلط فہمی پر محمول کیجیے۔ اگر آپ ایسا کریں تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے بارے میں آپ کے اندر ہمدردی کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ آپ اس سے دور ہونے کے بجائے اس سے قریب ہونے کی کوشش کریں گے۔ اس کے معاملے پر غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اس کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد، قرآن کے الفاظ میں، آپ دیکھیں گے کہ جو شخص بظاہر آپ کا دشمن نظر آتا تھا وہ آپ کا قریبی دوست بن گیا (فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم)

فطرت کا نظام

کامیابی نام ہے خدا کے مقرر کیے ہوئے فطری نظام سے مطابقت کرنے کا ——— یہی ایک لفظ میں زندگی کا راز ہے۔ خواہ وہ فرد کی زندگی کا معاملہ ہو یا سماج اور ریاست کا معاملہ۔

یہ دنیا جس میں ہم اپنے آپ کو پاتے ہیں وہ ہم نے خود نہیں بنائی ہے۔ اور نہ اس کو بنانے والے نے ہمارے مشورہ کے مطابق اس کو بنایا ہے۔ یہ دنیا کچھ محکم اصولوں پر بنائی گئی ہے۔ اور وہ انہی اصولوں کے تحت چل رہی ہے، اور اسی طرح وہ ہمیشہ چلتی رہے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہماری حیثیت ثانوی ہے۔ ہمیں یک طرفہ طور پر دنیا کے نظام سے موافقت کرنا ہے۔ موافقت نہ کرنے کی صورت میں، نقصان اٹھانے والے فریق ہم خود ہوں گے نہ کہ بقیہ دنیا۔

ایک کسان اپنے کھیت سے اسی وقت ہری بھری فصل حاصل کرتا ہے جب کہ وہ فطرت کے مقرر کیے ہوئے قانون زراعت کی کامل پابندی کرتا ہے۔ اسی طرح ایک انجینیر اسی وقت کوئی ٹکنیکل کارنامہ انجام دیتا ہے جب کہ وہ فزکس اور کیمسٹری کے قوانین فطرت کو پوری طرح استعمال کرے۔ وغیرہ۔

ٹھیک یہی معاملہ انسانی دنیا کا ہے۔ انسانی دنیا کے لیے بھی اسی طرح فطرت کے مقرر قوانین ہیں۔ یہاں بھی کوئی کامیابی صرف اس فرد یا قوم کے لیے مقدر ہے جو ان اصولوں کی پابندی کرے، جو فطرت نے پیشگی طور پر اس کے لیے قائم کر دیا ہے۔ کوئی بھی انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ فطرت کے قانون کو نظر انداز کرکے اس دنیا میں اپنے لیے ایک کامیاب زندگی کی تشکیل کر سکے۔ فطرت کے نقشہ میں جو چیز محنت سے ملتی ہو اس کو ہم رعایت کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے، جو چیز صبر کا ثبوت دے کر ملتی ہو اس کو ہم عاجلانہ اقدام کے ذریعہ نہیں پا سکتے۔ جس چیز کا ملنا امن کی طاقت کے ساتھ مقدر کیا گیا ہے اس کو ہم تشدد کی طاقت کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔ جو چیز تدریج کے ذریعہ ملنے والی ہو اس کو ہم چھلانگ کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔

کائناتی کلچر

میل ملاپ کوئی سادہ بات نہیں۔ وہ ہر قسم کی انسانی ترقی کا زینہ ہے۔ جس سماج میں لوگوں کے درمیان ملنا جلنا نہ ہو وہاں ہر ایک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ کوئی بھی شخص یا گروہ زیادہ آگے بڑھنے میں کامیاب نہیں ہو گا۔

میل ملاپ (interaction) فطرت کا قانون ہے۔ وہ ساری کائنات میں ہر طرف جاری ہے۔ درخت ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے تو خدا نے ان کے درمیان ہوائیں چلا دیں جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں۔ خلا کے ستارے ایک دوسرے سے بہت دور ہیں، ان کا آپس میں جسمانی طور پر ملنا ممکن نہیں، خدا نے انھیں روشنی دے دی۔ چنانچہ وہ روشنی کے ذریعہ ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹیوں سے جاری ہونے والے چشمے سمندر سے بہت دور تھے مگر خدا نے ان کے لیے بہاؤ کی صورت پیدا کر دی۔ اس طرح یہ چشمے دریاؤں میں بہتے ہوئے سمندر میں جا کر مل جاتے ہیں۔

میل ملاپ ایک یونیورسل کلچر (کائناتی طریقہ) ہے۔ یہی یونیورسل کلچر انسان کو بھی اختیار کرنا ہے۔ جس طرح بقیہ کائنات کا نظام درست طور پر باہمی ہم آہنگی کے ذریعہ چل رہا ہے، ٹھیک اسی طرح انسانی زندگی کا نظام بھی درست طور پر اس وقت چل سکتا ہے جب کہ انسان بھی اس کائناتی کلچر کو اختیار کرے (آل عمران ۸۳)

دو انسان یا زیادہ انسان جب باہم ملتے ہیں تو یہ پتھروں کا باہم ملنا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایسی مخلوق کا ملنا ہوتا ہے جس کے اندر دل اور دماغ والی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کا آپس میں ملنا جلنا مختلف قسم کے عظیم فائدوں کا سبب بن جاتا ہے۔ اس طرح باہمی محبت بڑھتی ہے۔ یہ عمل ذہنی ارتقاء میں مددگار بنتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے تجربات سے نئی نئی باتیں سیکھتے ہیں۔ ہر فرد انسانیت کے مجموعی خزانے میں حصہ دار بن جاتا ہے۔ میل ملاپ صرف ایک سماجی سلوک نہیں۔ وسیع تر معنیٰ میں، وہ زندگی کی ایک عظیم تر حکمت ہے۔

راستہ تنگ نہیں

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ سے طائف جا رہے تھے۔ درمیان میں ایک پہاڑی راستہ ملا جو بظاہر تنگ تھا۔ وہاں پہنچ کر آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے، لوگوں نے بتایا کہ اس کو تنگ راستہ کہا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ یہ آسان راستہ ہے (بل ھی الیسریٰ)

اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ صحیح ہے کہ بطور واقعہ یہ راستہ تنگ ہے۔ اگر ہم پھیل کر اس میں جانا چاہیں تو ہم نہیں جا سکیں گے لیکن ہم اس طرح اس کو آسان بنا سکتے ہیں کہ ہم سمٹ کر قطار کی صورت میں اس سے گزریں۔ ایسی صورت میں راستہ کی تنگی ہمارے لیے رکاوٹ نہیں بنے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبرانہ نگاہ یہ ہے کہ تنگی کو بھی کشادگی کے روپ میں دیکھا جائے۔ تنگی میں بھی کشادگی کا راز دریافت کیا جائے۔ منفی باتوں میں بھی مثبت پہلو تلاش کر لیے جائیں۔

تنگی بذات خود تنگی ہے۔ راستہ کی چٹان ہر حال میں چٹان ہی رہتی ہے۔ جو فرق ہے وہ خود تنگی یا چٹان میں نہیں ہے بلکہ اس میں ہے کہ جب کوئی تنگ راستہ سامنے آجائے یا چٹان حائل ہو تو اس وقت طریق عمل کیا اختیار کرنا چاہیے۔

ایک طریقہ براہ راست مقابلہ کا ہے اور دوسرا اعراض کا۔ براہ راست مقابلہ میں تنگی اور چٹان بدستور تنگی اور چٹان بنے رہتے ہیں مگر اعراض کا طریقہ ان کے وجود کو عملی طور پر غیر موثر بنا دیتا ہے۔

جب بھی ایسا ہو کہ آپ کے سفر میں کوئی رکاوٹ پیش آجائے تو اس سے ٹکرانے پر اپنا ذہن نہ لگائیے بلکہ یہ سوچیے کہ رکاوٹ کو نظر انداز کر کے آپ کون سا ایسا حل پا سکتے ہیں جس کے بعد رکاوٹ اپنی جگہ باقی رہتے ہوئے بھی آپ کے لیے ایک غیر موجود چیز بن جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر راستہ تنگ ہی ہوتا ہے۔ تنگی اور کشادگی دونوں اضافی چیزیں ہیں۔ حقیقی چیز صرف ایک ہے اور وہ تدبیر ہے۔ اور تدبیر مکمل طور پر اور ہمیشہ مسافر کے بس میں ہوتی ہے۔

تھرڈ آپشن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی دور میں ایک جنگ وہ پیش آئی جس کو جنگ موتہ کہا جاتا ہے۔ یہ جنگ شام کی سرحد پر رومیوں اور ان کے حلیفوں کے مقابلہ میں ہوئی تھی۔ اس کے آغاز ہی میں صحابہ کی ایک تعداد شہید ہوگئی۔ اس کے بعد لوگوں نے حضرت خالد بن الولید کو سردار بنایا۔ حضرت خالدؓ نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دونوں فریقوں کے درمیان تعداد کے اعتبار سے ناقابل عبور حد تک فرق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ حکمت کے ساتھ پیچھے ہٹ گئے اور مزید لڑے بغیر مدینہ واپس آ گئے۔

اس وقت مسلمانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد اس فیصلہ سے اتفاق نہیں کرتی تھی۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ مقابلہ کو چھوڑ کر پسپائی کا طریقہ اختیار کرنا ہے اور جب انتخاب مقابلہ اور پسپائی کی دو حالتوں کے درمیان ہو تو مسلمان کو چاہیے کہ وہ مقابلہ کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ پسپائی کا۔

یہ معاملہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے حضرت خالدؓ کے حق میں رائے دی۔ آپ نے جو کچھ فرمایا، اس کا مطلب یہ تھا کہ تم لوگ صرف دو حالتوں کے درمیان سوچ رہے ہو — مقابلہ یا پسپائی۔ مگر یہاں ایک تیسری حالت بھی ہے اور وہ ہے بے فائدہ مقابلہ کے میدان سے ہٹ کر مزید تیاری کے میدان میں واپس آجانا اور اپنے آپ کو اس قابل بنانا کہ آئندہ زیادہ موثر انداز میں فریق مخالف کے چیلنج کا جواب دیا جا سکے۔ اور خالد نے اسی تیسری حالت کا انتخاب کیا ہے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر حالت میں لوگ سیاہ اور سفید کے درمیان سوچتے ہیں۔ وہ سمجھ نہیں پاتے کہ ظاہری دو حالتوں کے علاوہ وہاں ایک تیسری حالت بھی موجود ہے جو زیادہ مفید اور موثر ہے۔ اس تیسری حالت کا نام تھرڈ آپشن ہے اور مذکورہ سنتِ رسولؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ تھرڈ آپشن کا طریقہ عین اسلام کا طریقہ ہے — پہلا اور دوسرا آپشن کھلے طور پر موجود ہوتا ہے اس لیے ہر شخص اس کو جان لیتا ہے۔ مگر تیسرا آپشن جو زیادہ بہتر آپشن ہے وہ ہمیشہ چھپا ہوا ہوتا ہے اس لیے اس کو وہی سمجھتا ہے جو عقل والا ہے۔

کامیاب تجارت

صہیبؓ رومی ایک صحابی تھے۔ ہجرت کے موقع پر وہ مکہ سے مدینہ جانے لگے تو ان کے پاس کچھ سونے کا سکہ (دینار) تھا۔ وہ باہر نکلے تو مکہ کے کچھ نوجوان انھیں ملے۔ بات چیت کے بعد انھیں معاملہ کا اندازہ ہوا تو انھوں نے کہا کہ ہم تم کو سونا لے کر مدینہ نہیں جانے دیں گے۔ صہیب رومیؓ نے کہا کہ میں تم کو یہ سونا دے دوں تو کیا تم مجھ کو یہاں سے جانے دو گے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ صہیب رومی نے فوراً سونا نکال کر انھیں دے دیا اور مدینہ روانہ ہو گئے۔

وہ مدینہ پہنچے تو سب سے پہلے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور مکہ میں پیش آنے والا یہ واقعہ آپ کو بتایا۔ آپ نے اس کو سن کر فرمایا کہ اے صہیبؓ، تمہاری تجارت کامیاب رہی۔

اس واقعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم سنت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی سے نزاع کی صورت پیدا ہو جائے اور کچھ مادی نقصان اٹھا کر نزاع ختم ہو سکتی ہو تو مادی نقصان برداشت کرتے ہوئے فوراً نزاع کو ختم کر دیا جائے۔

یہ طریقہ بظاہر نقصان کا طریقہ دکھائی دیتا ہے۔ مگر حقیقۃً وہ زبردست نفع کا طریقہ ہے۔ اس میں آدمی تھوڑی چیز دے کر زیادہ بڑی چیز پالیتا ہے۔

مذکورہ واقعہ میں ایک طرف چند دینار تھے اور دوسری طرف ایک انسان کا اپنا وجود۔ انسان کا اپنا وجود بہر حال چند دینار سے بہت زیادہ قیمتی ہے۔ اس لیے چند دینار دے کر اگر ایک انسان کی زندگی محفوظ ہو جائے تو یہ نفع کی تجارت ہے نہ کہ گھاٹے کی تجارت۔

نزاع کو جاری رکھنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ پیش قدمی کا عمل رک جاتا ہے۔ اور اگر نزاع کو ختم کر دیا جائے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ پیش قدمی کا عمل جاری رہے گا۔ اور پیش قدمی کا جاری رہنا اس سے ہزار گنا زیادہ بہتر ہے کہ ایک نزاع کی خاطر پیش قدمی کا عمل روک دیا جائے۔

انتظار کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو غزوات پیش آئے ان میں سے ایک غزوہ وہ ہے جس کو غزوۂ خندق کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر عرب کے قبائل بڑی تعداد میں اکٹھا ہو کر مدینہ آئے۔ انھوں نے چاہا کہ مدینہ پر حملہ کر کے اس کو تباہ کر دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ مخالف قبائل بڑی تعداد میں مدینہ کی طرف آرہے ہیں تو آپ نے فوراً یہ تدبیر کی کہ مدینہ کے اطراف میں خندق کھودنا شروع کر دیا۔ قبائل کا لشکر جب مدینہ کے پاس پہنچا تو یہاں خندق کھدی ہوئی تھی۔ وہ لوگ آسانی سے خندق کو پار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے خندق کے دوسری طرف پڑاؤ ڈال دیا۔

وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے ساتھیوں کو باہر سے للکارتے رہے۔ مگر آپ ان سے جنگ کے لیے نہیں نکلے۔ آپ اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ خندق کے دوسری طرف محفوظ طور پر رہ کر آنے والے وقت کا انتظار کرتے رہے۔

اس طرح تقریباً تین ہفتے گزر گئے۔ آخر کار فطرت کی طاقتیں حرکت میں آئیں۔ ایک دن زبردست آندھی چلی۔ مخالف لشکر کے خیمے اکھڑ گئے۔ ان کے کھانے کی دیگیں اڑ کر دور جا گریں۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ چنانچہ مخالفین کا لشکر گھبرا کر واپس چلا گیا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی پالیسیوں میں سے ایک پالیسی یہ ہے کہ کوئی ناموافق صورت حال پیش آئے تو فوری اقدام نہ کیا جائے بلکہ انتظار کی پالیسی اختیار کی جائے۔ عین ممکن ہے کہ انتظار خود ایک حل بن جائے اور آئندہ ایسے حالات پیش آئیں کہ اقدام کے بغیر مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے۔

فطرت کا نظام ایک خدائی نظام ہے۔ فطرت کے نظام کی صورت میں کائنات خود ہر آن فساد کو اصلاح کی صورت میں بدلنے کے لیے سرگرم ہے۔ انسان اگر صبر کی روش اختیار کرے اور ناخوش گوار مواقع پر انتظار کی پالیسی پر قائم رہے تو وہ دیکھے گا کہ فطرت کی طاقتوں نے متحرک ہو کر اس کا وہ کام زیادہ بہتر طور پر انجام دے دیا ہے جس کو وہ اپنے کمتر وسائل کے ذریعہ صرف ناقص طور پر انجام دینا چاہتا تھا۔

میانہ روی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ وہ آدمی تنگ دست نہیں ہوگا جو اعتدال کا طریقہ اختیار کرے (ماعال من اقتصد) تفسیر عثمانی ،صفحہ ۳۶۹

اپنی آمدنی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بقدر ضرورت خرچ کرنا اعتدال ہے۔ اور جس آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ آمدنی کی پروا کیے بغیر ہر چیز کے لیے خرچ کرتا رہے، خواہ وہ ضروری ہو یا غیر ضروری تو ایسا شخص بے اعتدالی کے ساتھ خرچ کرنے والا انسان ہے۔ جو آدمی خرچ کے معاملہ میں اعتدال کی روش اختیار کرے وہ ہمیشہ خوش حال رہے گا۔ اور جو آدمی بے اعتدالی میں مبتلا ہو جائے اس کو کوئی چیز تنگ دستی اور محتاجی سے بچانے والی نہیں۔

اس اصول کا تعلق صرف مالیاتی معنوں میں آمد اور خرچ سے نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کے تمام معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ آمد و خرچ کی طرح دوسرے معاملات میں بھی ایک اعتدال کا طریقہ ہے اور دوسرا بے اعتدالی کا طریقہ۔ اور اس دنیا میں کامیابی صرف اس کو ملتی ہے جو بے اعتدالی سے بچتے ہوئے اعتدال کی روش اختیار کرے۔

کسی سے آپ کی دوستی ہو تو ضروری ہے کہ آپ دوستی کو اعتدال کے دائرہ میں رکھیں۔ اگر آپ نے اس کا لحاظ نہیں کیا تو عین ممکن ہے کہ آپ کی دوستی آخر کار پشیمانی کا سبب بن جائے۔ اسی طرح کسی سے آپ کا اختلاف ہو جائے تو ضروری ہے کہ آپ اختلاف کو اختلاف کے دائرہ میں رکھیں، اس کو نفرت اور دشمنی کی حد تک نہ لے جائیں۔ اختلاف اگر اختلاف کے دائرہ میں ہو تو وہ کسی وقت ختم ہو سکتا ہے لیکن جب وہ بڑھ کر نفرت اور دشمنی بن جائے تو اس وقت اس کا ختم ہونا انتہائی حد تک دشوار ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کو اپنی زندگی کی تعمیر کے لیے جد و جہد کرنا پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں بھی ضروری ہے کہ آدمی اعتدال کا انداز اختیار کرے، وہ جب بھی کوئی اقدام کرے تو احتیاط کے ساتھ اقدام کرے، وہ جب بھی کوئی منصوبہ بنائے تو خواہش کے بجائے حقیقت پسندی کی رہنمائی میں بنائے، وہ جلد نتیجہ دیکھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ تدریج کے اصول کے مطابق اپنے کام کو آگے بڑھائے۔

اعتدال کا طریقہ کامیابی کا طریقہ ہے اور بے اعتدالی کا طریقہ ناکامی کا طریقہ۔

اسٹیٹس کوازم

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے ـــــ اسٹیٹس کو پر راضی ہونا۔ یعنی نزاعی معاملات میں حالت موجودہ کو مان لینا، حالت موجودہ پر راضی رہتے ہوئے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرنا۔ نزاعی معاملات میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معاملہ ایک خاص مقام پر آکر ٹھہر جاتا ہے۔ ایک طرف فریق اول ہوتا ہے اور دوسری طرف فریق ثانی۔ نزاعی لائن کو پار کرنا دونوں میں سے کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ حالات بتا رہے ہوتے ہیں کہ اگر اسٹیٹس کو (حالات موجودہ) کو بدلنے کی کوشش کی گئی تو دونوں کے درمیان سخت ٹکراؤ ہوگا۔ اور اس کے نتیجہ میں شدید تر برائی سامنے آجائے گی۔ ایسی حالت میں دانش مندی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ مقام نزاع پر جو صورت عملاً بن گئی ہے اس کو ویسا کا ویسا باقی رکھا جائے اور اپنی کوششوں کو دوسرے مقامات عمل کی طرف موڑ دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر جب عمرہ کی ادائیگی پر اصرار نہیں کیا اور وہیں سے مدینہ لوٹ آئے تو یہ وقتی طور پر اسٹیٹس کو کو مان لینے کا واقعہ تھا۔ بعض دوسرے واقعات ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مستقل طور پر اسٹیٹس کو پر راضی ہوگئے۔ اس کی نمایاں مثال کعبہ کو بنائے مشرکین پر باقی رکھنا، اور اس کو دوبارہ بنائے ابراھیم پر تعمیر نہ کرنا ہے۔

یہ طریقہ نزاعی معاملات میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ آدمی کی طاقت کا ہر جزء صرف تعمیری کام میں خرچ ہو۔

ایک آدمی اپنی سواری دوڑاتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سڑک بند ہو۔ تو وہ بند سڑک سے نہیں ٹکراتا بلکہ اپنی سواری کو موڑ کر دوسرے راستے سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ اسی حکمت کا نام اسٹیٹس کوازم ہے۔

حالتِ موجودہ کو مانتے ہی آدمی کو فوراً اپنے عمل کا آغاز مل جاتا ہے۔ اور اپنے عمل کے لیے صحیح نقطۂ آغاز کو پا لینے ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

صلح بہتر ہے

قرآن میں عورت اور مرد کے تعلقات کے بارے میں حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی صلح کرلیں اور صلح بہتر ہے۔ اور حرص انسان کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور خدا ترسی سے کام لو۔ تو جو کچھ تم کروگے اللہ اس سے باخبر ہے (النساء ۱۲۸)

صلح بہتر ہے (الصُّلح خیر) ایک عام فطری اصول ہے۔ اس کا تعلق گھر کے مسائل سے بھی ہے اور بین اقوامی سطح پر پیش آنے والے معاملات سے بھی ہے۔ جب بھی کسی فرد یا گروہ کو دوسرے فرد یا گروہ کی طرف سے کوئی ناخوش گوار تجربہ پیش آئے تو ایسے موقع پر عقل مندی یہ ہے کہ اس کے جواب میں ردعمل کا انداز اختیار نہ کیا جائے۔ ایسے مواقع پر بہتر طریقہ صلح کا ہے نہ کہ نزاع کا۔

نزاعی امور میں صلح کی پالیسی کوئی پسپائی یا بزدلی نہیں ہے۔ اس کا مقصد دراصل یہ ہے کہ اپنے وقت اور قوت کو بے فائدہ طور پر ضائع کرنے سے بچایا جائے اور اس کو مفید استعمال کی طرف موڑ دیا جائے۔

صلح کا الٹا رویہ جنگ ہے۔ جنگ یا ٹکراؤ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں دو فریقوں کے درمیان نزاع کی صورت پیش آئی ہے، دونوں فریق بس وہیں ٹھہر جائیں۔ وہ اپنے سفر کو مقام نزاع پر روک دیں۔ اس کے برعکس ایسے معاملات میں صلح کی پالیسی اختیار کرنا آدمی کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے سفر کو روکے بغیر مسلسل اسے جاری رکھے۔ وہ کسی وقفے کے بغیر چلتا رہے، یہاں تک کہ وہ اپنی آخری منزل کو پہنچ جائے۔

صلح کا طریقہ وقتی طور پر کھونے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر حال سے نظریں ہٹا کر آنے والے مستقبل کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ مکمل طور پر پانے کا طریقہ ہے۔ آخری نتیجے کے اعتبار سے صلح کی پالیسی ہمیشہ کامیابی کا سبب بنتی ہے، اور ٹکراؤ کی پالیسی ہمیشہ تباہی اور ناکامی کا سبب۔

چھوٹے شر کا انتخاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی دور میں ایک سنگین مسئلہ وہ تھا جس کو عبد اللہ بن ابی کی صورت میں جانا جاتا ہے۔ وہ قبیلہ خزرج کا بڑا سردار تھا۔ اسلام کے خلاف وہ اتنا زیادہ بڑا مسئلہ تھا کہ خود اس کا مسلمان بیٹا عبد اللہ اس کے قتل کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قتل نہیں کروایا۔ یہاں تک کہ وہ ۹ ھ (۶۳۰ء) میں اپنی طبعی موت مرا۔

عبد اللہ بن ابی کے معاملہ میں صبر و برداشت کی اس غیر معمولی پالیسی کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ عبد اللہ بن ابی کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں تھا۔ اس وقت کی صورت حال بتا رہی تھی کہ یہ صرف زندہ عبد اللہ اور مردہ عبد اللہ کے درمیان انتخاب کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہاں ایک تیسری شدید تر صورت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر اس کو قتل کروایا گیا تو یقینی طور پر قبائلی عصبیت جاگ اٹھے گی۔ بہت سے لوگ اس کے خون کا انتقام لینے کے درپے ہو جائیں گے۔ اس طرح عبد اللہ بن ابی کو قتل کر کے عملاً اس کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ ایک اور شدید تر برائی جاگ اٹھے گی۔ اور وہ اپنے مقتول سردار کا انتقام ہے۔ اس اندیشہ کی پیشگی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ تھی کہ غزوۂ احد کے موقع پر اس نے جنگ میں عدم شرکت کا فیصلہ کیا تو اس کے قبیلہ کے تین سو آدمیوں نے عبد اللہ بن ابی کے ساتھ شریک ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ عبد اللہ بن ابی کے معاملہ میں اس وقت جو انتخاب تھا وہ زندہ دشمن اور مردہ دشمن کے درمیان نہیں تھا بلکہ وہ مردہ دشمن اور اس کے بعد ظاہر ہونے والے انتقامی ردعمل کے درمیان تھا۔ ایسی حالت میں زندہ دشمن چھوٹا شر تھا اور مردہ دشمن انتقامی ردعمل کی صورت میں زیادہ بڑا شر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے شر سے بچنے کے لیے چھوٹے شر کو گوارا کر لیا۔

زندگی خیر و شر کے درمیان انتخاب کا نام نہیں۔ زندگی چھوٹے شر اور بڑے شر کے درمیان انتخاب کا نام ہے۔ کامیاب وہ ہے جو اس حقیقت کو جان لے۔

درمیانی طریقہ

قرآن میں ہے کہ چلنے میں درمیانی چال اختیار کرو (لقمان) حدیث میں ہے کہ معاملات میں سب سے بہتر طریقہ درمیانی طریقہ ہے (خیر الامور اوسطھا)

درمیانی طریقہ اختیار کرنا اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر معاملہ میں ہمیشہ ایسا کیا ہے۔ نمازوں میں آپ اکثر درمیانی سورتیں پڑھتے تھے، زیادہ بڑی اور نہ زیادہ چھوٹی۔ اسی طرح تمام عبادات میں آپ ہمیشہ درمیانی انداز اختیار کرتے تھے۔

گفتگو میں آپ نہ بہت زیادہ مختصر بولتے اور نہ بہت لمبا کلام کرتے۔ بلکہ آپ کا طریقہ دونوں کے درمیان تھا۔ کھانے پینے کے معاملہ میں آپ نہ بہت زیادہ شکم سیر ہو کر کھاتے اور نہ فاقہ کشی کی مشقت اختیار کرتے۔ بلکہ ہلکی خوراک آپ کا طریقہ تھا۔

آپ نے فرمایا کہ کسی سے دوستی کرو تو دوستی میں حد سے نہ گزر جاؤ۔ اسی طرح اگر کسی سے دشمنی ہو جائے تو دشمنی میں بھی ایک حد پر قائم رہو۔ صحابی فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ہم کو تکلف اور غلو سے منع فرمایا ہے۔ اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر قسم کے انسانی تعلقات میں اعتدال اور توسط کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ خاندانی زندگی، سماجی تعلقات اور ملّی روابط ہر جگہ یہی مطلوب ہے کہ ہمیشہ درمیانی انداز اختیار کیا جائے۔

اپنے کمائے ہوئے مال کو خرچ کرنے کے معاملہ میں اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اس کو اعتدال کے ساتھ خرچ کرو۔ نہ تو بالکل بخیل بن جاؤ اور نہ بہت زیادہ فیاض۔ کمانے کے معاملہ میں بھی آدمی کو اعتدال کا انداز اختیار کرنا چاہیے اور اسی طرح اس کو چاہیے کہ وہ جو مال کمائے اس کو اعتدال کے ساتھ ضروری مدوں میں خرچ کرے۔

اسی طرح وہ تعلقات جن کو بین اقوامی تعلقات کہا جاتا ہے اس کے بارے میں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا مطلوب ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سرحدی قوتوں کے ساتھ ہمیشہ نارمل تعلق کو برقرار رکھا جائے۔ ہمیشہ یہ کوشش کی جائے کہ ان کے ساتھ تعلق اعتدال کے دائرہ میں رہے، اعتدال کی حد سے باہر نہ جانے پائے۔

مینیمم سے آغاز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی وفات ۶۳۲ء میں مدینہ میں ہوئی۔ پہلی وحی آپ پر ۶۱۰ء میں نازل ہوئی۔

اس وقت مکہ میں بہت سے نہایت سنگین قسم کے مسائل تھے۔ مثلاً مقدس کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ اجتماعی معاملات کے فیصلہ کا مرکز دار الندوہ مشرکوں کے قبضہ میں تھا معاشرہ میں بدکاری، شراب، جوا جیسے سخت جرائم پھیلے ہوئے تھے۔ ایرانی ایمپائر اور رومی ایمپائر نے عربوں کو اپنے ماتحت کا درجہ دے رکھا تھا۔ وغیرہ۔

مگر آپ پر جو پہلی وحی اتری اور جس میں حکم دیا گیا کہ آپ ان حالات میں کیا کریں۔ اس میں ان مسائل میں سے کسی مسئلہ کا ذکر نہیں تھا۔ اور ان کے بارہ میں آپ کو کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ آپ سے سادہ طور پر صرف یہ کہا گیا : اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاكرم الذی علم بالقلم۔ علم الانسان ما لم يعلم۔

اس وقت کے مسائل کی نسبت سے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ کم سے کم (minimum) کا حکم تھا۔ مذکورہ مسائل کے بارے میں اگر آپ کو حکم دیا جاتا اور آپ اس کے لیے عمل شروع کر دیتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ فوراً گرد و پیش کے لوگوں سے آپ کا شدید ٹکراؤ شروع ہو جاتا۔

مینیمم سے آغاز کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ جب کہ زیادہ سے آغاز کا نتیجہ اکثر حالات میں الٹا برآمد ہوتا ہے۔

کسی بھی معاملے میں کامیاب ہونے کی شرط یہ ہے کہ صحیح مقام سے اُس کا آغاز کیا گیا ہو۔ اور صحیح آغاز وہی ہے جو ممکن ہو۔ ممکن سے آغاز ہی دراصل صحیح آغاز ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مینیمم ہمیشہ ممکن ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں میکسیمم سے آغاز ہمیشہ ناممکن اور ناقابل عمل۔

مینیمم سے آغاز کا مطلب کم سے آغاز نہیں ہے بلکہ ممکن سے آغاز ہے۔ اسی طرح میکسیمم سے آغاز کا مطلب زیادہ سے آغاز نہیں ہے بلکہ ناممکن سے آغاز ہے۔

حکمتِ عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری زمانہ میں مدینہ سے مکہ جاکر حج کیا۔ اس موقع پر آپ نے وہ مشہور خطبہ دیا جو خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اس خطبہ میں آپ نے اعلان فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں، سوا دین اور تقویٰ کے۔ اس طرح آپ نے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق کے قدیم رواج کا خاتمہ کر دیا۔

مگر اسی کے ساتھ آپ نے دوسرے موقع پر یہ بھی فرمایا کہ: الائمۃ من قریش۔ یعنی میرے بعد مسلمانوں کا سیاسی امام قریش میں سے ہوگا۔ یہ دوسرا بیان بظاہر پہلے بیان کے مطابق نہیں مگر یہ عدم مطابقت کی بات نہیں بلکہ عملی تقاضوں کی رعایت کرنے کی بات ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تنہا نماز میں اتنا لمبا قیام فرمایا کہ آپ کے پاؤں میں سوجن آگئی۔ دوسری طرف جماعت کی نماز پڑھاتے ہوئے صف کے پیچھے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی تو آپ نے مختصر سورۃ پڑھاکر نماز جلد ختم کر دی۔ اس فرق سے مذکورہ معاملہ کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب معاملہ تنہا اپنی ذات کا ہو تو مومن کو چاہیے کہ وہ آئیڈیل کو اختیار کرنے کی کوشش کرے مگر جب اجتماعی معاملہ ہو اور دوسروں کے ساتھ نباہ کرنے کی ضرورت ہو تو اس وقت وہ پریکٹیکل بن جائے۔ اس دوسری صورت میں حالات کے اعتبار سے عملی تقاضوں کی رعایت کی جائے گی۔ کیوں کہ صرف وہی قابل عمل ہے۔ ایسے معاملات میں آئیڈیل کو چلانا سرے سے ممکن ہی نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ کی ایک سنت یہ ہے کہ لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے صرف یہ نہ دیکھا جائے کہ آئیڈیل نقطۂ نظر کیا ہے یا معیاری انصاف کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے بجائے یہ دیکھا جائے کہ جن لوگوں کے ساتھ معاملہ پیش آیا ہے وہ کس درجہ کے لوگ ہیں اور حقیقی حالات کا تقاضا کیا ہے۔ اس طرح کا جائزہ لے کر حقیقی صورت حال کے مطابق وہ مسلک اختیار کیا جائے جو عملی طور پر ممکن ہو، نہ کہ وہ مسلک جو بظاہر نظریاتی طور پر درست ہو مگر عملی طور پر اس کو اختیار کرنا ممکن نہ ہو۔

حکمتِ حیات

صلح اپنا حق وصول کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ صلح فریق ثانی کے شر سے بچنے کے لیے ہوتی ہے۔ فریق ثانی اگر عادل ہو تو کسی صلح کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ صلح کے بغیر ہی آپ کو آپ کا پورا حق دے دے گا۔ مگر جب فریق ثانی غیر عادل ہو تو وہ آپ کو الجھا کر آپ کو اپنی تعمیر کے راستہ سے ہٹا دینا چاہے گا۔ اس وقت خدا پرست آدمی اپنے حریف سے خود اس کی شرائط پر صلح کر لیتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے دامن کو بے فائدہ الجھاؤ سے بچالے اور اپنے تعمیری عمل میں مصروف ہو جائے۔

جو لوگ اس راز کو نہیں جانتے وہ صلح کے وقت اپنے حقوق کی فہرست بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اور اصرار کرنے لگتے ہیں کہ ان کے جائز حقوق انھیں لوٹائے جائیں۔ اس قسم کی کوشش صلح کی راہ میں مستقل رکاوٹ ہے۔ اس طرح کی کوشش صرف معاملہ کو الجھاتی ہے وہ صلح کو تکمیل تک پہنچنے نہیں دیتی۔

یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ وہ غیر عادل انسانوں سے اس طرح بھری ہوئی ہے جس طرح کوئی کانٹے دار درخت کانٹوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ایسی دنیا میں آدمی کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ غیر عادل انسانوں سے معاملاتی الجھاؤ کی نوبت نہ آنے دے۔ ان سے دور کا تعلق رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا راستہ طے کرتا رہے۔

لیکن اگر کبھی کسی وجہ سے کسی غیر عادل انسان سے معاملاتی نزاع پیدا ہو جائے تو پہلی فرصت میں اس سے صلح کر کے آگے بڑھ جانا چاہیے۔ آدمی کی ساری توجہ سفر کو دوبارہ بلا رکاوٹ جاری کرنے سے ہونی چاہیے نہ کہ فریق ثانی سے اپنے حقوق کی وصولیابی پر۔

یہ صلح کوئی پسپائی نہیں، یہ بامقصد انسان کا اصول ہے۔ جس آدمی کے سامنے کوئی مقصد نہ ہو وہی ایسا کر سکتا ہے کہ وہ صلح کو حقوق کی وصولیابی کا عنوان بنائے اور پھر اس ناقابل عمل صلح کے لیے ساری عمر لڑتا رہے ـــــ اسلام میں صلح کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی، صلح کو ہر حال میں خیر بتایا گیا۔ حتیٰ کہ حدیبیہ کے موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخالفین سے اُن کی یک طرفہ شرائط پر صلح کر لی۔

خدائی نظام

وما اصابکم من مصیبۃٍ فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر۔ (الشوری ۳۰)

اور جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں ہی سے۔ اور بہت سے قصوروں کو وہ معاف کر دیتا ہے۔

قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ آدمی جب بھی دنیا میں کسی مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اس کے اپنے ہی کسی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کسی دوسرے کی زیادتی کی شکایت کرنا بے معنی ہے۔ جب ہر آدمی خود اپنے کیے کو بھگت رہا ہو تو دوسرے کے خلاف شکایت اور احتجاج کرنا صرف وقت ضائع کرنا ہے۔ کیوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

یہ قدرت کا بنایا ہوا نظام ہے اور اس نظام میں ہمارے لیے خوش خبری ہے۔ وہ ہمارے لیے عظیم الشان امید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قدرتی نظام نے ہمارے مسائل کے حل کو خود ہمارے اپنے ہاتھ میں دے دیا۔ ہم کو اس کا محتاج نہیں کیا کہ ہم کسی دوسرے کی مہربانی کا انتظار کریں۔

کوئی آدمی جن مسائل سے دوچار ہو اگر اس کا سبب کچھ دوسرے لوگ ہوتے تو گویا کہ ہم دوسروں کے اوپر منحصر ہوتے۔ ہمیں دوسروں کی عنایت کا انتظار کرنا پڑتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا کا نظام اس طرح بنایا کہ یہاں ہر آدمی کا معاملہ اس کے اپنے ہاتھ میں رکھ دیا۔ یعنی ہر آدمی اپنی ہی کوشش سے اپنی زندگی کی تعمیر کر سکے۔ ہر آدمی کا مستقبل خود اس کے اپنے اختیار میں ہو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نادانی کی بنا پر نقصان اٹھاتا ہے، ایسے لوگ دوبارہ دانش مندی کا طریقہ اختیار کر کے اپنے آپ کو نقصان سے بچا سکتے ہیں۔ کبھی کسی کا معاملہ غیر منصوبہ بند انداز میں کام کرنے کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے، اس کے لیے موقع ہے کہ آئندہ وہ منصوبہ بند انداز میں کام کر کے از سر نو اپنے معاملہ کو درست کر لے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بے صبری کی روش کو اپنا کر آدمی مصیبت میں پھنس جاتا ہے، اب اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ صبر کی روش کو اپنا کر دوبارہ اپنے آپ کو مصیبتوں سے بچا لے۔ کبھی کچھ لوگ جذباتی اقدام کر کے اپنے کو بربادی میں ڈال دیتے ہیں، ان کے لیے موقع ہے کہ وہ حقیقت پسندی کے اصول پر چل کر دوبارہ کامیابی کی منزل تک پہنچ جائیں۔

مشکل میں آسانی

مکی دور میں جب کہ مسلمان نہایت سخت حالات سے گزر رہے تھے ، اس وقت قرآن میں یہ آیت اتری کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے ، مشکل کے ساتھ آسانی ہے (الانشراح) اس قرآنی آیت میں فطرت کا یہ قانون بتایا گیا کہ اس دنیا میں ہمیشہ مشکلات کے ساتھ مواقع موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے بہترین عقل مندی یہ ہے کہ مشکلات سے صرف نظر کرتے ہوئے مواقع کو استعمال کیا جائے اس طرح زیادہ بہتر طور پر مستقبل کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھا جا سکتا ہے ۔

عام طور پر دنیا میں لوگ ایک ہی عمل کو جانتے ہیں ، اور وہ ہے مشکلات سے لڑکر انھیں راستہ سے ہٹانا اور اس طرح اپنے لیے راہ ہموار کرنا ، مگر اسلامک ایکٹوزم یہ نہیں ہے ۔ اسلامک ایکٹوزم اس کے برعکس ہوتا ہے کہ مشکلات سے ٹکرانے کے بجائے انھیں نظر انداز کرو ، اور عین اسی وقت جو مواقع موجود ہیں ان کو استعمال کرو ۔ گویا اسلامک ایکٹوزم ایک لفظ میں یہ ہے کہ مشکلات کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو :

Ignore the problems, avail the opportunities.

مشکلات و مسائل کو موجودہ دنیا سے ختم نہیں کیا جا سکتا ۔ مشکلات و مسائل کا وجود اس دنیا میں اتنا ہی حتمی ہے جتنا کہ پھول کے درخت میں کانٹا ۔ اس لیے مشکلات و مسائل سے ٹکرانا فطرت کی اٹل حقیقتوں سے ٹکرانا ہے ۔ اور کون ہے جو فطرت کی حقیقتوں سے ٹکرا کر انھیں بدل سکے ۔

عقل مند وہ ہے جو مشکلات و مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع اور امکانات کو تلاش کرے ۔ زندگی کا کامیاب سفر ہمیشہ امکانی راہوں میں جاری ہوتا ہے نہ کہ مشکلات کی چٹانوں پر اپنا سر ٹکرانے سے ۔ جس طرح درخت میں پھول اور کانٹا دونوں ہوتا ہے اسی طرح موجودہ دنیا مشکلات اور مواقع دونوں سے بھری ہوئی ہے ۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ مشکلات میں نہ الجھے ۔ وہ مواقع کو دریافت کر کے انھیں استعمال کرے ۔ وہ شکایت اور احتجاج کا طریقہ چھوڑ کر صبر و تحمل کے ساتھ اپنا راستہ طے کرتا رہے ۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آخر کار کامیاب ہوں گے ۔ جو لوگ اس کے برعکس روش اختیار کریں ان کے لیے خدا کی دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں ۔

حکمت کی بات

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— حکمت کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے، وہ جہاں اسے پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے (اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ أَيْنَ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا)

اس حدیثِ رسولؐ میں خدا پرست انسان کا مزاج بتایا گیا ہے۔ خدا پرست انسان ہر قسم کے تعصب سے پاک ہوتا ہے، وہ اپنے اور غیر میں فرق نہیں کرتا۔ وہ تمام دنیا کو خدا کی مخلوق کی نظر سے دیکھتا ہے، وہ تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ سمجھتا ہے۔ خدا پرست انسان کا یہ مزاج اس کو آفاقی بنا دیتا ہے۔

ایسا انسان ہر چیز سے سبق لینے لگتا ہے، وہ ہر کام کی بات کو اپنی بات سمجھتا ہے۔ اس کی آفاقی سوچ اُس کو اِس کمزوری سے بچا لیتی ہے کہ وہ کسی فائدہ کی بات کو دیکھے، تو اس کو غیر کی چیز سمجھ کر چھوڑ دے۔ وہ ہر اچھی بات کو خدا کی بات سمجھتا ہے، اس لیے وہ ہر اچھی بات کو اس طرح لے لیتا ہے جیسا کہ وہ اس کی اپنی ہی بات ہو۔

خدا پرست انسان کا یہ مزاج اس کو بے پناہ بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے ذہنی خزانہ میں نئی نئی باتوں کا اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی کبھی ٹھہراؤ کا شکار نہیں ہوتی، وہ ہر موڑ پر ایسی باتیں پا لیتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی زندگی کے سفر کو آگے کی طرف جاری رکھ سکے۔

دنیا میں کامیابی کا تعلق سب سے زیادہ جس چیز سے ہے وہ معلومات ہیں، جتنی زیادہ معلومات اتنی زیادہ کامیابی۔ خدا پرست انسان اپنے دماغ کی تمام کھڑکیاں کھلی رکھتا ہے، اس بنا پر یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ اس کی معلومات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔

خدا پرست انسان کا مزاج اس کو کامل طور پر علم کا طالب بنا دیتا ہے۔ نئی نئی باتوں سے اس کی روح کو غذا ملتی ہے۔ وہ درخت کی مانند ایک اضافہ پذیر وجود بن جاتا ہے۔ اس کی شخصیت مسلسل بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ تکمیل کی آخری حد پر پہنچ جاتا ہے۔

مومن ایک بے تعصب انسان ہوتا ہے۔ وہ آخری حد تک طالب حق ہوتا ہے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ جہاں بھی کوئی اچھی بات ملے وہ فوراً اس کو لے لے۔

عذر نہیں

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــ دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارہ میں اکثر لوگ دھوکہ میں رہتے ہیں ــــ صحت اور فرصت (نعمتان مغبون فیهما کثیر من الناس: الصحة والفراغ) فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۱ صفحہ ۲۳۳

دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے یا کوئی کام کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ یہ دو چیزیں صحت اور فرصت ہیں۔ یہ دونوں چیزیں بلاشبہہ اللہ کی عظیم نعمت ہیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے معاشی کاموں میں مشغول رہتا ہے اور اعلیٰ انسانی مقاصد کے لیے سرگرم نہیں ہو پاتا۔ حالانکہ اعلیٰ انسانی مقاصد کے لیے جینے ہی کا نام انسانیت ہے۔ جو آدمی صرف معاش اور اقتصادیات کے لیے جئے، وہ گویا حیوان جیسی زندگی گزار رہا ہے۔

جب انسانی مقاصد کے لیے کام کرنے کا موقع آتا ہے تو بیشتر لوگ یہ سوچ کر اس کے لیے سرگرم نہیں ہو پاتے کہ جب صحت اور فرصت ملے گی تو اس کے لیے بھی کام کر لیں گے۔ حالانکہ زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ صحت اور فرصت دونوں معیاری صورت میں مل جائیں۔ بیشتر حالات میں یہی ہوتا ہے کہ اگر صحت ہے تو فرصت نہیں اور اگر فرصت ہے تو صحت نہیں۔ اعلیٰ مقاصد کے لیے صحت اور فرصت کی شرط لگانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کبھی کوئی اعلیٰ کام نہ کر سکے، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جائے۔

زندگی عذر سے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ آدمی کے سامنے کبھی صحت کی خرابی کا عذر ہوتا ہے اور کبھی فرصت نہ ہونے کا عذر۔ دانش مندی یہ ہے کہ کسی بھی حال میں عذر کو عذر نہ بنایا جائے۔ عذر کو ناقابل لحاظ سمجھ کر اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔

زندگی میں کمیاں اس لیے نہیں ہوتیں کہ وہ آدمی کو کمزور کریں، بلکہ وہ آدمی کے لیے طاقت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ فطرت کا نظام ہے کہ کمی کا احساس آدمی کی ذہنی سرگرمیوں کو بڑھاتا ہے۔ کمی کا احساس معمولی آدمی کو غیر معمولی آدمی بنا دیتا ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ عذر کے باوجود کام کرنا سیکھے، عذر کے باوجود وہ اپنے عمل کو جاری رکھے۔ یہی لوگ ہیں جو موجودہ دنیا میں کامیابی اور ترقی کے اعلیٰ مقامات حاصل کرتے ہیں۔

قابل اعتماد کردار

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کے تیرھویں سال مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ وہی سفر ہے جس کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بے حد نازک سفر تھا۔ مکہ کے سردار آپ کو مار ڈالنے پر تلے ہوئے تھے۔ آپ کو نہایت مخفی طور پر مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچنا تھا۔ یہ یقینی تھا کہ جب آپ مکہ سے نکل کر مدینہ کے لیے روانہ ہوں گے تو مکہ کے سردار آپ کے پیچھے اپنے آدمی دوڑائیں گے، وہ ہر کوشش کریں گے کہ آپ کو دوبارہ پکڑ لیں۔

ان حالات میں مختلف قسم کی احتیاط ضروری تھی۔ مثلاً مکہ سے نکل کر الٹی طرف جانا، پہلے غار ثور میں قیام کرنا۔ ابتداءً پیدل سفر طے کرنا اور پھر راستہ میں اونٹ کی سواری اختیار کرنا، معلوم اور معروف راستہ کو چھوڑ کر غیر عادی راستہ کا سفر کرنا، وغیرہ۔ قدیم زمانہ میں جب کہ سڑکیں نہیں تھیں، اس طرح کا سفر ایک واقف کار رہنما کی مدد ہی سے ہو سکتا تھا، رہنما کے بغیر ایسا سفر طے کرنا ناممکن تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اس سفر میں رہنمائی کے لیے مکہ کے ایک شخص کو منتخب کیا جس کا نام عبد اللہ بن ارقط تھا۔ یہ آدمی اس طرح کے لمبے سفروں میں بطور پیشہ رہنمائی کا کام کیا کرتا تھا۔ وہ اگرچہ مشرک تھا، بالفاظ دیگر، اس کا تعلق آپ کی دشمن قوم سے تھا۔ اس کے باوجود آپ نے اس نازک سفر کے لیے اسی کا انتخاب فرمایا (سیرۃ ابن ہشام ۲ صفحہ ۹۸)

اس انتخاب کا سبب کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبد اللہ بن ارقط اگرچہ مخالف قوم سے تعلق رکھتا تھا مگر اس کے اندر وہ چیز کمال درجہ میں تھی جس کو پروفیشنل دیانت داری کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے کام کے بارے میں وہ پوری طرح مخلص تھا۔ وہ جس خدمت کی ذمہ داری کو قبول کرتا اس کو ٹھیک ٹھیک انجام دیتا تھا۔ کام کے معاملہ میں وہ نہ عقیدہ کو رکاوٹ بناتا اور نہ کسی ذاتی مفاد کو۔

پروفیشنل دیانت داری کی یہ صفت آدمی کو سب کی نظر میں قابل اعتماد بنا دیتی ہے، حتی کہ اس کے مخالفین بھی اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کا قول لوگوں کی نظر میں چٹان کی طرح مضبوط بن جاتا ہے، وہ اپنے اور غیر سب کی نظر میں عزت کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔

علم کی اہمیت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اپنے دعوتی کام کا آغاز کیا۔ آپ کی دعوت مکمل طور پر ایک پرامن دعوت تھی مگر مکہ والوں نے آپ کے خلاف یک طرفہ طور پر تشدد شروع کر دیا۔ اس کے بعد آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ سے مدینہ چلے گئے۔ اب مدینہ آپؐ کی دعوت کا مرکز بن گیا۔ تاہم مکہ کے سردار اس پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے آپ کے خلاف مسلح جارحیت کی جس کے نتیجہ میں ۲ھ میں وہ لڑائی پیش آئی جو غزوۂ بدر کے نام سے مشہور ہے۔

اس جنگ میں خدا نے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کی مدد فرمائی اور وہ اپنے مخالفین پر کامیاب ہوئے۔ اس جنگ کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ اس میں مکہ کے ستّر آدمی گرفتار ہو کر مدینہ لائے گئے۔ یہ لوگ قدیم معیار کے مطابق پڑھے لکھے تھے۔ جب کہ مدینہ میں پڑھائی کا رواج نہ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کو ان قیدیوں کا فدیہ قرار دے دیا۔ آپ نے اعلان فرمایا کہ ان میں سے جو آدمی مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے گا تو اس کو ہم قید سے رہائی دے دیں گے۔ چنانچہ کئی قیدیوں نے اس طرح تعلیمی خدمت انجام دے کر رہائی حاصل کی (سیرت ابن کثیر ۲ صفحہ ۵۱۲)

یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا مدرسہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مسلم نوجوانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا ایک نظام قائم کیا گیا تھا۔ اس مدرسہ کے تمام کے تمام ٹیچر غیر مسلم تھے بلکہ وہ دشمن قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں تعلیم کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ اس واقعہ کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ —— ہر حال میں تعلیم حاصل کرو، خواہ تم کو اغیار سے تعلیم حاصل کرنا پڑے، خواہ تم کو ایک ایسے ادارہ میں پڑھنا پڑے جس کے تمام ٹیچر تمہاری دشمن قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ انسان پیدائشی طور پر ہر صلاحیت لے کر آتا ہے مگر ان صلاحیتوں کو صحیح طور پر عمل میں لانے کے لیے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم آدمی کو باشعور بناتا ہے۔ علم آدمی کو اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال سکھاتا ہے۔ علم آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے واقفیت حاصل کرے۔ علم کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی کتابوں کی صورت میں پچھلے انسانوں کے تجربات پڑھے۔ وہ تاریخ کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے واقف ہو۔ علم کے بغیر آدمی محدود ہے۔ علم حکمت و معرفت کا خزانہ ہے۔

درست کلام

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور درست بات (قول سدید) کہو، وہ تمہارے اعمال سدھارے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی (الاحزاب ۷۱-۷۰)

سدید کے معنی وہی ہیں جس کو اردو میں درست یا ٹھیک کہتے ہیں۔ عربی زبان میں کہا جاتا ہے سَدَّدَ الرُّمْحَ، یعنی تیر کو ٹھیک نشانہ کے رخ پر سیدھا کیا۔ اس اعتبار سے قول سدید کے معنی ہوں گے بالکل ٹھیک بات، نشانہ پر لگتی ہوئی بات (ای قولاً قاصداً غیر جائر، حقاً غیر باطل (الطبری) (ای مستقیماً لا اعوجاج فیہ ولا انحراف (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ درست کلام سے اصلاح اعمال کا فائدہ ہوتا ہے۔ جس سماج میں لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ کسی بات کو درست انداز میں کہیں اس سماج کے معاملات بھی درست رہتے ہیں۔ درست بات اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ لوگوں کے معاملات بگڑنے سے بچ جائیں۔

مثلاً آپ اپنے عبادت خانہ کے اندر داخل ہوں۔ وہاں آپ دیکھیں کہ فرش پر مقدس کتاب کے کچھ اوراق بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ آپ لوگوں سے یہ کہیں کہ میں عبادت خانہ میں داخل ہوا تو وہاں مقدس کتاب کے کچھ اوراق بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ لوگوں کو یہ بتائیں کہ دوسرے فرقے کے لوگوں نے مقدس کتاب کی بے حرمتی کی، اور اس کے اوراق پھاڑ کر زمین پر پھینک دیے۔

آپ کی پہلی بات قول سدید کی مثال ہے۔ اور دوسری بات قول غیر سدید کی مثال۔ اگر آپ معاملے کو پہلی قسم کے الفاظ میں بیان کریں تو اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اگر آپ مذکورہ مثال کے مطابق، دوسری قسم کے الفاظ بولنے لگیں تو سننے والے بھڑک اٹھیں گے۔ ہر طرف غم و غصے کی لہر دوڑ جائے گی۔ لوگ دوسرے فرقے کے خلاف انتقامی کارروائی شروع کر دیں گے۔ اس کے بعد جوابی انتقام کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اور پھر پوری بستی آگ اور خون کی نذر ہو جائے گی۔

منصوبہ بند عمل

قرآن کی سورہ نمبر۴۶ میں ارشاد ہوا ہے ــــ پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی نہ کرو (فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل ولا تستعجل لهم) الاحقاف ۳۵

زندگی مشکلات اور مسائل کے درمیان جینے کا نام ہے۔ خاص طور پر جو آدمی کوئی مقصد یا مشن لے کر اٹھے اس کے لیے تو قدم قدم پر رکاوٹیں اور مخالفتیں پیش آتی ہیں۔ اس کو طوفانوں کے درمیان اپنا سفر طے کرنا ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں زندگی کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ جب کوئی مخالف صورت حال سامنے آئے تو فوری ردعمل کے تحت اس کے خلاف کارروائی شروع کر دی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مخالف صورت حال پیش آنے کے بعد آدمی اپنے جذبات کو تھامے۔ وہ پورے معاملہ پر ٹھنڈے ذہن کے ساتھ غور و فکر کرے۔ اسی کے ساتھ وہ صاحب مشورہ لوگوں سے مشورہ بھی کرے۔ اس کے بعد سوچے سمجھے فیصلہ کے مطابق جوابی کارروائی کرے ــــ پہلے طریقہ کا نام عجلت ہے اور دوسرے طریقہ کا نام صبر۔

عجلت کے تحت کیا ہوا اقدام ہمیشہ ناکام ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے اقدام میں صورت حال کا پورا جائزہ شامل نہیں ہوتا۔ ایسا آدمی نہ اپنی طاقت کا صحیح اندازہ کرتا ہے اور نہ فریق ثانی کی طاقت کا۔ وہ نتیجہ کی پروا کیے بغیر فوری طور پر مقابلہ کے میدان میں کود پڑتا ہے۔ اور یہ فطرت کا قانون ہے کہ اسباب کا لحاظ کیے بغیر اس دنیا میں جو اقدام کیا جائے وہ کبھی کامیابی کے درجہ تک نہ پہنچے۔

صبر کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ جو آدمی صبر کا طریقہ اختیار کرے وہ کارروائی سے پہلے اس کے انجام کو سوچتا ہے، وہ جذبات کی رعایت کرنے کے بجائے حقیقت کی رعایت کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں فطرت کے قانون کی حکمرانی ہے، نہ کہ اس کی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کی۔

صبر یہ ہے کہ آدمی جذبات سے اوپر اٹھ کر حقیقت کو دیکھے۔ وہ ذاتی خواہشوں سے غیر متاثر رہ کر فطرت کے نظام کو سمجھے۔ صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ منصوبہ بند عمل کر سکے اور اس دنیا میں کامیاب عمل وہی ہے جو منصوبہ بندی کے ساتھ انجام دیا گیا ہو۔

منفی سوچ نہیں

ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ احد پیش آیا۔ اس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ یہ غزوہ ہر اعتبار سے مخالفین اسلام کی جارحیت اور زیادتی پر مبنی تھا۔ بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ قرآن میں اس پر مخالفین کے لیے مذمت کی آیتیں اتریں۔ مگر برعکس طور پر قرآن میں وہ آیتیں اتریں جن میں خود مسلمانوں کو نصیحت کی گئی تھی —— قرآن میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ اگر احد کے موقع پر تم کو زخم پہنچا ہے تو اس سے پہلے بدر کے موقع پر فریق ثانی کو زخم پہنچ چکا ہے۔ اور یہ ایام ہم اسی طرح بدلتے رہتے ہیں (فَإِنْ اَصَابَكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ)

قرآن میں یہ انداز کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کا راز یہ ہے کہ زندگی کی تمام ترقیاں ان لوگوں کو ملتی ہیں جو مثبت طرز فکر کے حامی ہیں۔ غزوۂ احد کے حادثہ سے اندیشہ تھا کہ مسلمان انتقامی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں گے اور اس طرح وہ مثبت ذہن کو کھو دیں گے۔ اس خطرہ سے بچانے کے لیے قرآن میں مذکورہ قسم کا تبصرہ نازل کیا گیا۔ منفی نفسیات کے طوفان میں انھیں مثبت نفسیات کی طرف موڑ دیا گیا۔

یہی تدبیر دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپانیوں نے اختیار کی۔ دوسری عالمی جنگ میں امریکا نے جاپان کے صنعتی شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر اسے تباہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد جاپانیوں میں امریکا کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس وقت جاپان کے دانش وروں نے یہ کہہ کر اپنی قوم کو ٹھنڈا کیا کہ اگر امریکا نے ۱۹۴۵ میں ہمارے ہیروشیما کو تباہ کیا ہے تو اس سے پہلے ۱۹۴۱ میں ہم ان کے پرل ہاربر کو تباہ کر چکے تھے۔ اب معاملہ برابر ہو گیا۔ اب آؤ ہم یکسو ہو کر مستقبل کی تعمیر کریں۔ دانش وروں کی اس صحیح رہنمائی نے جاپانی قوم کے لیے تباہی کے باوجود ترقی کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔

یہی اس دنیا میں ترقی کا راز ہے۔ یہاں وہ لوگ ترقی کرتے ہیں جو منفی تجربہ کے باوجود اپنی مثبت سوچ کو باقی رکھیں، جو مخالف حالات میں بھی اپنے لیے موافق امکانات تلاش کر لیں۔ جو ناکامیوں کے ہجوم میں اپنے لیے کامیابی کا نیا راستہ دریافت کر لیں۔

اس دنیا میں بڑی ترقی صرف ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو خارج سے غیر متاثر رہ کر اپنا راستہ خود اپنی مثبت سوچ کے تحت بنائیں۔

ذہنی ارتقاء

الترمذی نے حضرت سعید الخذری کی ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— مومن خیر کی بات سننے سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ جنت کی منزل تک پہنچ جائے (لن یشبع المومن من خیر یسمعه، حتی یکون منتہاہ الجنة) جامع الاصول فی احادیث الرسول، صفحہ ۹

آدمی کو چاہیے کہ سیکھنے کا جذبہ اس کے اندر مسلسل بیدار رہے۔ وہ ہمیشہ نئی بات سیکھنے کا خواہش مند ہو۔ وہ اپنے تجربہ اور واقفیت میں ہر روز اضافہ کرتا رہے۔ یہاں تک کہ اسی حال میں اس پر موت آجائے۔

معلومات کی دنیا لامتناہی حد تک وسیع ہے۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس لیے ایک سچا انسان کبھی نئی نئی باتیں سیکھنے سے سیر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دماغ کے خزانہ میں ہر صبح و شام اضافہ کرتا رہتا ہے۔

یہی اضافہ انسانی ترقی کا راز ہے۔ اس طرح آدمی کا ذہنی ارتقا مسلسل جاری رہتا ہے۔ وہ سوچنے اور عمل کرنے کے نئے راستے دریافت کرتا رہتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی حقیقت آتی ہے تو وہ فوراً اس کو اس کی گہرائی تک سمجھ لیتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا معاملہ پڑتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ کامیاب معاملہ کا طریقہ کیا ہے۔ اس کے سامنے ایک راستہ بند ہوتا ہے تو وہ اپنے سفر کو جاری رکھنے کے لیے فوراً ہی دوسرا راستہ پا لیتا ہے۔

ایسے آدمی کی بڑھی ہوئی ذہنی استعداد اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ وہ حق کو حق کے روپ میں دیکھے اور باطل کو باطل کے روپ میں پہچان لے۔ وہ چیزوں کو ویسی ہی دیکھتا ہے جیسی کہ وہ ہیں، نہ کہ دکھانے والے جس روپ میں اس کو دکھا دیں۔ ایسا آدمی اس پوزیشن میں ہو جاتا ہے کہ وہ شبہات کا پردہ پھاڑ کر سچائی کو دیکھے۔ وہ مغالطہ اور استدلال کے درمیان فرق کر سکے۔ وہ جان لے کہ جذباتی نقطۂ نظر کیا ہے اور عقلی نقطۂ نظر کیا۔ ایسے آدمی کے اندر وہ چیز پرورش پاتی ہے جس کو تخلیقی ذہن کہا جاتا ہے۔ وہ چیزوں کو از سر نو دریافت کرتا ہے، وہ تقلید سے اوپر اٹھ کر مجتہدانہ رائے بنانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ وہ ظواہر کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھی زیادہ بہتر طور پر جان لیتا ہے، اور دوسروں کے بارہ میں بھی اس کے اندر زیادہ صحیح پہچان پیدا ہو جاتی ہے۔ عام انسان اگر صرف انسان ہوتا ہے تو ایسا آدمی پورے معنی میں ایک ترقی یافتہ انسان۔

نفع بخشی

قرآن کی سورہ نمبر ۱۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ: خدا نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق بہ نکلے۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا۔ اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی ابھر آتا ہے، جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لیے آگ میں پگھلاتے ہیں۔ اس طرح خدا حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے۔ اور جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے، اسی طرح خدا مثالیں بیان کرتا ہے (الرعد ۱۷)

دنیا کے پیدا کرنے والے نے اس کا نظام نفع بخشی کے اصول پر قائم کیا ہے۔ یعنی جو چیز دوسروں کے لیے مفید ہو وہ یہاں باقی رہے اور جو چیز اس اعتبار سے اپنی افادیت کھو دے وہ اسی طرح پھینک دی جائے جس طرح کوڑے کو بےکار سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

نفع بخشی کا آغاز آدمی کے اپنے دماغ سے ہوتا ہے۔ یعنی آدمی دوسروں کا خیرخواہ ہو، وہ اپنے فائدہ کے لیے سوچتے ہوئے یہ بھی اپنے دھیان میں رکھے کہ وہ دوسروں کے لیے کن صورتوں میں فائدہ پہنچانے والا بن سکتا ہے، دوسروں کے بارہ میں اس کے اندر ہمدردی کا جذبہ ہو نہ کہ بےتعلقی کا جذبہ۔

ہر آدمی سماج کے اندر زندگی گزارتا ہے۔ ہر آدمی کی سرگرمیاں سماج کے اندر جاری ہوتی ہیں جس آدمی کا طریقہ یہ ہو کہ وہ اپنا فائدہ چاہے اور صرف اپنے ذاتی تقاضوں کو پورا کرنے میں مشغول رہے، وہ گویا فطرت کے نقشہ کے خلاف کام کر رہا ہے اور جو آدمی فطرت کے نقشہ کے خلاف کام کرے وہ خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کی تعمیر اس طرح کرے کہ اس میں دوسروں کا بھی حصہ ہو۔ فطرت کے نظام کو استعمال کر کے جب وہ کوئی فائدہ حاصل کرے تو اس نے دوسروں کو بھی اس میں ضرور شریک کیا ہو۔ اس کا اصول یہ ہو کہ اس کو لینے کے ساتھ دینا بھی ہے، دوسروں سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ دوسروں کو فائدہ پہنچانا بھی۔

کائنات میں بقا صرف باہمی افادیت کو حاصل ہے۔ خودغرضانہ رویہ کے لیے اس کائنات میں کوئی جگہ نہیں۔ خدا کی اس دنیا میں یہی اصول انسان کے لیے بھی ہے اور بقیہ کائنات کے لیے بھی۔

امید کا نظام

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ——امید میری امت کے لیے اللہ کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ اگر امید نہ ہو تو کوئی پودا لگانے والا پودا نہ لگائے اور نہ کوئی ماں کسی بچہ کو دودھ پلائے (الامل رحمة من الله لامتی ولولاه لما غرس غارس شجراً ولا ارضعت امٌّ ولداً) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۲۳۳

دنیا کی زندگی میں انسان کو مسلسل تلخ تجربات پیش آتے ہیں۔ اس کو ایسے واقعات کے درمیان سے گزرنا ہوتا ہے جو بظاہر دل توڑ دینے والے ہیں۔ مگر انسان پھر بھی اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔

اس کا راز امید ہے۔ فطرت نے انسان کے اندر امید کا جذبہ اس طرح رکھ دیا ہے کہ وہ کبھی ختم نہ ہو، وہ برابر انسان کو سرگرم عمل رکھے۔

اس دنیا میں ہر کام تدریج کے ساتھ ہوتا ہے۔ کسان آج زمین میں بیج ڈالتا ہے اور بہت دنوں کے بعد اس کو اس کا پھل حاصل ہوتا ہے۔ ماں مصیبت اٹھا کر اپنے چھوٹے بچے کی پرورش کرتی ہے حالانکہ وہ وقت ابھی بہت دور ہوتا ہے جب کہ وہ بڑا ہو کر ماں کی خدمت کر سکے۔ لیکن ساری دنیا میں عورت اور مرد مسلسل اسی طرح متحرک ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہر ایک کے دل میں چھپا ہوا امید کا جذبہ اس کا سہارا بنا رہتا ہے۔ اگر یہ امید نہ ہو تو دنیا کی تمام سرگرمیاں ٹھٹھر کر رہ جائیں۔

تاہم بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی زیادہ بڑے نقصان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کو کوئی ایسا تجربہ پیش آجاتا ہے جو بظاہر اس کے سارے منصوبے کو تباہ کر دینے والا ہے۔ یہ انسان کے لیے امتحان کا ایک لمحہ ہوتا ہے۔ اگر وہ بدستور امید کے اوپر قائم رہے، وہ حال کے بجائے مستقبل پر اپنی نظر جمائے تو بہت جلد وہ پائے گا کہ حوصلہ شکنی کے سخت حالات میں بھی اس کے لیے امید کا امکان موجود تھا۔ مایوسی کی آخری حد تک جا کر بھی اس کے امکانات ختم نہیں ہوئے تھے۔ زندگی کے کچھ دروازے اس کے لیے اگرچہ بند ہو گئے لیکن کچھ اور دروازے پھر بھی اس کے لیے کھلے ہوئے تھے جن میں داخل ہو کر وہ اپنا سفر حیات کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکے۔

انس ومحبت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ مومن انس ومحبت والا انسان ہوتا ہے۔ اس آدمی میں کوئی خیر نہیں جو نہ دوسروں سے مانوس ہو اور نہ دوسرے اس سے مانوس ہوں۔ لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کو نفع پہنچانے والا ہو (المومن آلِفٌ مالوفٌ، ولا خیر فیمن لا یالف ولا یؤلف وخیر الناس انفعھم للناس) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۲۳۷

انسان جب اپنی صحیح فطرت پر قائم ہو تو وہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ اس حدیثِ رسولؐ میں بتایا گیا ہے۔ اس کے اندر ایسی صفات ہوتی ہیں جو لوگوں کو اس کی طرف مائل کر دیں۔ اسی طرح وہ خود دوسرے انسانوں سے الفت ومحبت کے ساتھ پیش آنے والا انسان ہوتا ہے۔ یہی وہ انسان ہیں جن کے ملنے سے ایک بہتر سماج وجود میں آتا ہے۔ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے والے ہوتے ہیں اور دوسروں سے بھی ان کو فائدہ کا تجربہ ہوتا ہے۔

جو لوگ دنیا میں اس طرح جئیں وہ خود بھی کامیاب ہوتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی کامیابی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ وہ پھول کی مانند ہوتے ہیں جو اپنے آپ میں بھی خیر ہوتا ہے اور پورے باغ کے لیے بھی خیر۔

ایسا انسان کینہ ونفرت جیسے جذبات سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے دل میں دوسروں کے لیے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ہر ایک کو اپنا سمجھتا ہے۔ ہر ایک کے لیے اس کے دل میں بہترین تمنائیں ہوتی ہیں۔ جب بھی کوئی شخص اس سے ملتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ پھول سے مل رہا ہے نہ کہ کسی کانٹے سے۔ اس کے پاس بیٹھنا الفت ومحبت کے ماحول میں بیٹھنا ہوتا ہے نہ کہ نفرت و وحشت کے ماحول میں بیٹھنا۔

ایسا آدمی جب دوسروں سے ملتا ہے تو وہ اس سے مسکرا کر ملتا ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی رعایت کرتا ہے۔ دوسروں کی خدمت کرنا اس کے لیے خوشی کا ایک تجربہ ہوتا ہے۔ دوسروں کے کام آنا اس کے لیے خود اپنی شخصیت کی تکمیل کے ہم معنی ہوتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ اس کی خیر خواہی کا جذبہ اس وقت بھی ختم نہیں ہوتا جبکہ دوسروں کی طرف سے اس کو کوئی ناخوش گوار تجربہ پیش آئے۔

ضرورت نہ کہ حرص

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— جو آدمی بقدرِ ضرورت پر قناعت نہ کرے تو وہ ساری زندگی غیر مطمئن حالت میں رہے گا (من لا یجزیہ من العیش مایکفیہ، لم یجد ماعاش مایغنیہ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۲۹۹

مطمئن زندگی کا تعلق زیادہ سے نہیں ہے بلکہ قناعت سے ہے۔ جو آدمی ضرورت کے بقدر پاکر مطمئن ہو جائے، وہی اس نعمت کو پا سکتا ہے جس کو اطمینان کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی ضرورت کے بجائے خواہش کو اپنا معیار بنائے وہ کبھی اطمینان کی زندگی نہیں پا سکتا۔ کیوں کہ ضرورت کی ایک حد ہے، مگر خواہش اور حرص کی کوئی حد نہیں۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ ضرورت اور حرص میں فرق کرے۔ وہ اپنی جدوجہد کا نشانہ ضرورت کی تکمیل کو بنائے نہ کہ خواہش کی تکمیل کو۔ جب ضرورت کو نشانہ بنایا جائے تو ہر چیز اپنی فطری جگہ پر رہتی ہے۔ آدمی ضرورت کی فراہمی کے بعد اس کا وقت پالیتا ہے کہ وہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد میں بھی اپنے آپ کو مصروف کر سکے۔ اس کے برعکس جب ضرورت کے بجائے حرص کو نشانہ بنالیا جائے تو آدمی صرف کمانے والا حیوان بن جاتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسا وقت نہیں بچتا جس میں وہ اعلیٰ انسانی تقاضوں کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔

ضرورت کو نشانہ بنانے کی صورت میں زندگی کا نظام اپنے فطری دائرہ میں ہوتا ہے۔ اس کے بجائے جب ضرورت کی حد سامنے نہ رکھی جائے بلکہ اپنی خواہش کو اپنا رہنما بنالیا جائے تو زندگی کا فطری نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ اور اس دنیا میں پُر عافیت زندگی وہی ہے جو فطرت کے نقشہ پر گزاری جائے۔

حرص کا معاملہ ہمیشہ مادی چیزوں میں پیش آتا ہے، نہ کہ اعلیٰ اقدار میں۔ ایسی حالت میں جو آدمی اپنی حرص کے پیچھے دوڑے اس نے گویا اپنی آدمیت کو گھٹا لیا۔ کیوں کہ مادی ضروریات آدمی کی زندگی کا جز ہیں نہ کہ کل۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اعلیٰ انسانی مقاصد کو اپنی زندگی میں پہلی اہمیت کا درجہ دے اور مادی چیزوں کی فراہمی کو دوسرے درجہ میں رکھے۔

زھد کا فائدہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ، تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے۔ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبت ہو جاؤ، تم لوگوں کے محبوب بن جاؤ گے (ازھد فی الدنیا یحبك اللہ وازھد فیما فی ایدی الناس یحبك الناس) ادب الدنیا والدین ۳۰۱

عزت و محبت کا راز بے نیازی ہے۔ آدمی کے اندر جتنا زیادہ بے نیازی کی کیفیت پیدا ہوگی اتنا ہی زیادہ لوگوں کے لیے اس کی کشش بڑھتی چلی جائے گی۔

خدا سے قریب ہونے کا راز دوسروں سے دور ہونا ہے۔ آدمی جتنا زیادہ دوسری چیزوں سے بے رغبت ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ خدا کے بارے میں سوچے گا اور خدائی چیزوں میں مشغول ہوگا۔ اس کے برعکس آدمی جتنا زیادہ دوسری چیزوں میں اپنا دل لگائے گا اتنا ہی وہ خدا کی طرف سے غفلت میں پڑ جائے گا۔ دوسری چیزوں سے تعلق کا بڑھنا خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو گھٹاتا ہے۔ اسی طرح خدا سے اپنے تعلق کو بڑھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا قلبی تعلق دوسری چیزوں کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔

لوگ ایسے آدمی کی عزت کرتے ہیں جس کو وہ اپنے سے اونچا سمجھتے ہوں۔ جو آدمی انھیں اپنے برابر یا اپنے سے کم دکھائی دے اس کے لیے لوگوں کے اندر عزت و قدردانی کا اعلیٰ جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جو آدمی سماج میں اس طرح رہے کہ وہ دوسروں سے بے نیاز بنا ہوا ہو، وہ دوسروں سے کسی چیز کا امیدوار نہ ہو، ایسا انسان اپنے آپ دوسروں کے درمیان اونچا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ کسی کوشش کے بغیر وہ دوسروں کی نظر میں محترم بن جاتا ہے۔

دنیا کی چیزوں سے بے رغبتی آدمی کو بیک وقت دو فائدے دیتی ہے۔ ایک طرف وہ پُر عافیت زندگی کا مالک بن جاتا ہے، وہ اعلیٰ حقیقتوں میں جینے لگتا ہے۔ دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ سماج کے درمیان اپنے آپ عزت و احترام کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی نظر میں بھی باعزت آدمی بن جاتا ہے اور دوسروں کی نظر میں بھی۔

زاھدانہ زندگی نام ہے چھوٹی چیز کو کھو کر زیادہ بڑی چیز کو پالینا۔

علم کی اہمیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— علم خزانہ کی مانند ہے اور اس کی کنجی سوال ہے۔ اللہ تم پر رحم کرے تم سوال کیا کرو۔ کیونکہ علم میں تین لوگ اجر پاتے ہیں۔ کہنے والا، سننے والا اور لے لینے والا (العلم خزائنُ ومفتاحه المسألة، فاسألوا رحمکم الله، فانّما یُوجرُ فی العلم ثلاثة، القائلُ والمستمع والآخذُ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۱۰

علم کی دنیا ایک لامحدود دنیا ہے۔ یہ دنیا معلومات کے خزانہ سے بھری ہوئی ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جو سارے علوم اور تمام معلومات اپنے دماغ میں بھرے ہوئے ہو۔ کسی کے پاس اس کا کچھ حصہ ہے اور کسی کے پاس اس کا کچھ۔

مختلف انسانوں کے پاس جمع شدہ یہ خزانہ آپ کو کس طرح ملے، اس کی صورت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آپ اس کے طالب بن جائیں۔ آپ کے دل میں ان کو حاصل کرنے کا بے پناہ شوق پیدا ہو جائے۔ جب ایسا ہوگا تو آپ لوگوں سے پوچھنے لگیں گے تاکہ ان کے پاس جمع شدہ معلومات کو لے کر اپنے علمی ذخیرہ کو بڑھائیں۔ آپ اہل علم کی کتابیں پڑھیں گے تاکہ ان کے اندر علم کا جو خزانہ بند ہے، اپنے آپ کو اس کا حصہ دار بنا سکیں۔

انسان کی ساری اہمیت علم کے اعتبار سے ہے۔ جو انسان جتنا زیادہ علم والا ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ قابل قدر ہوگا۔ زندگی کی ہر ترقی براہ راست طور پر علم سے جڑی ہوتی ہے، جتنا زیادہ علم اتنا ہی زیادہ ترقی۔

علم کے معاملہ میں ہر آدمی کی تین میں سے کوئی ایک حیثیت ہوتی ہے —— قائل، مستمع، آخذ۔ یعنی کہنے والا اور سننے والا اور ماننے والا۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جس حیثیت میں پائے، وہ اس کا پورا حق ادا کرے۔ اگر اس کو بولنے کا موقع مل رہا ہے تو وہ ذمہ دارانہ کلام کرے۔ وہ وہی بولے جو اس کو بولنا چاہیے، وہ ایسا کلام نہ کرے جو حقیقتِ واقعہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اس کا بولنا حقیقت کے اظہار کے لیے ہو نہ کہ خود نمائی کے لیے۔ اسی طرح جو سن رہا ہے اس پر بھی لازم ہے کہ وہ سننے کا حق ادا کرے۔ وہ کہی ہوئی بات کو پورے دھیان کے ساتھ سنے اور اس کو اسی معنی میں لے جس معنی میں لینے والے نے اس کو کہا ہے۔

حقیقت کی اہمیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — تھوڑا علم زیادہ عبادت سے بہتر ہے (قليل العلم خيرٌ من كثير العبادة) ادب الدنيا والدين للبصري، صفحہ ۴۴۔

اس حدیث میں جو تقابل ہے وہ حقیقی علم اور ظاہری عبادت کے درمیان ہے نہ کہ سادہ طور پر صرف علم اور عبادت کے درمیان۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اگر ظاہری عبادت بہت زیادہ کرے تو اتنی قابل قدر بات نہیں ہے جتنا یہ بات کہ ایک شخص علم میں محنت کرے اور اس سے حکمت و معرفت کا خزانہ حاصل کرلے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود عبادت کا تعلق علم سے بہت گہرا ہے۔ جو آدمی گہرا علم رکھتا ہو وہ اسی کے ساتھ گہری معرفت والا انسان ہوگا۔ اور یہ گہری معرفت ہی عبادت کی اصل روح ہے۔ عبادت صرف ظاہری مراسم کا نام نہیں ہے بلکہ اس اسپرٹ کا نام ہے جو عبادت کے اندر موجود ہوتی ہے۔ یہ اسپرٹ ہی عبادت کو عبادت بناتی ہے اور یہ اسپرٹ علم کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔

علم آدمی کے ذہن کو جگاتا ہے۔ وہ اس کو بےشعوری سے نکال کر شعور کے مرحلہ میں پہنچاتا ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو درست طور پر استعمال کرسکے۔ علم آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھے اور اس کے لیے کامیاب منصوبہ بندی کرے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے اوپر بیک وقت دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک، خدا کی نسبت سے۔ اور دوسرے، انسان کی نسبت سے۔ انہی دونوں ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کرنے کا نام کامیابی ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک ذمہ داری بھی اگر چھوٹ جائے تو آدمی کی زندگی ادھوری رہ جائے گی۔ وہ کامل انسان کہلانے کا مستحق نہیں قرار پائے گا۔ علم انہی دونوں ذمہ داریوں کا صحیح شعور دیتا ہے۔ وہ آدمی کو کامل منصوبہ بندی کے قابل بناتا ہے۔

کسی چیز کی اہمیت اس کے باطن سے ہوتی ہے نہ کہ اس کے خارج سے۔ وہی انسان کامیاب ہے جو باطنی اہمیت والی چیز اپنے اندر رکھتا ہو۔ صرف خارجی ظواہر نہ خدا کی نظر میں قابل قدر ہیں اور نہ انسان کی نظر میں۔

کامیابی کا راز

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— تم اپنی پسندیدہ چیز کو صرف اس وقت پا سکتے ہو جب کہ تم اپنی ناپسندیدہ چیز پر صبر کرو۔ اور جو کچھ تم چاہتے ہو اس کو تم اپنی خواہشوں کو چھوڑے بغیر حاصل نہیں کر سکتے (انکم لا تنالون ما تحبون الا بالصبر علی ما تکرهون ولا تبلغون ما تهوون الا بترك ما تشتهون) ادب الدنیا والدین البصری، صفحہ ۸۶

موجودہ دنیا فطرت کے جس اصول پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ یہاں پانے کے لیے کھونا پڑتا ہے۔ یہاں ایک پسندیدہ چیز کو حاصل کرنے کے لیے کسی دوسری پسندیدہ چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہاں کامیابی کی منزل پر پہنچنا اس کے لیے مقدر ہے جو راستہ کی ناکامیوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اسی کا نام صبر ہے۔ صبر کی صفت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی مطلوب چیز کو حاصل کرنے کی ضروری قیمت ادا کر سکے۔ صبر آدمی کو حوصلہ مند بناتا ہے۔ صبر کے ذریعہ آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ ان ناخوش گواریوں کو پرسکون طور پر جھیل سکے، جن کا پیش آنا ہر معاملہ میں ضروری ہے۔ خواہ وہ دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا معاملہ ہو۔

درخت سے پھول لینے کے لیے آدمی کو کانٹوں سے نباہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سماج کے اندر اپنے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان ناخوش گواریوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے جو لازمی طور پر دوسروں کی طرف سے پیش آتی ہیں۔ آدمی کا مقصد جتنا زیادہ بلند ہو اتنی ہی زیادہ دشواریاں اس کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ آدمی اس قسم کی تمام ناگواریوں کو گوارا کرے تاکہ وہ اپنی پوری قوت کو یکسوئی کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول میں لگا سکے۔

ناخوش گواریوں پر صبر کرنا اپنے اندر ایک مثبت پہلو رکھتا ہے۔ اس سے قوتِ ارادی بیدار ہوتی ہے۔ وہ آدمی کے عملی جذبہ کو بڑھاتی ہے۔ اس طرح آدمی مزید اضافہ کے ساتھ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کو زیادہ کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکے۔

اس دنیا میں ایک چیز کو پانے کے لیے دوسری چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہاں آدمی اپنی ایک خواہش کی تکمیل اس وقت کر پاتا ہے جب کہ وہ اپنی ایک اور خواہش کو اس کی خاطر چھوڑ دے۔

علم کی طلب

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— اچھا سوال کرنا آدھا علم ہے (حسن السوال نصف العلم) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۱۱۱

اچھا یا گہرا سوال کون کرتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے، جس کی بابت وہ سوال کر رہا ہے۔ مسئلہ کے بارہ میں اچھی واقفیت کے بغیر کوئی اچھا سوال نہیں کر سکتا۔ اچھا سوال اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی علم کے نصف حصہ کو پا چکا ہے، اور اب جواب دینے والے کا کام یہ ہے کہ وہ بقیہ نصف کے بارہ میں بتا کر اس کی واقفیت کو مکمل کر دے۔

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کے پاس علم کا جو ذخیرہ ہے۔ اس کو اپنے لیے حاصل کریں تو سب سے پہلے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرنا ہوگا۔ اپنی علمی استعداد کو بڑھانے کے بعد ہی آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے سے واقعی استفادہ کر سکے۔ یا کسی کی لکھی ہوئی کتاب کو پڑھ کر اس کی معلومات کو اپنے ذہن میں اتار سکے۔

سوال اور جواب یا سیکھنا اور سکھانا یہ یک طرفہ عمل نہیں ہے بلکہ وہ دو طرفہ عمل ہے۔ یعنی سوال کرنے والا یا سیکھنے والا ذہنی طور پر جتنا زیادہ تیار ہوا تنا ہی زیادہ وہ جواب دینے والے یا سکھانے والے کی بات کو سمجھے گا اور اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔ یعنی اگر آپ کے پاس علم کا نصف حصہ موجود ہو تو اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ دوسرا شخص آپ کو علم کا بقیہ نصف حصہ دے سکے۔ یہ دو طرفہ معاملہ ہے نہ کہ یک طرفہ معاملہ۔

دنیا علم سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا ایک دریا اہلِ علم اور اہلِ دانش لوگ ہیں۔ اس کا دوسرا دریا وہ کتابیں ہیں جو دنیا کے بہترین دماغوں نے لکھی ہیں اور وہ چھپ کر کتب خانوں میں اکٹھا ہو گئی ہیں۔ اس کا تیسرا ذریعہ ہمارے سامنے پھیلی ہوئی کائنات ہے، اس کا ہر جزا اپنے اندر معرفت کا ایک چھپا ہوا خزانہ لیے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص علم کا طالب ہو وہ کسی بھی لمحہ کسی بھی مقام پر اپنے لیے علم کا ایک کھلا ہوا خزانہ پا لے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی حقیقی معنوں میں علم کا طالب ہو، وہ اپنے اندر پانے کا استحقاق پیدا کر چکا ہو۔

نصیحت پذیری

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— سعادت مند وہ ہے جو اپنے سوا دوسرے سے نصیحت حاصل کرے (السعید من وعظ بغیرہ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۵۶۱

نصیحت حاصل کرنے کا تعلق نصیحت پسند مزاج سے ہے۔ کوئی آدمی جتنا زیادہ نصیحت کو قبول کرنے کا مزاج اپنے اندر رکھتا ہو اتنا ہی زیادہ وہ نصیحت حاصل کرے گا۔ خود اپنے اندر نصیحت پسندی کا مزاج نہ ہو تو وہ کچھ بھی نصیحت نہ حاصل کر سکے گا، خواہ وہ نصیحتوں کے ڈھیر کے درمیان زندگی گزار رہا ہو۔

جس آدمی کے اندر نصیحت لینے کا مزاج بیدار ہو گیا ہو، وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی اس کو بتائے تب اس کو نصیحت ملے۔ بلکہ وہ دوسروں کو دیکھ کر ان سے نصیحت پکڑتا رہتا ہے۔ وہ کسی کو اچھا کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اپنے آپ اس کے اندر اس کی پیروی کا شوق پیدا ہوتا ہے اور وہ خود بھی ویسا ہی کرنے لگتا ہے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس کے سامنے غلط بات بولے یا غلط کام کرے تو ایسا واقعہ بھی اس کے لیے نصیحت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ اس کو سن کر یا دیکھ کر چوکنا ہو جاتا ہے اور اپنے اندر یہ عزم کر لیتا ہے کہ وہ کبھی ایسی بات نہیں بولے گا اور نہ کبھی ایسا کام کرے گا۔

اس معاملہ میں انسان کی مثال بارش جیسی ہے۔ کسی میدان میں بارش ہو تو وہ چٹانوں پر بھی گرتی ہے اور کھیت کی زرخیز زمینوں پر بھی۔ لیکن چٹان کے اوپر گرنے والا پانی اوپر اوپر بہہ جاتا ہے وہ اس کے اندر داخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس کھلی زمین میں جو پانی گرتا ہے وہ اس کے اندر جذب ہو جاتا ہے اور ہری بھری فصل پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

کوئی آدمی بھی کامل نہیں۔ ہر آدمی کی ضرورت ہے کہ اس کو نصیحت ملے تاکہ وہ اپنی اصلاح کر کے اپنی شخصیت کو مکمل کر سکے۔ لیکن یہ عمل نصیحت پذیر ذہن کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ سعادت مند شخص وہ ہے جو اپنے ذہن کو نصیحت سننے اور نصیحت قبول کرنے کے لیے کھلا رکھے۔ کوئی نفسیاتی پیچیدگی اس کے لیے نصیحت کو قبول کرنے میں رکاوٹ نہ بنے۔ وہ ہر حال میں نصیحت سے فائدہ اٹھائے، حتیٰ کہ اس کی نصیحت پذیری اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ وہ بگڑے ہوئے لوگوں سے بھی اصلاح کا سبق حاصل کرے۔

نصیحت اگرچہ دوسرے سے ملتی ہے لیکن وہ آدمی کا اپنا معاملہ ہے، وہ ہر آدمی کی خود اپنی ضرورت ہے۔

دانش مندی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— دانش مند سے رہنمائی حاصل کرو تم راہ یاب ہوگے اور اس کے خلاف نہ کرو ورنہ تم پشیمان ہوگے (استرشدوا العاقل ترشدوا ولا تعصوه فتندموا) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۴۰۵

انسان سب یکساں نہیں ہوتے۔ کسی کے پاس علم کم ہوتا ہے اور کسی کے پاس علم زیادہ، کوئی زیادہ تجربہ کار ہوتا ہے اور کوئی کم تجربہ کار۔ اسی طرح کوئی شخص فطری طور پر زیادہ سوجھ بوجھ والا ہوتا ہے اور کوئی کم سوجھ بوجھ والا۔ یہ فرق اس لیے ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے سے فائدہ اٹھائیں۔ ایک آدمی اگر اپنے اندر کمی پائے تو وہ دوسرے کے ذریعہ اپنی اس کمی کو پورا کرے۔

یہ فطرت کا نظام ہے اور جو چیز خود فطرت کے نظام سے تعلق رکھتی ہو، اس سے موافقت کرکے ہی آدمی کامیاب ہوتا ہے۔ فطرت کے نظام کی خلاف ورزی کرنے کا انجام تباہی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جانے اور اسی کے ساتھ وہ دوسرے سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔ جو آدمی اس طرح بے لاگ طور پر اپنے آپ کو اور دوسرے کو جانے گا اس کا مزاج یہی ہوگا کہ ہر موقع پر وہ ان لوگوں سے رہنمائی حاصل کرے گا جو اس سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے ہیں یا علم اور تجربہ میں اس سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور ایسے لوگوں سے اس کو جو رہنمائی ملے گی اس کو وہ کھلے دل سے قبول کرلے گا۔ کیونکہ وہ جانے گا کہ ایسے موقع پر کوئی اور عمل کرنا اس کو تباہی کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔

کوئی آدمی جب دانش مند کی بات کو نہیں مانتا تو وہ کیوں ایسا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے معاملہ کو اپنے لیے ساکھ کا مسئلہ بنالیتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے دوسرے کی بات مان لی تو میں اس کے مقابلہ میں نیچا ہو جاؤں گا۔ مگر اس طرح کی سوچ سراسر نادانی کی سوچ ہے، اس طرح کے معاملہ کو ساکھ یا عزت نفس کا مسئلہ بنانا اپنی کامیابی اور ترقی کے دروازہ کو خود اپنے ہاتھوں سے بند کرلینا ہے۔ دانش مند کی بات کو نہ ماننا بظاہر دوسرے کی بات کو نہ ماننا ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ خود اپنا انکار ہے۔ آدمی جب کسی دوسرے کی ایک سچی بات کو نہیں مانتا تو وہ گویا خود اپنی فطرت اور اپنے ضمیر کو رد کر رہا ہے، یہ بلاشبہ سب سے بڑا نقصان ہے۔

انجام کا لحاظ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — جب تم کسی کام کا قصد کرو تو پہلے اس کے انجام کے بارہ میں سوچو، اگر وہ درست ہو تو اس کو کرو اور اگر وہ درست نہ ہو تو اس سے رک جاؤ (اذا هممت بامر فتفکر فی عاقبتہ، فان کان رشداً فامضہ وان کان غیاً فانتہ عنہ) ادب الدنیا والدین، صفحہ ۵۶۲

کائنات میں صرف خدا کی ہستی ایک ایسی ہستی ہے جس کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ کوئی فعل کرے تو اسے اس کے برے انجام کا کوئی خوف نہ ہو (ولا یخاف عُقبٰہا)۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے وہ ایک محدود اور بے زور مخلوق ہے۔ اس کے لیے ایسی کارروائی ممکن نہیں جس میں اس کے انجام پر غور نہ کیا گیا ہو، اور اگر کوئی شخص ایسی کارروائی کرے تو اس کا برا نتیجہ سب سے زیادہ اسی کو بھگتنا پڑے گا۔

انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں اس کے جیسے دوسرے بہت سے انسان ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے اغراض کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ اسی کے ساتھ مختلف قسم کی مادی طاقتیں ہیں جو خود اپنے قانون کے تحت عمل کر رہی ہیں۔ اس طرح گویا انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں اس کو مخالفین سے بھرے ہوئے ماحول میں اپنے مقصد کے لیے عمل کرنا ہے۔

ایسی حالت میں انسان کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ آدمی کوئی عمل شروع کرنے سے پہلے اس کے ہر پہلو پر غور کرے، وہ ایک طرف اپنی طاقت کا اندازہ کرے اور دوسری طرف بے لاگ طور پر یہ دیکھے کہ خارجی دنیا میں کتنے اسباب اس کے موافق ہیں اور کتنے اسباب اس کے مخالف۔ آدمی کو چاہیے کہ اس طرح کے گہرے جائزہ کے بعد وہ اپنے عمل کا منصوبہ بنائے۔

اگر آپ ایسا کریں کہ حالات کے گہرے جائزہ کے بغیر اپنی کارروائی شروع کر دیں تو عین ممکن ہے کہ آپ کا عمل الٹا نتیجہ پیدا کرے۔ نہ صرف یہ کہ آپ کو متوقع فائدہ حاصل نہ ہو بلکہ اقدام سے پہلے آپ کو جو کچھ حاصل تھا وہ بھی غلط اقدام کے نتیجہ میں تباہ ہو جائے۔ اس طرح کا انجام بھگتنے کے بعد اگر آپ اس کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرائیں تو یہ ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہوگا۔ اس لیے کہ آپ کو جو نقصان ہوا وہ خود آپ کی غلطی کی قیمت تھی جو حالات نے بے رحمانہ طور پر آپ سے وصول کی۔

عقل مند کون

اسلام کے دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق رضی نے کہا کہ — عقل مند وہ نہیں ہے جو خیر اور شر کو جانے بلکہ عقل مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے خیر کون سا ہے (لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر ولکنہ الذی یعرف خیر الشرین) العبقریات الاسلامیہ للعقاد، صفحہ ۵۰۵

زندگی کا معاملہ بے حد نازک معاملہ ہے۔ یہاں ہر انسان کو آزادی ہے۔ ہر انسان اپنی اپنی دوڑ لگا رہا ہے۔ ہر انسان اپنے مقصد کے حصول میں مصروف ہے۔ اس لیے یہاں کسی کو بھی اپنے عمل کے لیے کھلا میدان نہیں ملتا۔ ہر ایک کو بھری ہوئی سڑک پر اپنا راستہ طے کرنا ہوتا ہے۔ اس صورت حال نے اس کو ناممکن بنا دیا ہے کہ آدمی اپنی خواہش کے مطابق اپنے لیے کامل معنوں میں ایک معیاری دنیا کو پالے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی آدمی کے لیے جو انتخاب ہے وہ خیر اور شر کے درمیان نہیں ہے بلکہ اس میں ہے کہ دو شر میں سے کمتر شر کون سا ہے۔ اس دنیا میں کمتر شر پر راضی ہونا دانش مندی ہے اور کمتر شر پر راضی نہ ہو کر خیر کامل کے لیے دوڑنا بے دانشی، کیوں کہ ایسا خیر اس دنیا میں کسی کو ملنے والا ہی نہیں۔

کمتر شر پر راضی ہونے والا اپنے لیے عمل کا آغاز پا لیتا ہے۔ اس کا تعمیری عمل فوراً ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ کمتر شر پر راضی نہ ہوں وہ غیر ضروری طور پر اس سے لڑ جائیں گے صرف اس لیے کہ ایک کمتر شر کو ہٹا کر دوبارہ دوسرے کمتر شر کو اپنے اوپر مسلط کر لیں اور مزید اس نقصان کو بھگتیں کہ تعمیر و ترقی کے لیے عمل کرنے کے جو مواقع انھیں حاصل تھے وہ استعمال ہوئے بغیر رہ گئے۔

جو آدمی حقیقت کا گہرا شعور رکھتا ہو وہ یہی کرے گا کہ کمتر شر پر راضی ہو کر اپنی قوتوں کو مثبت تعمیر کے میدان میں لگا دے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ گہری سوجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں وہ خیر کامل کے حصول کے نام پر بے معنی لڑائی چھیڑ دیں گے اور جب اس کا یہ انجام سامنے آئے گا کہ ملے ہوئے مواقع بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے تو وہ اپنے مفروضہ دشمنوں کی مذمت کرنے لگیں گے۔ حالانکہ جو نقصان انھیں پیش آیا ہو گا وہ خود ان کی نادانی کا نتیجہ ہو گا نہ کہ کسی دوسرے کی ظلم و زیادتی کا نتیجہ۔

ملے ہوئے پر راضی ہونا آدمی کے لیے ترقی کا دروازہ کھولتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو جان لیں وہی اس قابل ہیں کہ انھیں دانش مند کہا جائے۔

فکری توازن

قرآن کی سورہ نمبر ۵۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— کوئی مصیبت نہ زمین میں آتی ہے اور نہ تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں لکھی ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان کو پیدا کریں، بے شک یہ خدا کے لیے آسان ہے۔ تاکہ تم غم نہ کرو اس پر جو تم سے کھویا گیا اور نہ اس چیز پر فخر کرو جو اس نے تم کو دیا۔ اور خدا اترانے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا (الحدید ۲۳، ۲۲)

موجودہ دنیا میں آدمی کبھی محرومی سے دوچار ہوتا ہے اور اس کے زیر اثر وہ مایوسی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی وہ کامیابی کا تجربہ کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں ہی صورتیں ہلاکت کی صورتیں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی انسان کو ترقی کی طرف لے جانے والی نہیں۔

انسان جب کھوتا ہے تو وہ کیوں کھوتا ہے، اور جب وہ پاتا ہے تو وہ کیوں پاتا ہے۔ دونوں ہی کا تعلق فطرت کے نظام سے ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ دنیا امتحان کی مصلحت کے تحت بنائی گئی ہے۔ اس کا پورا نظام اسی مصلحت کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں کھونے کا واقعہ بھی امتحان کا ایک پرچہ ہے، اور پانے کا واقعہ بھی امتحان کا ایک پرچہ۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ دونوں ہی قسم کے واقعہ کو امتحان کے نقشہ میں رکھ کر سمجھے، نہ کہ انھیں صرف اپنے ذاتی واقعہ کے طور پر دیکھنے لگے۔ انسان کو جاننا چاہیے کہ اس نے جب کھویا تو اسی لیے کھویا کہ فطرت کے نقشہ میں ایسا ہی ہونا مقدر تھا۔ اسی طرح جب اس نے پایا تو اس لیے پایا کہ فطرت کے نقشہ کا تقاضا یہی تھا۔ دونوں حالتوں میں اصل کارفرما حیثیت فطرت کی ہے نہ کہ آدمی کی اپنی خواہشوں یا کوششوں کی۔

آدمی اگر اس حقیقت کو سمجھ لے تو اس کے اندر اپنے آپ یکسانیت آجائے گی، وہ دونوں قسم کے تجربوں کے درمیان معتدل روش پر قائم رہے گا۔ یہ عقیدہ آدمی کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ نقصان کا تجربہ پیش آنے کی صورت میں مایوس ہو جائے، اور اس طرح وہ اپنے آپ کو غیر ضروری طور پر ایک اور نقصان میں مبتلا کرلے۔ اسی طرح یہ عقیدہ آدمی کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ کامیابی کا تجربہ پیش آنے کی صورت میں فخر و ناز کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے، اور اس کے نتیجہ میں وہ اپنی دنیا کو بھی تباہ کرلے اور آخرت کو بھی۔

علم و فہم

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــ خدا جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کا فہم عطا کر دیتا ہے (من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین)
بخاری و مسلم بحوالہ مشکاۃ المصابیح ا صفو ۰۰

اس حدیث کا تعلق محدود طور پر صرف دین سے نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی انسان کے لیے سب سے زیادہ اہمیت کی بات یہ ہے کہ اس کے اندر فہم و حکمت کی صلاحیت موجود ہو۔ فہم و حکمت کے بغیر کوئی آدمی نہ دین کے کسی معاملہ کو سمجھ سکتا ہے اور نہ دنیا کے کسی معاملہ کو۔

موجودہ دنیا کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ایک بات کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں، یہاں ایک بات کی تشریح الگ الگ اور متضاد الفاظ میں کی جا سکتی ہے، یہاں مختلف حقیقتیں ایک دوسرے سے اس طرح ملی جلی ہوتی ہیں کہ ان میں امتیاز کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

اس دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک عمل ایک رخ سے دیکھنے میں ٹھیک نظر آتا ہے اور دوسرے رخ سے دیکھنے میں بے ٹھیک۔ یہاں حقیقتیں اس طرح ملی جلی ہیں کہ وہ صورت پیدا ہو گئی ہے جس کو قرآن میں التباس (الانعام ۹) کہا گیا ہے۔ اس بنا پر صرف وہی شخص حقیقتوں کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکتا ہے جس کے اندر فہم و تدبر کی صلاحیت موجود ہو۔

زندگی میں ایک صورت پیش آئے تو عین ممکن ہے کہ ایک شخص جس کو فہم اور سوجھ بوجھ حاصل نہ ہو وہ یہ کہے کہ ہمیں بہادر بن کر اس کے خلاف اقدام کرنا چاہیے، لیکن صاحب فہم آدمی معاملہ کی نزاکتوں کو سمجھے گا اور کہے گا کہ یہ موقع پر جوش اقدام کا نہیں ہے بلکہ خاموش تدبیر کا ہے۔ اسی طرح فہم سے خالی آدمی ایک معاملہ کو جنگ کا مسئلہ سمجھے گا جب کہ صاحب فہم کے نزدیک وہ دفاع کا مسئلہ ہوگا۔ کسی معاملہ میں فہم سے خالی آدمی کا کام اس کو سمجھے گا کہ وہ کھوئے ہوئے کے پیچھے دوڑے۔ اس کے برعکس صاحب فہم آدمی یہ کہے گا کہ کھونے کے بعد بھی جو کچھ حاصل ہے اس میں اپنی محنتوں کو لگاؤ۔

اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو فقہ و فہم کی یہ استعداد اپنے اندر رکھتے ہوں۔

تدبیر کار

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ سب سے بہتر عقل تدبیر کرنا ہے اور سب سے بہتر پرہیزگاری رک جانا ہے (لا عقل کالتدبیر ولا ورع کالکف) ابن ماجہ، کتاب الزہد

جب کوئی ناخوش گوار صورت حال پیش آئے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ جذبات سے بھڑک اٹھتے ہیں، اور فوری طور پر جوابی کارروائی شروع کر دیتے ہیں مگر یہ نہ عقل ہے اور نہ پرہیزگاری۔

بہتر اور کامیاب طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی سوجھ بوجھ کو استعمال کرے اور پیش آمدہ صورت حال کے مقابلہ میں کوئی ایسی تدبیر تلاش کرے جس سے مقابلہ آرائی کے بغیر مسئلہ حل ہوتا ہو۔ کوئی مسئلہ خواہ بظاہر وہ کتنا ہی زیادہ سنگین نظر آتا ہو، وہ وقتی ہوتا ہے۔ فوری نوعیت کی جوابی کارروائی صرف اس کی پیچیدگی کو بڑھاتی ہے اور اس کی مدت کو غیر ضروری طور پر لمبا کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس تدبیر کا انداز براہ راست یا بالواسطہ انداز میں اس کی شدت کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کو بڑھنے کے بجائے گھٹنے کی طرف ڈال کر ایسا بنا دیتا ہے کہ دھیرے دھیرے وہ اپنے آپ ختم ہو جائے۔

اسی طرح بعض اوقات ناخوش گوار صورت حال کے خلاف اقدام نہ کرنا سب سے بڑا اقدام ہوتا ہے، اور کارروائی نہ کرنا سب سے بڑی کارروائی۔ جس آدمی کے اندر سچی پرہیزگاری موجود ہو وہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہوگا۔ مخالف کی مخالفانہ کارروائی کے باوجود اس کے اندر انتقام کی آگ نہیں بھڑکے گی، وہ یک طرفہ طور پر ٹھنڈا بنا رہے گا۔ اپنی اس نفسیات کی بنا پر وہ جان لے گا کہ مجھ کو صرف یہ کرنا ہے کہ میں کچھ نہ کروں۔ میری طرف سے موثر جوابی کارروائی صرف یہ ہے کہ میں یک طرفہ طور پر خاموشی اختیار کر لوں۔

عقل آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ معاملہ کو زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھے۔ ایسا آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ مخالفت کے توڑ کے لیے زیادہ موثر تدبیر کر سکے۔ اسی طرح جس آدمی کے اندر سچی پرہیزگاری ہو وہ رکنے کی حکمت کو جان لیتا ہے۔ وہ اس راز سے واقف ہو جاتا ہے کہ کبھی نہ کرنے کا نام کرنا ہوتا ہے اور نہ بولنے کا نام بولنا۔

جو آدمی اپنی عقل کو صحیح طور پر استعمال کرے وہ ہر صورت حال کے مقابلہ کے لیے کوئی نہ کوئی موثر تدبیر تلاش کر لے گا خواہ وہ صورت حال بظاہر کتنی ہی زیادہ سنگین کیوں نہ ہو۔

فراست کا راز

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــ مومن کی فراست سے بچو کیونکہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے (اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله) الترمذی، کتاب التفسیر

جو انسان اپنے آپ کو مادی چیزوں سے اس طرح اوپر اٹھائے کہ وہ حقیقتِ اعلیٰ میں جینے لگے، وہ ایک بے پناہ انسان بن جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو بے خطا انداز میں سوچے اور درست انداز میں منصوبہ بندی کرے، اور جس آدمی کے اندر یہ صفت پیدا ہو جائے اس کو کوئی مغلوب نہیں کر سکتا۔

موجودہ دنیا میں انسان کی ہر ناکامی غلط سوچ اور غلط منصوبہ بندی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ غلط سوچ کیا ہے، غلط سوچ یہ ہے کہ آدمی جذبات و خواہشات کے تحت سوچے، وہ محبت و نفرت کے تحت اپنی رائے قائم کرے۔ ایسے انسان کی سوچ کبھی مطابقِ واقعہ نہیں ہو سکتی۔ جب کہ اس دنیا میں کامیابی یہ ہے کہ آدمی کی سوچ مطابقِ واقعہ ہو اور اس کا عمل بھی مطابقِ واقعہ۔

جو آدمی اپنی خواہشات کے تحت سوچتا ہو، جو مادی مفادات کو سب سے زیادہ اہم بنائے ہوئے ہو، وہ اپنی فکر کے اعتبار سے محدود دائرہ میں بند رہتا ہے۔ اس کو اپنے احساسات کی خبر ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے اور دوسروں کے احساسات کی خبر ضرورت سے بہت کم۔ وہ صرف اپنی ذات کی رعایت کرنا جانتا ہے، دوسروں کی رعایت کرنے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، ایسا آدمی دوسروں کے لیے آسان شکار بن جاتا ہے۔ وہ اپنی غیر حقیقی منصوبہ بندی کی بنا پر اپنے آپ کو اس طرح کمزور بنا لیتا ہے کہ جو بھی چاہے اس کو زیر کر لے۔

اس کے برعکس جو آدمی اپنے ذاتی خول سے باہر جی رہا ہو، جو خود فریبی کی نفسیات سے نکل کر حقائق کی دنیا میں پہنچ گیا ہو۔ ایسے آدمی کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اس کی سوچ اور خارجی حقیقت میں کوئی تضاد نہیں ہوتا، اس کی منصوبہ بندی میں بیرونی حالات کی پوری رعایت شامل رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی ایسی کمزوریوں سے پاک ہوتی ہے جو دوسروں کو اس کے اوپر غلبہ پانے کا موقع دے دے۔ ایسا انسان ایک ناقابلِ تسخیر انسان ہوتا ہے۔

دُہرا فائدہ، دُہرا نقصان

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ نیک عمل کریں گے ان کو خدا دگنا انعام دے گا (قصص ۵۴)
سی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ برائی کریں گے ان کو بھی خدا ان کی برائی کی دگنا سزا دے گا (الاعراف ۳۸)

قرآن میں یہ بات آخرت کے اعتبار سے کہی گئی ہے۔ آخرت انسان کے لیے ابدی انعام اور ابدی
زا کی جگہ ہے۔ وہاں کے لیے خدا نے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ دنیا میں جو آدمی اچھا یا برا عمل کرے وہ آخرت
بں اس کا دگنا بدلہ پائے۔ گویا کہ ہر عمل کا بیک وقت دہرا پہلو ہے، خواہ وہ عمل اپنی حقیقت کے اعتبار سے
چھا ہو یا برا۔ یہی معاملہ دنیا کا بھی ہے۔ دنیا میں آدمی اگر کوئی صحیح اقدام کرے تو اس کو اپنے صحیح اقدام کا
ُگنا فائدہ ملے گا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص غلط اقدام کرے تو اس کو بھی اپنے غلط اقدام کا دگنا انجام بھگتنا
ڑے گا۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے وہ کبھی اور کسی کے لیے بدلنے والا نہیں۔

مثلاً آپ ایک ماحول میں ہوں اور وہاں اپنے لیے ایک مطلوب زندگی حاصل کرنا چاہیں تو اس
ی ایک شکل یہ ہے کہ آپ کچھ لوگوں کو اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھ کر ان سے لڑائی شروع کر دیں۔ اس قسم کا
متشددانہ اقدام بلاشبہ ایک غلط اقدام ہوگا۔ ایسے کسی اقدام کا نتیجہ انسان کو بیک وقت دو نقصان کی صورت
یں بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک یہ کہ متشددانہ کارروائی کے نتیجہ میں ماحول کے ساتھ آپ کی جنگ شروع ہو جائے۔
آپ دوسروں کے خلاف تشدد کریں اور وہ آپ کے خلاف تشدد کریں۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہو کہ اقدام سے
پہلے جو کچھ آپ کو ملا ہوا تھا اس کو بھی آپ کھو دیں۔ اس قسم کی کارروائی کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ ٹکراؤ سے
باہر جو تعمیری مواقع آپ کو عملاً ملے ہوئے تھے وہ سب کے سب استعمال ہونے سے رہ گئے۔

اس کے بجائے اگر آپ خاموش اور پُرامن انداز میں اپنے مقصد کے حصول کی کوشش کریں
تو یہ بلاشبہ ایک صحیح اقدام ہوگا اور دوبارہ آپ کو اس کا دُہرا فائدہ ملے گا۔ ایک یہ کہ آپ غیر
ضروری ٹکراؤ سے بچ کر اپنے مقصد کی طرف تدریجی سفر کرتے رہیں گے۔ اسی کے ساتھ دوسرا فائدہ
آپ کو یہ ملے گا کہ آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ ماحول میں موجود تعمیری امکانات کو اپنے حق میں استعمال
ریں، یہاں تک کہ ایک نئے اور بہتر مستقبل کے مالک بن جائیں۔ یہ فطرت کا قانون ہے اور فطرت
کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

دشمن بھی دوست

قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا (حم السجدۃ ۳۴)

بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کی بات بری لگ جاتی ہے۔ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو آدمی کے جذبات کو بھڑکا دیتے ہیں۔ ایسے موقع پر جواب کی دو صورتیں ہیں۔ ایک منفی ردعمل اور دوسرے مثبت ردعمل۔ منفی ردعمل یہ ہے کہ ناخوش گوار بات پیش آئے تو آدمی کے اندر غصہ بھڑک اٹھے اور غصہ کے تحت وہ جوابی کارروائی شروع کر دے۔ اس قسم کی جوابی کارروائی صرف مسئلہ کو بڑھاتی ہے، اس سے باہمی تلخیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ابتدائی مخالفت آخر کار دشمنی تک پہنچ جاتی ہے۔ جواب دینے والے نے اپنے خیال کے مطابق مسئلہ کو ختم کرنے کے لیے جواب دیا تھا۔ مگر اس کا جواب فریقِ ثانی کو مزید بھڑکا کر مسئلہ میں اور اضافہ کر دیتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی کی طرف سے کوئی ناخوش گوار بات پیش آئے تو آدمی اس کے مقابلہ میں جوابی انداز اختیار نہ کرے، وہ کبھی خاموشی اختیار کر لے اور اگر بولنا ہو تو وہ کڑوے بول کا جواب میٹھے بول سے دے۔ وہ انتقامی جذبہ کے تحت کارروائی کرنے کے بجائے اصلاحی جذبہ کے تحت اپنی مثبت کوششیں جاری کر دے۔

پہلا رویہ اگر دشمنی میں اضافہ کا سبب بنا تھا تو دوسرا رویہ دشمن کو دوست بنانے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ پہلے رویہ نے اگر مسئلہ کو بڑھایا تھا تو دوسرا رویہ مسئلہ کو جڑ سے ختم کر دے گا۔

انسان کے اندر ضمیر بھی ہے اور اَنا بھی۔ اگر آپ کسی انسان کے ضمیر کو جگائیں تو ایسے انسان کو آپ اپنا دوست اور ہمدرد بنا لیں گے، اور اگر آپ ایسا رویہ اختیار کریں جو آدمی کی انانیت کو بھڑکانے والا ہو تو برعکس طور پر یہ ہوگا کہ آدمی آپ کا مخالف اور دشمن بن جائے گا۔ ہر شخص کے اندر آپ کا ایک دوست انسان چھپا ہوا ہے اور اسی کے ساتھ آپ کا دشمن انسان بھی۔ آپ کا ایک رویہ اس شخص کو آپ کا دوست بنا دیتا ہے اور آپ کا دوسرا رویہ اس کو آپ کا دشمن۔ اب یہ آپ کا اپنا حوصلہ ہے کہ آپ دونوں میں سے کس کا انتخاب کرتے ہیں۔

مقام عمل کو بدلنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتداءً تیرہ سال تک مکہ میں تھے۔ وہاں کچھ لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا۔ مگر وہاں کی اکثریت آپ کی مخالف بن گئی۔ یہاں تک کہ وہ لوگ آپؐ کے قتل پر آمادہ ہوگئے۔ اس وقت آپ نے ایسا نہیں کیا کہ ان کے خلاف جوابی کارروائی کریں اور کسی حال میں مکہ نہ چھوڑنے کا عزم کرلیں۔ اس کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ خاموشی کے ساتھ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔

یہ گویا اپنے میدان عمل کو بدلنا تھا۔ آپ نے حالات کا گہرا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اپنی قوت کو اہل مکہ سے محاذ آرائی میں استعمال نہ کریں بلکہ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیں۔ یہ ایک سنت رسولؐ ہے۔ اس کو مقام عمل کی تبدیلی کا نام دیا جاسکتا ہے۔

عملی اور نزاعی معاملات کے لیے یہ نہایت اہم سنت ہے۔ اس سنت کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ مسائل سے ٹکراؤ کو اپنا نشانۂ عمل نہ بنانا بلکہ مسائل کے مقام سے ہٹ کر مواقع کی زمین کو اپنے عمل کا محور بنالینا۔

یہ اصول شریعت اور عقل دونوں کے عین مطابق ہے۔ جب بھی کوئی شخص یا گروہ اس کو اختیار نہیں کرپاتا تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اس طرح کا معاملہ پیش آنے کے بعد اس کو اپنے لیے ساکھ (پرسٹیج) کا مسئلہ بنالیتا ہے۔ مگر عقل مندی یہ ہے کہ کسی معاملہ کو کسی بھی حال میں عزت و وقار کا مسئلہ نہ بنایا جائے تاکہ اس کے حل کا ممکن راستہ کھلا رہے۔ کسی معاملہ کو عزت و وقار کا مسئلہ بنانا اس کو ایسی حد پر لے جانا ہے جہاں حل کی کوئی بھی تدبیر کارگر نہ رہے۔

میدانِ عمل کو بدلنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ جب ایک جگہ کام کو جاری رکھنے کے مواقع نہ ہوں تو دوسرے موزوں مقام کو اپنے لیے منتخب کرلینا۔ جنگ کا طریقہ موثر نہ ہورہا ہو تو صلح کا طریقہ اختیار کرلینا۔ ٹکراؤ سے مسئلہ حل نہ ہورہا ہو تو پرامن گفت و شنید کے ذریعہ اپنے مقصد کو حل کرنے کی کوشش کرنا۔ براہ راست جدوجہد مفید ثابت نہ ہورہی ہو تو بالواسطہ جدوجہد کے طریقہ کو اپنالینا۔ وغیرہ۔

فلاحِ انسانیت

کامیابی کے اسلامی اصول

فلاحی معاشرہ

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— جو لوگ اللہ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو توڑتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں یہی لوگ ہیں نقصان اٹھانے والے (البقرہ ۲۷)

انسان جب سماجی زندگی میں رہتا ہے تو سماج کے ہر فرد سے اس کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اس کے اپنے گھر کے افراد سے لے کر حکمراں طبقے کے افراد تک، ہر ایک سے وہ خاموش عہد میں جڑا ہوا ہوتا ہے۔ سماجی زندگی ایک قسم کا معاہدہ ہے۔ ہر آدمی اس میں جڑا ہوا ہے۔ خواہ اس نے اس کا اعلان کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

اس عہد کے تقاضے کو پورا کرنے سے ایک فلاحی معاشرہ بنتا ہے۔ اور جس سماج کے افراد اس عہد کے تقاضے کو توڑتے رہیں وہ سماج تباہی و بربادی کا سماج بن جائے گا۔

رشتہ اور خاندان کے درمیان اس تعلق کا نام صلہ رحمی ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے کا نام قطع رحم۔ اسی طرح پڑوس کے لوگوں کے ساتھ آدمی کو حقوق ادا کرنے والا بننا ہے نہ کہ حقوق کو توڑنے والا۔ اسی طرح پورے سماج میں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ آدمی اس کا ایک نفع بخش ممبر بنے نہ کہ نقصان پہنچانے والا اور مسائل پیدا کرنے والا ممبر۔ اسی طرح ملکی انتظام کے ڈھانچے میں اس کو قانون پر چلنے والا شہری ہونا چاہیے نہ کہ قانون کو توڑنے والا۔

یہ دو مختلف قسم کے انسان، دو مختلف قسم کے سماج بناتے ہیں۔ ایک قسم کے انسانوں سے تعمیری سماج بنتا ہے جس کے اندر صالح قدریں پرورش پائیں۔ اور دوسری قسم کے لوگوں سے جو سماج بنے وہ ایک بگڑا ہوا سماج ہوگا۔ اس میں برائیوں کو فروغ ہوگا اور نیکیاں دب کر رہ جائیں گی۔

صالح انسانی سماج وہ ہے جو فطرت کے منصوبہ کے مطابق ہو۔ اور غیر صالح سماج وہ ہے جو فطرت کے مقرر کیے ہوئے راستے سے ہٹ جائے۔

فساد نہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ ——— اور جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو وہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے اور کھیتوں اور جانوں کو ہلاک کرے۔ حالاں کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا (البقرہ ۲۰۶)

موجودہ دنیا میں کسی انسانی سرگرمی کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار کیا ہے۔ اس کا سادہ معیار یہ ہے کہ جو سرگرمی سماج میں بگاڑ پیدا کرے، جس کے نتیجے میں معیشت تباہ ہو اور لوگ ایک دوسرے کو ہلاک کریں وہ ایک غلط سرگرمی ہے۔ ایسی سرگرمی خدا کو پسند نہیں۔

صحیح انسانی سرگرمی وہ ہے جس کے نتیجے میں سماج کے اندر امن قائم ہو، صحت مند معاشی سرگرمیاں وجود میں آئیں۔ مرد اور عورت اپنے آپ کو محفوظ حالت میں پائیں جو سرگرمی اس قسم کے مثبت نتائج پیدا کرے وہ ایک صحیح سرگرمی ہے۔ یہی وہ سرگرمی ہے جس کو خدا کی پسندیدگی حاصل ہوگی۔

کسی انسانی سرگرمی کے درست ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ بظاہر وہ اچھے عنوان کے ساتھ شروع کی گئی ہو۔ خدا کی نظر میں اصل اہمیت الفاظ یا عنوان کی نہیں ہے نتیجے کی ہے۔ ایسی حالت میں یہ بھی ضروری ہے کہ انسانی سماج میں کوئی سرگرمی شروع کرنے سے پہلے حقیقی حالات کا مکمل اندازہ کیا جائے۔ جو سرگرمی سماج کو برے نتائج سے دوچار کرے، اس کو اٹھانے والے کسی حال میں قابل معافی نہیں، خواہ انھوں نے اپنی سرگرمی کو کتنے ہی زیادہ اچھے نام کے ساتھ شروع کیا ہو۔

خدا نے اپنے تمام بندوں کو صالح فطرت پر بنایا ہے۔ ابتدائی طور پر تمام لوگ اسی فطرت کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ جب وہ کوئی اجتماعی سرگرمی شروع کرے تو وہ اس کا بھرپور اہتمام کرے کہ فطرت کا یہ نقشہ ٹوٹنے نہ پائے۔ فطرت کے اس نقشے کا ٹوٹنا فساد ہے، اور یہ فساد ہرگز خدا کو پسند نہیں۔

اس دنیا میں صحیح عمل صرف وہ ہے جس میں فطرت کے ساتھ کامل مطابقت پائی جاتی ہو۔

انصاف پسندی

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— اے لوگو! خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچا دو۔ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ خدا اچھی نصیحت کرتا ہے تم کو، بے شک خدا سننے والا، دیکھنے والا ہے (النساء ۵۸)

ہر ذمہ داری ایک امانت ہے اور اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح جب کسی سے معاملہ پڑے تو آدمی کو چاہیے کہ وہ کرے جو انصاف کا تقاضا ہو، خواہ معاملہ دوست کا ہو یا دشمن کا۔ اگر امانت داری اور انصاف کا طریقہ بظاہر اپنے فائدوں اور مصلحتوں کے خلاف نظر آئے تب بھی اس کو انصاف اور سچائی ہی کے طریقہ پر قائم رہنا ہے۔ کیوں کہ بہتری اور کامیابی اسی میں ہے جو خدا بتائے نہ کہ اس میں جو ہمارے نفس کو پسند ہو۔

زندگی کا پورا نظام امانت کے اصول پر قائم ہے۔ زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے پاس دوسرے آدمی کی کوئی چیز ہوتی ہے جس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اسے حقدار کے حوالے کرے۔ یہ امانت کسی محدود چیز کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک وسیع چیز ہے جس میں زندگی کے بیشتر معاملات داخل ہیں۔ یہ امانت کبھی ایک قول ہوتا اور کبھی مال یا زمین اور کبھی کسی کا کوئی راز، یا اسی طرح اور کوئی چیز۔

اسی کے ساتھ عدل کا حکم بھی جڑا ہوا ہے۔ اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے معاملہ میں ایک بات انصاف کی ہوتی ہے اور دوسری بات بے انصافی کی۔ ایک روش انصاف کے مطابق ہوتی ہے اور دوسری روش انصاف کے خلاف۔ ایسے مواقع پر اعلیٰ انسان وہ ہے جس کا حال یہ ہو کہ جب وہ بولے تو انصاف کی بات بولے، جب وہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرے تو انصاف کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے معاملہ کرے۔ اس کی انصاف پسندی اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ اس معاملہ میں وہ اپنے میں اور غیر میں فرق نہ کرے حتیٰ کہ اگر انصاف کی روش اپنی ذات کے خلاف ہو تو وہ ذاتی مفاد کو نظر انداز کرتے ہوئے عدل و انصاف کی روش کو اختیار کرے۔

امانت داری اور انصاف پسندی، یہی وہ اصول ہیں جن کی پابندی کسی انسان کو انسان بناتی ہے اور ایسے انسانوں کے ملنے سے جو معاشرہ بنے اسی کا نام فلاحی معاشرہ ہے۔

فلاحِ انسانیت

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں انسان کے لیے خدا کے عطیات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ تم خدا کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ (فاذکروا آلاء اللّٰہ لعلکم تفلحون) الاعراف ۷

موجودہ دنیا میں کسی انسان کے رویے کی درستگی کا انحصار تمام تر صرف ایک چیز پر ہے۔ اور وہ حقیقت پسندی ہے یعنی انسان اپنی واقعی حیثیت کو سمجھے اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لے۔ اپنی حیثیتِ واقعی کے اعتراف ہی میں تمام انسانی خوبیوں کا راز چھپا ہوا ہے یہ حیثیتِ واقعی کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان خدا کی مخلوق ہے۔ خدا نے اس کو نہ صرف بہترین جسم و دماغ کے ساتھ پیدا کیا ہے بلکہ اس کو ایک ایسی دنیا دی ہے جو اس کے لیے ہر قسم کے موافق اور معاون اسباب سے بھری ہوئی ہے۔ انسان کا ذاتی وجود بھی اس کے لیے خدا کی ایک نعمت ہے اور اس کی ذات کے باہر پھیلی ہوئی دنیا بھی اپنے تمام اجزار کے ساتھ اس کے لیے ایک عظیم نعمت کی حیثیت رکھتی ہے۔

آدمی کے اندر یہ سوچ جب پوری طرح پیدا ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک متواضع انسان بن جاتا ہے، وہ احتیاط اور ذمہ داری کے احساسات میں جینے لگتا ہے۔ وہ اپنی فکر کے اعتبار سے سنجیدہ انسان بن جاتا ہے اور اپنے احساسات کے اعتبار سے ایک دردمند انسان۔

کسی سماج میں ایسے انسانوں کی موجودگی اس کے فلاح کی یقینی ضمانت ہے۔ ایسا سماج انصاف کا سماج ہوگا نہ کہ ظلم کا سماج۔ ایسے سماج میں ہر آدمی خود اپنے ذاتی تقاضے کے تحت اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے والا بن جائے گا۔ وہ اس کا تحمل نہیں کر سکے گا کہ وہ صرف اپنی ذات میں جئے اور دوسروں کے حقوق سے دستبردار ہو جائے۔

خدائی نعمتوں کے احساس میں جینے والا انسان ایک حق شناس انسان ہوتا ہے اس کا یہ احساس کہ خدا نے اس کو دیا ہے، یہی اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی دوسروں کو دینے والا بن جائے۔

تول کا دن

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ ——— اور اس دن وزن دار صرف حق ہوگا پس جن کی تولیں بھاری ہوں گی وہی لوگ کامیاب ٹھہریں گے اور جن کی تولیں ہلکی ہوں گی وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا۔ کیوں کہ وہ ہماری نشانیوں کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے (الاعراف ۹ - ۸)

انسان دنیا میں جو عمل کرتا ہے اس کا ایک مادی پہلو ہے اور دوسرا اس کا اخلاقی پہلو۔ مادی پہلو اس کا ظاہری پہلو ہے جو ہر ایک کو دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس اخلاقی پہلو ایک معنوی پہلو ہے جو اگرچہ پوری طرح موجود ہوتا ہے لیکن ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔

انسانی عمل کا مادی پہلو دولت، مکان اور دوسرے دنیوی سامانوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ان سامانوں کی بدولت دنیا میں انسان کو عزت ملتی ہے اس کی وجہ سے آدمی کے ہر کام بنتے چلے جاتے ہیں اس لیے ہر آدمی اس کی طرف دوڑتا ہے۔ ہر آدمی اس کے لیے محنت کرتا ہے مگر انسان کی محنت کا یہ مادی حاصل صرف دنیا کی زندگی میں اس کے کام آتا ہے۔ موت آدمی کو اس قسم کے تمام سازوسامان سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیتی ہے۔ موت کے بعد یہ چیزیں کسی کے بھی کام آنے والی نہیں۔

انسانی عمل کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو اخلاقی کہا جاتا ہے۔ یعنی جب بولنا تو سچ بولنا، لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے دیانت اور انصاف پر قائم رہنا۔ لوگوں کے حقوق پوری طرح ادا کرنا۔ لوگوں کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرنا۔ وغیرہ۔

موت کے بعد لوگوں کے اعمال خدا کے ترازو میں تولے جائیں گے۔ جس آدمی نے صرف دنیوی سازوسامان کے لیے محنت کی ہوگی وہ وہاں کے ترازو میں بے وزن ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ وہاں خالی ہاتھ پہنچا تھا البتہ جن لوگوں نے دنیا کی زندگی میں نیکیاں کی ہوں گی وہ وہاں ان کے ساتھ پہنچیں گی اور اپنی ان نیکیوں کی بدولت وہ آخرت کی تول میں باوزن قرار پائیں گی۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لیے آخرت میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کے لیے کامیابی ہی کامیابی۔

قانون حیات

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— جن لوگوں نے اقرار کیا اور انھوں نے پرہیزگاری اختیار کی۔ ان کے لیے خوش خبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے (یونس ۶۳-۶۴)

خدا کا اقرار سب سے بڑی حقیقت کا اقرار ہے۔ جو آدمی پورے معنوں میں خدا کا اقرار کرے اس نے اپنی زندگی کے لیے صحیح نقطۂ آغاز پالیا۔ اس کے برعکس جو آدمی خدا کا اقرار نہ کرے وہ گویا اپنی زندگی کے لیے صحیح نقطۂ آغاز کو نہ پاسکا۔ پہلے انسان کے لیے کامیابی ہے اور دوسرے انسان کے لیے صرف ناکامی اور نامرادی۔

آدمی جب حقیقتِ واقعہ کا اقرار کرے تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر وہ سنجیدہ ہوجاتا ہے۔ یہ اقرار اس کو بتاتا ہے کہ دنیا میں اس کے سوا ایک اور بالاتر طاقت ہے جس کو نظرانداز کرنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ احتیاط اور ذمہ داری کی زندگی گزارے۔ اسی زندگی کا نام پرہیزگاری ہے۔

خدا نے اس دنیا کے لیے جو قانون مقرر کیا ہے اس میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ انسان کے لیے واحد ممکن راستہ یہ ہے کہ وہ اس قانون سے مطابقت کرکے اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ اگر وہ اپنے آپ کو اس قانون فطرت کے مطابق نہ بنائے تو وہ خود اپنا نقصان کرے گا نہ کہ قانون فطرت کا۔

اس دنیا میں کامیابی صرف اس انسان کے لیے ہے جو اپنے آپ کو برائیوں سے بچائے۔ جو صحیح اور غلط میں فرق کرے۔ جو یہ جانے کہ خدا کی دنیا میں اس کو تواضع کی روش کے ساتھ رہنا ہے نہ کہ گھمنڈ کی روش کے ساتھ۔ اس کے لیے اخلاقی پابندی کا طریقہ درست ہے نہ کہ اخلاقی بے قیدی کا طریقہ۔ اس کو یہاں انسان بن کر حدود و قیود میں رہنا ہے۔ وہ ایسا نہیں کرسکتا کہ وہ جنگل کے حیوان کی طرح بے قید زندگی گزارنے لگے۔

اِس دنیا میں اخلاقی پرہیز بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ غذائی پرہیز۔

خوش خبری

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— جو لوگ ایمان لائے اور ڈرتے رہے ان کے لیے خوش خبری ہے۔ دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں یہی بڑی کامیابی ہے (یونس ۶۴-۶۳)

ایمان یہ ہے کہ آدمی سچے دل سے اپنے رب کا اقرار کرے۔ جب کوئی آدمی اس طرح رب العالمین کا اقرار کرتا ہے تو اس کے بعد لازمی طور پر اس کے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہو جاتی ہے یعنی خدا ہی سے امید رکھنا اور اسی کی پکڑ سے ڈرنا۔

ایمان اور تقویٰ کی زندگی کو اختیار کرنا گویا اس شاہراہ پر چل پڑنا ہے جس پر کائنات کا پورا قافلہ چلا جا رہا ہے۔ ایسا آدمی اپنے دل میں یہ اطمینان محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس نے آخری سچائی کو پالیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بقیہ کائنات کے ساتھ ہم آہنگ محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کا یہ احساس خاموش زبان میں اس کے لیے اس بات کی بشارت بن جاتا ہے کہ وہ اس کائناتی راستے کا مسافر بن گیا ہے جو آخر کار اس کو اس منزل پر پہنچانے والا ہے جہاں نجات ہی نجات ہے اور کامیابی ہی کامیابی۔

یہ ایمان آدمی کو وہ عظیم ترین نعمت عطا کرتا ہے جس کو یقین و اعتماد کہا گیا ہے۔ جو آدمی اپنے آپ کو خدا کے ساتھ وابستہ کر لے اس نے بلا شبہ اپنے لیے زندگی کی سب سے زیادہ پُریقین اور پُر اعتماد زمین حاصل کر لی۔ ایسے آدمی کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھنے والا اقدام ہے، ایسے آدمی کا ہر عمل ایسا عمل ہے جس کا نتیجہ خیز ہونا اس مالک کائنات نے مقدر کر دیا ہے جس کے فیصلے کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

ایسے ہی لوگ حقیقی معنوں میں کامیاب لوگ ہیں۔ کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو انھیں کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے روک سکے —— خدا سے ڈرنے کا مطلب محتاط زندگی گزارنا ہے۔ خدا پر یقین اور خدا کی پکڑ کا احساس آدمی کے اندر یہ شعور جگا دیتا ہے کہ وہ دنیا میں ذمہ دارانہ زندگی گزارے۔ وہ صحیح اور غلط میں تمیز کرتے ہوئے عمل کرے۔ یہی لوگ ہیں جو آخر کار کامیاب ہوں گے۔

برائی کے جواب میں بھلائی

قرآن کی سورہ نمبر ۱۳ میں کامیاب انسان کی خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ یہ وہ لوگ ہیں جو برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لیے ہے (الرعد ۲۲)

اجتماعی زندگی میں جب کوئی برائی آجائے تو اس کو ایک اور برائی کے ذریعہ ختم نہیں کیا جاسکتا۔ برائی کا توڑ برائی نہیں ہے بلکہ برائی کا توڑ بھلائی ہے۔ یہی اس دنیا کے لیے خدا کا مقرر کیا ہوا قانون ہے، اور خدا کے قانون میں تبدیلی ممکن نہیں۔

رات کے وقت جب زمین پر تاریکی چھا جاتی ہے تو اس کو ہٹانے کے لیے کائنات ایسا نہیں کرتی کہ وہ تاریکیوں کا لشکر لے آئے اور اس کے ذریعہ سے رات کے اندھیرے کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے برعکس کائنات صرف یہ کرتی ہے کہ وہ روشن سورج کو اس کے سامنے کر دیتی ہے۔ اس کے بعد اپنے آپ ایسا ہوتا ہے کہ اندھیرا چلا جاتا ہے۔

یہ فطرت کا قانون ہے اور انسان کی کامیابی بھی اسی میں ہے کہ وہ فطرت کے اس نقشہ کو اپنی زندگی میں اختیار کرے اگر وہ برائی کو دور کرنا چاہتا ہے تو اس کے جواب میں بھلائی کا عمل کرے۔ اس معاملہ میں یہی واحد طریقہ ہے، اس کے سوا کوئی اور طریقہ عملی طور پر ممکن نہیں۔

کوئی آدمی آپ کے خلاف کڑوا بول بولے تو آپ اس کے جواب میں میٹھا بول بولئے۔ اس کے بعد فریق ثانی اپنے آپ شرمندہ ہو کر خاموش ہو جائے گا۔ کڑوے بول کے مقابلہ میں میٹھا بول گویا مسئلہ کو بالواسطہ طور پر حل کرنا ہے۔ اور اس دنیا میں بالواسطہ تبدیلی ہمیشہ موثر ہوتی ہے نہ کہ براہ راست تبدیلی۔

غصہ کا جواب غصہ نہیں ہے بلکہ معافی ہے۔ اشتعال انگیزی کا جواب مشتعل ہونا نہیں ہے بلکہ چپ رہنا ہے۔ تشدد کا جواب تشدد نہیں ہے بلکہ پر امن روش اختیار کر لینا ہے۔ ٹکراؤ کا جواب ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ اعراض ہے۔ جنگ کا جواب جنگ نہیں ہے بلکہ گفت و شنید ہے۔ نفرت کا جواب نفرت نہیں ہے بلکہ محبت و شفقت ہے۔ بے عزتی کا جواب دوبارہ بے عزتی نہیں ہے بلکہ احترام کا سلوک کرنا ہے۔

یہی اس دنیا میں کامیاب زندگی کا واحد طریقہ ہے۔ دوسرے طریقے تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں نہ کہ کامیابی کی طرف لے جانے والے۔

اخلاقی دباؤ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو وہ اپنے ہاتھ سے اس کو بدل دے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اپنی زبان سے اس کو برا کہے۔ اور اگر وہ ایسا بھی نہ کر سکے تو وہ اپنے دل میں اس کو برا سمجھے۔ اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے (مَن رأی مِنکم مُنکراً فلیُغیرہ بیدہ، فاِن لم یستطع فبلسانہ، فاِن لم یستطع فبقلبہ وذٰلک اَضعفُ الایمان) صحیح مسلم

کسی سماج کی اصلاح کے لیے سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اس کے اندر بگاڑ کے خلاف ایک مستقل روک موجود ہو۔ انسانی سماج کو اگر بگاڑ سے روکا جاتا رہے تو وہ اپنے آپ درست طریقہ سے چلے گا اس کے بعد فطرت کا زور ہی اس کو بہتر سماج بنانے کے لیے کافی ہو جائے گا۔

وہ روک یہ ہے کہ سماج کے افراد میں اچھے اور برے کا احساس زندہ ہو۔ جب بھی وہ کسی فرد یا گروہ کو کوئی غلط کام کرتے ہوئے دیکھیں یا کسی کو دوسرے کے خلاف زیادتی اور بے انصافی کرتے ہوئے پائیں تو ان کا احساس ذمہ داری جاگ اٹھے۔ وہ غلط کار اور ظالم کے پاس پہنچیں اور مل کر یہ کوشش کریں کہ وہ اپنی غلط کارروائی سے باز آئے۔ وہ اپنی ساری طاقت ایسے لوگوں کو روکنے میں لگا دے، ان کی ساری کوشش یہ ہو کہ سماج میں صرف اچھی روایات فروغ پائیں، بری روایات قائم ہونے کو وہ کسی بھی حال میں برداشت نہ کریں۔

اس کام کو دوسرے لفظوں میں اخلاقی دباؤ کہا جا سکتا ہے۔ سماج میں اگر ایسے لوگ بڑی تعداد میں موجود ہوں جو کسی کو غلط کام کرتے ہوئے دیکھیں تو فوراً اس کے خلاف اٹھ جائیں۔ وہ ہر قسم کی پُرامن کوشش کے ذریعہ ایسے افراد کو مجبور کر دیں کہ وہ اپنی بری روش سے باز آئیں اور آئندہ اس کو دہرانے کی ہمت نہ کریں۔

یہ کام تمام تر پُرامن اخلاقی دباؤ کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے۔ اس اخلاقی دباؤ کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اور حالات کے اعتبار سے اس کو اختیار کیا جانا چاہیے۔ ان میں سے ایک زبان کے ذریعہ نصیحت اور تلقین بھی ہے۔ حتیٰ کہ دل سے برائی کو برا سمجھنا بھی اسی دباؤ کی ایک قسم ہے کسی سماج میں اگر بہت سے لوگ دل کے پورے جذبہ کے ساتھ برائی کو برائی سمجھنے لگیں تو اس سے جو عمومی نفسیاتی فضا پیدا ہوگی وہ خود بھی برائی کے خلاف ایک خاموش روک بن جائے گی۔

صبر کی قیمت

قرآن کی سورہ نمبر ۲۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ آخرت میں خدا اپنے وفادار بندوں کے بارہ میں فرمائے گا کہ ـــــ آج میں نے ان کو بدلہ دیا ان کے صبر کرنے کا۔ وہی ہیں کامیاب ہونے والے (المومنون ۱۱۱)

دنیا میں صلاح وفلاح کی جو زندگی مطلوب ہے اس کی واحد قیمت صبر ہے۔ جو لوگ صبر کی یہ لازمی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں وہی موجودہ دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور موجودہ دنیا کے بعد بننے والی ابدی دنیا میں بھی۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی کو آزادی حاصل ہے یہاں کسی بھی شخص پر کوئی پابندی نہیں۔ یہاں نیک آدمی کے لیے جس طرح عمل کے مواقع ہیں، ٹھیک اسی طرح یہاں برے لوگ بھی آزاد ہیں کہ جس طرح بھی وہ چاہیں اپنی سرگرمیاں جاری کریں۔

اس بنا پر انسانی سماج ایک ایسا سماج بن جاتا ہے جہاں قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں۔ جہاں آدمی کو میٹھے بول کے ساتھ کڑوے بول بھی سننے پڑتے ہیں۔ یہاں آدمی کو فائدے کے ساتھ نقصان کا تجربہ بھی پیش آتا ہے۔ یہاں آدمی کا سفر خوش گوار وادیوں میں بھی طے ہوتا ہے اور ناخوش گوار وادیوں میں بھی۔

ایسی حالت میں کوئی شخص خدا پرستانہ زندگی پر کیسے قائم رہے۔ وہ کس طرح ایک با اصول انسان کے طور پر جئے جب کہ یہاں بار بار ایسے لمحات پیش آتے ہیں جو اصول پسندی کی روش کو سخت مشکل بنا دینے والے ہوتے ہیں۔

اس سوال کا جواب صرف ایک ہے۔ اور وہ صبر ہے یعنی منفی ردعمل سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے ہر حال میں مثبت روش کا پابند بنانا۔ پیش آنے والی تلخیوں کو جھیلتے ہوئے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو سچائی کی روش پر قائم رکھنا۔

یہی صبر ہے اور اعلیٰ انسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے یہ صبر اتنا زیادہ ضروری ہے کہ اس کے بغیر اعلیٰ انسانی شخصیت کی تعمیر ممکن ہی نہیں۔

درست کلامی

قرآن کی سورہ نمبر ۳۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو وہ تمہارے اعمال سنوارے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی (الاحزاب ۷۱-۷۰)

قول انسان کی پوری شخصیت کی علامت ہے۔ پختہ اور درست کلام اس بات کی علامت ہے کہ اس کا بولنے والا پختہ سیرت اور درست شخصیت کا حامل ہے۔ اس کے برعکس جس آدمی کا کلام درست کلام نہ ہو وہ ایسے کلام کے ذریعہ بتاتا ہے کہ اس کی شخصیت پختگی اور درستگی کی صفات سے خالی ہے۔

درست کلام دراصل درست شخصیت کی خارجی علامت ہے۔ جس آدمی کا حال یہ ہو کہ جب وہ بولے تو ٹھیک مطابق واقعہ بات بولے۔ اس کا ہر قول انصاف کے ترازو میں تلا ہوا ہو ایسا آدمی یقینی طور پر سنجیدہ شخصیت کا حامل ہوگا۔ اس کے مزاج میں حق پسندی ہوگی وہ اس کمزوری سے پاک ہوگا جس کو عام طور پر دوعملی یا منافقت کہا جاتا ہے۔

جو آدمی اس معنی میں درست کلامی کی صفت رکھتا ہو اس کے تمام اعمال بھی لازمی طور پر درست ہوتے چلے جائیں گے۔ اپنی درست کلامی کی بنا پر وہ نفسیاتی پے چیدگی سے پاک ہوگا، لوگوں کو اس سے کوئی شکایت نہ ہوگی کیوں کہ لوگوں کو اس سے فریب کا تجربہ پیش نہیں آئے گا۔ وہ جو کہے گا وہی کرے گا، اور اس کو جو کرنا ہے وہی وہ اپنی زبان سے بولے گا۔ اپنی اس صفت کی بنا پر لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنا اس کے لیے آسان ہوجائے گا وہ نہ داخلی طور پر ضمیر کے مسئلے سے دوچار ہوگا اور نہ خارجی طور پر بے اعتمادی کے مسئلے سے۔

ایسا ہی آدمی کائنات کا مطلوب انسان ہے۔ اور جس آدمی کے اندر یہ صفات ہوں اس کی ترقی اور کامیابی کسی منزل پر رکنے والی نہیں۔ درست کلام ابتدائی طور پر قول کی درستگی کا نام ہے، اور آخری نتیجہ کے اعتبار سے عمل کی درستگی کا نام۔

رحمت سے دور

قرآن کی سورہ نمبر ۴۵ میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ پس جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے تو ان کا رب ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا یہی کھلی کامیابی ہے۔ اور جنھوں نے انکار کیا۔ کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں۔ پس تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے (الجاثیہ ۳۰-۳۱)

سچائی کو نہ پانے میں سب سے بڑی رکاوٹ کبر ہے اور اس کو پانے میں سب سے بڑا مددگار تواضع ہے۔ جو آدمی تکبر کی نفسیات میں مبتلا ہو وہ اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھ لیتا ہے یہاں تک کہ حق سے بھی زیادہ بڑا۔ جب کوئی انسان اس کو حق کا پیغام دیتا ہے تو وہ اپنی اس نفسیات کی بنا پر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اگر میں اس کو مان لوں تو میں چھوٹا ہو جاؤں گا یہ خود ساختہ اندیشہ اس کے لیے حق کو ماننے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس جس انسان کے اندر عجز و فروتنی کی نفسیات ہو وہ اپنے آپ کو اتنا ہی سمجھے جتنا کہ وہ فی الواقع ہے، ایسا شخص گویا پیشگی طور پر حق کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ حق جب اس کے سامنے آتا ہے تو اس کو اسے پہچاننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ وہ فوراً اس کو مان کر اپنے آپ کو اس کے آگے جھکا دیتا ہے۔

ہدایت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی کبر ہے۔ کبر خدا کے نزدیک ایک جرم ہے۔ ایسا آدمی گویا خدا کے دائرے میں داخل ہو رہا ہے، ساری بڑائی صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ انسان کی حیثیت اس کے مقابلے میں صرف ایک عاجز بندے کی ہے۔ جو آدمی اپنی اس واقعی حیثیت کو قبول کر لے خدا اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اس کو ہر قسم کی اعلیٰ توفیق سے سرفراز کرتا ہے اور جو آدمی اپنی اس واقعی حیثیت کو قبول نہ کرے وہ کبھی خدا کی رحمت کا مستحق نہیں بن سکتا۔

کامیاب انسان وہ ہے جو تکبر سے خالی ہو اور ناکام وہ ہے جو تکبر کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے اس کے بعد کوئی بھی چیز اس کو خدا کے غضب سے بچانے والی نہیں۔

بخل نہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۵۹ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— جو شخص اپنے جی کے لالچ (شُحِّ نفس) سے بچالیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں (الحشر ۹)

انسانیت کی اجتماعی فلاح کا راز یہ ہے کہ لوگوں میں سخاوت کا مزاج ہو، وہ بخل اور لالچ سے بچے ہوئے ہوں۔

بخل کیا ہے۔ بخل دراصل بڑھی ہوئی خود غرضی کا دوسرا نام ہے۔ بخیل آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنے فائدے کی بات سوچتا ہے، اسے دوسروں کے فائدے سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی، وہ سماجی مواقع کو استعمال کرکے مادی فائدے سمیٹتا ہے لیکن اس ملے ہوئے فائدے میں سماج کا حصہ ادا کرنا اسے گوارہ نہیں ہوتا۔ اس مزاج کا انسان خود بھی گھاٹے میں رہتا ہے، اور وہ دوسرے کے لیے بھی گھاٹے کا سبب بنتا ہے۔

لالچ اور بخل کا یہ مزاج آدمی کے دل کو تنگ کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ خود اپنے آپ کو کسی بڑی کامیابی سے محروم کر لیتا ہے۔ کیوں کہ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ —— جتنا بڑا دل اتنی بڑی کامیابی۔

جس سماج میں اس قسم کے بخیلانہ کردار والے لوگ پائے جائیں، وہ سماج آخرکار ایک مریض سماج بن جاتا ہے۔ ایسے سماج میں صرف لینے کی فضا بنتی ہے، وہاں دینے کا ماحول قائم نہیں ہوتا۔ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بدخواہی تو ہوتی ہے مگر ان کے سینے میں دوسروں کے لیے خیرخواہی کے چشمے جاری نہیں ہوتے۔ ایسے سماج میں صرف پست کرداری جنم لیتی ہے، اعلیٰ قسم کے اخلاقی کردار وہاں پرورش نہیں پاتے۔

انسانیت کی فلاح کشادہ دلی میں ہے نہ کہ بخل میں۔ اچھا سماج سخاوت والے لوگ بناتے ہیں نہ کہ لالچ والے لوگ۔ حقیقی انسانی دنیا کی تعمیر وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسرے کا بھلا چاہتے ہوں نہ کہ صرف اپنی ذات اور اپنے خاندان کا۔

فرد کی ترقی مجموعی ترقی میں ہے نہ کہ صرف انفرادی ترقی میں۔

خدائی یاد دہانی

قرآن کی سورہ نمبر ۶۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اے ایمان والو، تمہارے مال اور تمہاری اولاد تم کو خدا کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں اور جو ایسا کرے گا تو وہی گھاٹے میں پڑنے والے لوگ ہیں (المنافقون ۹)

ضمیر خدا کی یاد دہانی ہے۔ ہر انسان کے سینے میں ایک ضمیر ہے جو گویا کہ خدا کی آواز ہے۔ یہ ضمیر ہر موقع پر یاد دلاتا ہے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے۔ کیا چیز خدا کی پسند کے مطابق ہے اور کیا چیز خدا کی پسند کے خلاف۔

یہ خدائی یاد دہانی ہر موقع پر انسان کو متنبہ کرتی رہتی ہے اس کے باوجود انسان کیوں غلط روش اختیار کرتا ہے۔ اس کا سبب مال اور اولاد کی محبت ہے۔ انسان مال اور اولاد کے ساتھ اپنی بڑھی ہوئی محبت کی بنا پر خدا کی یاد دہانی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ خدائی پسند کو جان لینے کے باوجود وہ اس کے خلاف چلنے لگتا ہے۔

جو لوگ ایسا کریں وہ بلا شبہ گھاٹا اٹھانے والے لوگ ہیں۔ انھوں نے خدا کی زمین میں سرکشی کی۔ ایسے لوگ خدا کی سزا کے مستحق ہیں نہ کہ خدا کے انعام کے۔

موجودہ دنیا میں انسان کے لیے درست روش کیا ہے، اور وہ کون سا راستہ ہے جو اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے والا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب بھی اس کو خدا کی یاد دہانی پہنچے اس کا سینہ خدائی آواز سے گونجے تو وہ فوراً اس پر دھیان دے۔ وہ کھلے دل کے ساتھ اس کو اپنی عملی زندگی میں اختیار کرے۔ مال، اولاد یا کسی بھی دوسری چیز کو وہ اس معاملے میں رکاوٹ نہ بننے دے۔

انسان کے اندر پیدائشی طور پر محبت کا جذبہ ہے۔ مثلاً مال اور اولاد کی محبت۔ محبت کا یہ جذبہ آزمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔ وہ اس لئے نہیں ہے کہ آدمی جس چیز کی محبت اپنے دل میں پائے وہ اس چیز کی طرف دوڑ پڑے۔ بلکہ وہ اس لئے ہے کہ غیر خدا سے محبت کے باوجود خدا کو نہ بھولے، غیر خدا کی کشش کے باوجود وہ اپنی ساری توجہ خدا کی طرف لگا دے۔

ناپ تول میں فرق

قرآن کی سورہ نمبر ۸۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے۔ جو کہ لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ وہ اٹھائے جانے والے ہیں ایک بڑے دن کے لیے جس دن تمام لوگ خداوند عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ (المطففین ۱-۳)

کسی سماج میں سب سے زیادہ برے کردار والے وہ لوگ ہیں جن کا حال یہ ہو کہ جب وہ دوسروں سے کوئی چیز لے رہے ہوں تو پوری طرح ناپ کر اور تول کر لیں۔ لیکن جب انھیں دوسروں کو دینا ہو تو وہ کم ناپیں اور کم تولیں۔ ان کے پاس اپنے لیے ایک ترازو ہو اور بقیہ لوگوں کے لیے دوسرا ترازو۔

اس کردار کا تعلق صرف تجارتی ناپ اور تول سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ مثلاً جو لوگ ایسا کریں کہ جب وہ اپنا تذکرہ کریں تو وہ ہمیشہ اپنی اچھائیاں اور خوبیاں بیان کریں، اور جب وہ دوسروں کا تذکرہ کریں تو وہ صرف ان کی برائیوں کو لیں اور سماج میں انھی کا چرچا کریں۔ اپنے بارے میں ان کا معیار یہ ہو کہ ہر جگہ میری تعریف کی جائے، اور دوسروں کے بارے میں ان کا معیار یہ ہو کہ لوگ ان کو ان کی بری صفات کے ساتھ جانیں۔

جو لوگ ایسا کریں کہ جب اپنی ذات کا معاملہ ہو تو وہ اپنی برائیوں کو چھپائیں اور اپنی اچھائیوں کو نمایاں کریں۔ اور جب دوسروں کا معاملہ ہو تو وہ ان کی اچھائیوں کو نظر انداز کر دیں اور صرف ان کی برائیوں کو بیان کریں۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں نہایت برے ہیں۔ خدا کی رحمت میں حصہ پانے والے نہیں۔

جس سماج میں ایسے لوگ پائے جائیں وہ پورے سماج کو گندا کر دیں گے۔ اس لیے کہ اگر ایک مجلس میں وہ اپنی اچھائی بیان کر رہے ہوں گے تو دوسری مجلس میں انھی جیسا ایک آدمی ان کی برائی بیان کر رہا ہوگا۔ اس طرح ہر آدمی لوگوں کی نظر میں مشتبہ ہو جائے گا۔ ایسے سماج سے حسن ظن اور اعتماد کی فضا ختم ہو جائے گی۔ لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے احترام باقی نہیں رہے گا۔ اور جس سماج میں ایسا ہو جائے وہ سماج کسی کے لیے بھی رہنے کے قابل نہیں، حتی کہ اس کے لیے بھی نہیں جو صبح سے شام تک اپنی تعریف بیان کرتا رہتا ہے۔

پاکیزہ زندگی

قرآن کی سورہ نمبر ۹۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ — کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو آلودہ کیا (قد افلح من زکّاھا وقد خاب من دسّٰھا) الشمس ۱۰-۹

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں انسان کے لیے بیک وقت دو امکانات چھپے ہوئے ہیں — اپنے اندر پاکیزہ اخلاقی شخصیت تعمیر کرنے کا امکان، یا پھر اپنی شخصیت کو اخلاقی حیثیت سے آلودہ کر لینے کا امکان۔

یہ دونوں امکانات ہر شخص کے لیے اور ہر حال میں موجود ہیں۔ جس آدمی نے ان امکانات کو ایک پہلو سے استعمال کیا اس نے اپنے آپ کو کامیاب بنالیا۔ اور جس نے ان امکانات کو دوسرے پہلو سے استعمال کیا اس نے اپنے آپ کو ناکام بنالیا۔

موجودہ دنیا طرح طرح کے حالات سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں بار بار مختلف قسم کے انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ انہی حالات و واقعات کے درمیان انسانی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کے ساتھ وقتی طور پر نقصان کا ایک واقعہ پیش آیا۔ اب اگر اس واقعہ کو آپ مستقل واقعہ سمجھیں تو آپ صرف دل شکستہ ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ اس کو صرف ایک وقتی واقعہ سمجھیں تو آپ بدستور حوصلہ اور ہمت کے ساتھ اپنا کام جاری رکھیں گے۔

اسی طرح کچھ لوگوں نے آپ کے خلاف اشتعال انگیزی کردی۔ اس کے بعد اگر آپ بھڑک اٹھے تو آپ نے اپنی یکسوئی میں خلل ڈالا اور اگر آپ صبر و تحمل کے ساتھ اس کا سامنا کریں تو گویا آپ نے اپنی ذہنی یکسوئی کو برقرار رکھا۔ اسی طرح کبھی آدمی محسوس کرتا ہے کہ اس کے آس پاس کے لوگ اس کو اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔ ایسا واقعہ اگر اس کو احساسِ کمتری میں مبتلا کردے تو اس کی صلاحیتیں ٹھٹھر کر رہ جائیں گی۔ اس کے برعکس اگر وہ اس معاملہ کو اپنی ناقص تیاری پر محمول کرے تو وہ اس واقعہ سے مزید عمل کی غذا لے گا اور زیادہ محنت کرکے مستقبل میں اس چیز کو پالے گا جس کو وہ حال میں پائے ہوئے نہیں تھا۔

حُسنِ اخلاق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— خدا کے نزدیک تول میں حسن اخلاق سے زیادہ باوزن کوئی اور چیز نہیں (عن ابی الدرداء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال مامن شیٔ اثقل فی المیزان من حسن الخلق) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی حسن الخلق۔

اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کے فطری نقشہ میں سب سے اہم چیز اچھا اخلاق ہے۔ اچھا اخلاق انسانیت کا حسن ہے۔ کسی انسان کی انسانیت جب اپنی اعلیٰ صورت میں ظاہر ہوتی ہے تو اسی کا نام حسن اخلاق ہے۔

دریا کا حسن اس کی روانی میں ہے۔ پھول کا حسن اس کی خوشبو میں ہے۔ باغ کا حسن اس کی ہریالی اور تر و تازگی میں ہے۔ اسی طرح انسان کا حسن یہ ہے کہ وہ جب لوگوں سے معاملہ کرے تو اس کے ہر معاملہ میں بہتر اخلاق کی شان موجود ہو۔

حسن اخلاق یہ ہے کہ آپ جب کسی سے بات کریں تو آپ کی زبان سے میٹھا بول نکلے خواہ دوسرے شخص نے آپ کو کڑوے الفاظ کا تحفہ دیا ہو۔ آپ جب لوگوں سے لین دین کریں تو آپ کا لین دین بدمعاملگی سے خالی ہو۔ آپ کسی کی مدد کریں تو آپ اس پر احسان نہ جتائیں۔ کوئی آپ سے اپنا حق مانگے تو آپ اس سے سرکشی نہ کریں۔ جب بھی اور جہاں بھی آپ کا سابقہ لوگوں کے ساتھ پیش آئے تو آپ کی ہر روش میں تواضع کا انداز موجود ہو۔

خوش اخلاقی دوسروں کی رعایت کرنے کا نام ہے اور بداخلاقی اپنی رعایت کرنے کا نام۔ جو آدمی صرف اپنے آپ میں جیتا ہو، جس کو صرف اپنے فائدوں اور مصلحتوں کی خبر ہو، اس کا اخلاقی سلوک خود پسندی پر قائم ہوگا۔ اس کے برعکس جو آدمی اپنے دل میں دوسروں کی خیر خواہی لیے ہوئے ہو، جو دوسروں کے احترام کا جذبہ رکھتا ہو، جو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کو اپنا فرض سمجھتا ہو، اس کا ہر قول اور ہر عمل حسن اخلاق کے رنگ میں رنگا ہوا ہوگا —— یہی وہ لوگ ہیں جن کا مجموعہ دنیا میں اچھا معاشرہ بناتا ہے، اور یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں جنت کے باغوں میں داخل کیے جائیں گے۔

رحمت والا سماج

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رحم اللہ رجلاً سمحاً اذا باع و اذا اشتریٰ و اذا اقتضیٰ (یعنی خدا اس انسان پر رحم فرمائے جو نرمی اختیار کرے جب کہ وہ خریدے اور بیچے اور تقاضا کرے۔

اس حدیث میں براہ راست طور پر تاجر کا ذکر ہے مگر بالواسطہ طور پر اس کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔ یہ حدیث اس عام انسانی رویے کو بتاتی ہے جو اس کو سماجی زندگی میں اختیار کرنا چاہیے۔

وہ رویہ یہ ہے کہ آدمی ہر معاملے میں نرم مزاج ہو۔ جب وہ سوچے تو مخالفانہ انداز میں نہ سوچے بلکہ خیر خواہی کے انداز میں سوچے۔ جب وہ بولے تو اس کا بول کڑوا نہ ہو بلکہ میٹھا بول ہو، جب وہ لوگوں سے معاملہ کرے تو اس کے رویے میں کڑا پن نہ ہو بلکہ لچک ہو۔ خرید و فروخت کے وقت وہ دوسروں کی رعایت کرنے والا ہو حتیٰ کہ جب دوسروں کے اوپر اس کا قرض ہو تو وہ قرض کی وصولیابی میں سختی کا انداز اختیار نہ کرے ــــــ یہی وہ لوگ ہیں جن کو حقیقی انسان کہا جا سکتا ہے۔

جس سماج میں ایسا مزاج رکھنے والے انسان ہوں وہ سماج رحمت کا سماج ہوگا، ایسے سماج میں انسانیت پرورش پائے گی، ایسے سماج میں لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ اپنے حقوق سے زیادہ وہ دوسروں کے حقوق کا لحاظ کریں گے، ایسے سماج کے افراد لوگوں کے درمیان پھول کی طرح رہیں گے نہ کہ کانٹے کی طرح۔

اگر ایک فرد ایسا ہو تو اس فرد کو اپنی ذات کی سطح پر خدا کی رحمت ملے گی۔ اور اگر سماج کے بہت سے لوگ اس قسم کا نرم مزاج رکھتے ہوں تو پورا سماج خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے سایے میں آجائے گا۔

نرم مزاج والا انسان ہی سچا انسان ہے، جس انسان کے مزاج میں کڑا پن ہو وہ گویا کہ چلتا پھرتا پتھر ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی انسان۔

انسانی برابری

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ —— اے لوگو! کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، اور کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت نہیں، اور کسی سفید فام کو سیاہ فام پر فضیلت نہیں، اور کسی سیاہ فام کو سفید فام پر فضیلت نہیں، سوا دین اور تقویٰ کے (لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لا سود علی احمر الا بالدین والتقوی) مسند احمد

تمام انسانوں کا خالق ایک ہے۔ تمام انسان ایک ہی ابتدائی ماں اور باپ سے پیدا ہوئے ہیں اس لیے تمام انسان یکساں ہیں۔ تمام انسان آپس میں خونی بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ظاہری طور پر دیکھنے میں مختلف انسانی نسلوں کے درمیان فرق نظر آتا ہے مثلاً رنگ کا فرق، ان میں کوئی سیاہ فام ہے اور کوئی سفید فام۔ مگر اس طرح کے تمام فرق صرف ظاہر کے اعتبار سے ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

انسانی برابری کا یہ تصور خدائی شریعت کے مطابق بھی ہے اور فطرت کے مطابق بھی۔ مزید یہ کہ تمام انسانوں کو برابر کا درجہ دے کر ہی بہتر سماج بن سکتا ہے۔ جس سماج میں لوگوں کو برابر کا درجہ نہ دیا گیا ہو وہ سماج کبھی امن اور خوش حالی کا سماج نہیں بن سکتا۔ ایسے سماج میں ابدی طور پر بے چینی جاری رہے گی۔

ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان فرق کی بنیاد نسل اور رنگ اور زبان نہیں ہے بلکہ کردار ہے۔ جو آدمی کردار اور اخلاق میں اونچا ہے وہی درجہ کے اعتبار سے بھی اونچا ہے۔ اور جو آدمی کردار اور اخلاق کے اعتبار سے بلند نہ ہو وہ انسانیت کے اعتبار سے بھی بلند نہیں، خواہ اس نے بظاہر کتنا ہی خوش نما لباس اپنے جسم کے اوپر ڈال رکھا ہو۔

ظلم نہیں

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ؐ نے بتایا کہ خدا نے یہ فرمایا ہے کہ —— اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے اور تمہارے درمیان بھی آپس میں ظلم کرنا حرام ٹھہرا لیا ہے پس تم لوگ ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو (عن ابی ذر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما روی عن اللہ تبارک وتعالیٰ انہ قال یا عبادی انی حرمتُ الظلم علیٰ نفسی وجعلتہ بینکم محرماً فلا تظالموا) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب

ظلم فطرت کے نقشہ کے خلاف ہے۔ کائنات میں بے شمار چیزیں ہیں۔ مگر اس کا کوئی جزء اس کے دوسرے جزء پر ظلم نہیں کرتا۔ یہ فطرت کا ماڈل ہے جو خدا نے کائنات میں قائم کیا ہے۔ انسان کو بھی چاہیے کہ وہ اسی ماڈل کو اپنائے۔ انسانی سماج میں بھی اس کا کوئی فرد اس کے کسی دوسرے فرد پر زیادتی نہ کرے۔ جس طرح وسیع تر سطح پر کائنات کے مختلف اجزاء ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتے۔

ظلم یا زیادتی کیا ہے۔ وہ ہے اپنی حد سے تجاوز کرنا، اپنے واجبی حق سے زیادہ کا طالب بننا، اپنے فائدہ کے لیے دوسرے کا نقصان کرنا۔ اس قسم کا ہر عمل فطرت کے نقشہ میں اجنبی ہے، وہ خدا کا مطلوب عمل نہیں۔

ہر انسان کو آزادی ہے کہ وہ دنیا میں اپنی ترقی کا عمل جاری کرے مگر اس کی ایک لازمی شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کی سرگرمیاں دوسرے کے لیے نقصان کا باعث نہ بنیں۔ خلا کا ہر ستارہ اور سیارہ مسلسل گردش کر رہا ہے۔ مگر ہر ایک کی گردش اپنے مقرر مدار میں ہے، کوئی بھی ستارہ یا سیارہ اپنے مدار سے باہر نہیں نکلتا۔ یہی اصول ہے جس نے خلا کے ستاروں اور سیاروں کو باہمی ٹکراؤ سے بچا رکھا ہے۔ ٹھیک یہی اصول انسان سے بھی مطلوب ہے۔

اپنے دائرہ میں محدود رہتے ہوئے عمل کرنا عین جائز ہے، اور اپنے دائرہ سے نکل کر دوسروں کے دائرہ میں سرگرمیاں دکھانا عین ناجائز۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف رویے ہیں، دونوں کا انجام یکساں ہونا ممکن نہیں۔

حرص کا نقصان

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو بھوکے بھیڑیے جو بکریوں میں چھوڑ دیے جائیں تو وہ اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا کہ کسی انسان کا مال کے لیے حریص ہو جانا ——— (ما ذئبان جائعان أرسلا فی غنم بأفسد لها من حرص المرء علی المال) جامع الاصول فی احادیث الرسول ۳/۶۲۸

حرص قناعت کی ضد ہے۔ حرص یہ ہے کہ آدمی ملے ہوئے پر راضی نہ ہو وہ مسلسل زیادہ حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہے یہاں تک کہ اسی حال میں اس کا انتقال ہو جائے۔

مادی ساز و سامان کی تین حدیں ہیں ——— ضرورت، راحت اور تعیش۔ ابتداءً آدمی صرف یہ چاہتا ہے کہ ضرورت کے بقدر اس کو سامانِ دنیا حاصل ہو جائے۔ جب اس کو ضرورت کے بقدر مادی ساز و سامان مل جاتا ہے تو اس کے بعد وہ اس حد پر نہیں رکتا اب وہ راحت کے حصول میں لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی ساری کوشش اسی کی راہ میں لگا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے کہ اس کو راحت و آرام والی چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں مگر وہ یہاں بھی نہیں رکتا اس کی حرص اب اس کو عیش و عشرت کا طالب بنا دیتی ہے۔ وہ عیش کے سامان جمع کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے جو کبھی ختم ہونے والے نہیں۔

آدمی کی سعادت اس میں ہے کہ وہ ضرورت پر قناعت کرے۔ وہ اس سے زیادہ کا حریص نہ بنے، اگر وہ ضرورت کی حد پر نہیں رکے گا تو اس کے بعد اس کے لیے کوئی حد آنے والی نہیں حتیٰ کہ عیش و عشرت کے تمام سامان اکٹھا کر لینے کے بعد بھی اس کو اطمینان حاصل نہیں ہوگا اب وہ اقتدار کا طالب بن جائے گا، اور اقتدار کی طلب ایک ایسی افیون ہے جو آدمی کو صرف نشہ دیتی ہے، وہ کسی بھی درجے میں اس کو سکون عطا نہیں کرتی۔

کامیاب انسان وہ ہے جس کا دل حرص سے پاک ہو۔ جو کم پر راضی ہو جائے، جو زندگی کے اعلیٰ مقاصد میں زیادتی کا طالب ہو نہ کہ دنیوی اور مادی ساز و سامان میں۔

بہتر لوگ

بہتر لوگ کون ہیں۔ حدیثِ رسولؐ کے مطابق، لوگوں میں بہتر لوگ وہ ہیں کہ جب ان کو حق دیا جائے تو وہ اس کو قبول کر لیں، اور جب ان سے حق مانگا جائے تو وہ اس کو دے دیں۔ اور وہ لوگوں کے بارہ میں وہی فیصلہ کریں جو فیصلہ وہ اپنے بارے میں کرتے ہیں (الذین اذا اعطوا الحق قبلوہُ و اذا سُئلوہ بذلوہ وحکموا للناس کحکمھم لانفسھم) مسند احمد

یہ صفتیں جس انسان میں ہوں وہی بہتر انسان ہے۔ اور جس سماج کے افراد میں یہ صفتیں پائی جائیں وہی سماج بہتر سماج ہے، اور نتیجہ کے اعتبار سے کامیاب سماج۔

ایسے لوگوں کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے والے ہوتے ہیں۔ جب بھی ان کے سامنے کوئی سچائی آتی ہے، جب بھی ان سے کوئی معقول بات کہی جاتی ہے، جب بھی انھیں ان کا کوئی فرض یاد دلایا جاتا ہے تو وہ فوراً اس کو ماننے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ حق کو ہمیشہ حق کی صورت میں دیکھتے ہیں اور ناحق کو ہمیشہ ناحق کی صورت میں۔ اس لیے انھیں اس میں دیر نہیں لگتی کہ وہ ناحق کو پہچان کر اسے چھوڑ دیں اور حق کو پہچان کر دل کی آمادگی کے ساتھ اسے اپنا لیں۔

ان کی دوسری صفت یہ ہے کہ جب بھی ان کے اوپر کسی کا کوئی حق آتا ہو اور اس حق کا ان سے تقاضا کیا جائے تو وہ حق کو حق دار کی طرف لوٹانے میں دیر نہیں لگاتے۔ جب ان کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی جائیں تو کسی بھی نفسیاتی رکاوٹ کے بغیر وہ اس کو مان لیتے ہیں اور بلا تاخیر اپنے آپ کو اس کی ادائیگی میں لگا دیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ اصول کے معاملہ میں اپنے اور غیر کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ ان کا انصاف کا ترازو جس طرح دوسروں کو تولتا ہے اسی طرح وہ خود انھیں بھی تولتا ہے۔ جس چیز کو وہ دوسروں کے لیے انصاف سمجھتے ہیں اسی کو وہ خود اپنے لیے بھی انصاف سمجھتے ہیں۔ وہ ہر ایک کو یکساں نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ہر ایک کے ساتھ یکساں معیار کے تحت معاملہ کرتے ہیں۔

عمل پیہم

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (احبُّ الاعمال الی اللہ أدومھا وان قلّ) (اللہ کے نزدیک سب سے محبوب عمل وہ ہے جو دوام کے ساتھ کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہو) فتح الباری ۱۱/۳۰۰

اس حدیث میں فطرت کا وہ قانون بتایا گیا ہے جو اللہ نے اس دنیا کے لیے مقرر کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو عملِ پیہم کہہ سکتے ہیں اور بیشتر حالات میں تھوڑا عمل ہی دیر تک مسلسل کیا جا سکتا ہے۔

اس دنیا میں کوئی نتیجہ اچانک نہیں نکلتا۔ یہاں کوئی حقیقی نتیجہ صرف اس وقت برآمد ہوتا ہے جب کہ بہت سے موافق عوامل اس کے گرد اکٹھا ہو گئے ہوں۔ اور اس طرح کے عوامل کا کسی ایک مقصد کے حق میں اکٹھا ہونا لمبی اور لگاتار جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔

کوئی شخصی مقصد ہو یا اجتماعی مقصد، کوئی سماجی کام ہو یا سیاسی کام، زراعت و باغبانی کا معاملہ ہو یا کوئی انقلابی تحریک چلانے کا معاملہ، فیکٹری قائم کرنے کا منصوبہ ہو یا شہر تعمیر کرنے کا منصوبہ، ہر چھوٹا یا بڑا کام مسلسل جدوجہد چاہتا ہے۔ ہر کام کا یہ تقاضا ہے کہ اس کو نقطۂ آغاز سے شروع کیا جائے اور خاموش عمل کرتے ہوئے اس کو تکمیل تک پہنچایا جائے۔

جدوجہد میں دوام ہونا جدوجہد کی کامیابی کا ضامن ہے۔ اور جدوجہد کی مقدار کا تھوڑا ہونا جدوجہد کی بقا کا ضامن۔

عمل کی بہتر صورت یہ ہے کہ آدمی کے لیے ایک درست نشانہ ہو اور پھر وہ اپنے عمل کا ایک ایسا کورس مقرر کرے جس کو وہ مسلسل جاری رکھ سکتا ہو۔ لگاتار جاری رہنے والا تھوڑا عمل اس سے بہتر ہے کہ آدمی چند دنوں کے لیے زیادہ عمل کرے اور پھر اس کے بعد بے عمل ہو کر بیٹھ رہے۔ جو آدمی کامیابی کا خواہش مند ہو اس کو چاہیے کہ وہ فطرت کے اس قانون سے کبھی انحراف نہ کرے، اس دنیا میں قانون فطرت سے انحراف کا انجام خود انحراف کرنے والے کو بھگتنا پڑتا ہے، کسی دوسرے کو نہیں۔

ایک دوسرے کے لیے شفقت

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا یرحم اللہ من عبادہ الا الرحماء (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۰/۱۲۳) یعنی اللہ اپنے بندوں میں سے صرف انہی پر رحم کرتا ہے جو خود رحم کرنے والے ہوں۔

اچھا سماج بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری شرط رحم دلی ہے۔ جس سماج کے افراد ایک دوسرے پر رحم کرنے والے ہوں وہ سماج امن و ترقی کا سماج ہوگا۔ اور جس سماج کے لوگوں میں ایک دوسرے کے لیے رحم کا جذبہ نہ ہو، ایسا سماج ایک جنگل کی مانند ہوگا جس میں کسی کو بھی سکون حاصل نہیں ہوگا۔

جب ایک آدمی دوسرے آدمی پر رحم کرتا ہے تو یہ صرف دو آدمی کے درمیان کا واقعہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے نتیجے کے اعتبار سے پورے معنوں میں ایک اجتماعی واقعہ ہوتا ہے اس سے سماج میں ایک دوسرے پر مہربانی کرنے کی روایات فروغ پاتی ہیں، سماج میں لوگوں کے درمیان رحمت و شفقت کی باتوں کا چرچا ہوتا ہے، اس سے اعلیٰ انسانی قدروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، اور پست انسانی کردار اپنے آپ لوگوں کی نظر میں بے قیمت ہو کر رہ جاتا ہے۔

دوسروں پر رحم کرنے کا نقد فائدہ یہ ہے کہ رحم کرنے والے کو اس سے قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے درمیان محترم بن کر لوگوں کے ضرر سے بچ جاتا ہے۔ اس طرح کے عمل کے ذریعے سماج میں جو ماحول بنتا ہے اس کا فائدہ براہِ راست اور بالواسطہ طور پر بار بار پہلے آدمی کو بھی پہنچتا رہتا ہے۔

دوسروں پر رحم کرنے والا انسان دنیا میں بھی خدا کی رحمت و برکت میں حصہ دار بنتا ہے۔ اور آخرت میں بھی مزید اضافے کے ساتھ وہ خدا کی رحمت اور برکت کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

انسانی سماج وہ ہے جہاں لوگوں میں ایک دوسرے کے لیے شفقت و محبت پائی جائے۔

یکساں برتاؤ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من لم یرحم صغیرنا ومن لم یُوقّر کبیرنا فلیس منّا (ترمذی) یعنی جو شخص ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی عزت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

انسانی سماج میں چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور بڑے بھی۔ انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ چھوٹوں کے ساتھ رحم کا معاملہ کیا جائے، اور جو بڑے ہیں ان کے ساتھ عزت کا معاملہ کیا جائے۔ جس سماج میں یہ اخلاقی فضا ہو وہی حقیقی معنوں میں انسانی سماج ہوگا۔ اور جس سماج میں یہ فضا نہ ہو وہ گویا غیر انسانی سماج ہوگا نہ کہ انسانی سماج۔

انسانی فطرت میں جو اعلیٰ احساسات رکھے گئے ہیں ان میں سے ایک احساس یہ ہے کہ آدمی جب کسی کو اپنے سے چھوٹا دیکھے تو اس کے دل میں اس کے لیے شفقت و مہربانی کے جذبات ابھریں اور جب وہ کسی کو اپنے سے بڑا پائے تو اس کے لیے اس کے دل میں تعظیم کے جذبات پیدا ہوں۔

سماج میں چھوٹے اور بڑے کا ہونا اس لیے نہیں ہے کہ لوگ حقیقت میں چھوٹے اور بڑے ہیں، خدا کی نظر میں سارے انسان برابر ہیں۔ اس قسم کا فرق صرف لوگوں کی جانچ کے لیے ہے۔ ہر آدمی کسی کے مقابلے میں چھوٹا ہے اور کسی کے مقابلے میں بڑا۔ اس طرح ہر آدمی دو طرفہ طور پر امتحان میں ہے اس کو دُگنا آزمائش پر پورا اترنا ہے۔ جو لوگ اس امتحان میں خدا کے مطلوب رویے پر قائم رہیں تو وہی دراصل کامیاب لوگ ہیں، موجودہ دنیا میں بھی اور موت کے بعد آنے والی دوسری دنیا میں بھی۔

ایک طرف مہربانی اور دوسری طرف تعظیم، یہ دو صفتیں صرف دو نہیں ہیں بلکہ وہ پورے انسانی سلوک کی رہنما ہیں جن لوگوں کے اندر یہ صفت آ گئی ان کا رویہ یقینی طور پر پورے انسانی سلوک کے بارے میں درست ہو جائے گا، وہ اپنے معاشرے کو بنانے والے ہوں گے نہ کہ اس کو بگاڑنے والے۔

فلاح کا راستہ

صحیح مسلم میں یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ——— اس شخص نے فلاح پائی جس نے اطاعت کی، اور اس کو بقدر ضرورت رزق ملا، اور خدا نے اس کو جو کچھ دیا اس پر اس کو قناعت کی توفیق ملی (قد افلح من اسلم، ورزق کفافاً، وقنعه الله بما آتاه)

اس دنیا میں فلاح و کامیابی کا راز زیادتی میں نہیں ہے بلکہ قناعت میں ہے۔ زیادہ چاہنے والے کے لیے کبھی حد نہیں آتی۔ مگر قناعت کرنے والے کے لیے حد آجاتی ہے۔ وہ ایک مقام پر پہنچ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ زیادہ کی حرص کرنے والا ہمیشہ بے اطمینانی کی حالت میں رہتا ہے، اور ملے ہوئے پر قناعت کرنے والا ہمیشہ اطمینان کی حالت پر۔

بقدر ضرورت رزق کس کو ملتا ہے، یہ وہ شخص ہے جو اپنی تمام کوششوں کو صرف مال کے حصول میں نہ لگائے بلکہ اسی کے ساتھ وہ ایک فکری اور روحانی زندگی بھی گزار رہا ہو۔ اس کی روحانیت اور اس کا فکری ارتقا اس بات کا ضامن بن جاتا ہے کہ وہ مال ہی کو سب کچھ نہ سمجھے۔ ایسا آدمی عین اپنے مزاج کے مطابق اس حقیقت کو جان لیتا ہے کہ مال میرے لیے ہے نہ کہ میں مال کے لیے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ محدود مال اس کی ضرورت کے لیے کافی ہوگیا تو اپنے آپ اس کی رغبت لامحدود مال کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔ وہ ایک ایسی زندگی کو پالیتا ہے جس میں سکون ہی سکون ہو اور اطمینان ہی اطمینان ہو۔

یہ ضروری ہے کہ آدمی کے پاس اتنا مال ہو کہ اس کا کوئی حقیقی کام اٹکا ہوا نہ رہے۔ مگر یہ بالکل غیر ضروری ہے کہ آدمی کے پاس مال کا ڈھیر ہو، حتی کہ وہ یہ بھی نہ جانے کہ اس مال کو اسے کہاں خرچ کرنا چاہیے۔

مال آدمی کی ضرورت ہے، مال آدمی کا مقصد نہیں۔ یہی اس دنیا میں پرسکون زندگی کا راز ہے اور جو لوگ ایسی زندگی پر راضی ہو جائیں انھیں کے لیے یہ مقدر ہے کہ وہ روحانی ترقی کریں، وہ فکری بلندی کے اعلیٰ درجات کو پاسکیں۔

اجتماعی زندگی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپس میں بغض نہ رکھو اور آپس میں حسد نہ کرو اور ایک دوسرے سے دشمنی نہ کرو اور خدا کے بندو! بھائیوں کی طرح رہو اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رہے (عن انس بن مالك انّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وكونوا عباد الله اخواناً ولا يَحِلُّ لمسلم ان يهجرَ اخاه فوقَ ثلاث) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب

انسان سماج کے اندر کس طرح رہے، اس کا ایک فطری نمونہ خدا نے ہر ایک کی قریبی زندگی میں قائم کر دیا ہے۔ یہ بھائی بہن کا نمونہ ہے۔ ہر گھر میں بھائی اور بہن ہوتے ہیں۔ ہر آدمی خود اپنی فطرت کے زور پر اپنے بھائی اور بہن کا خیر خواہ ہوتا ہے، وہ اپنے بھائی اور بہن سے محبت کرتا ہے۔ ہر آدمی بھائی اور بہن کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھتا ہے۔ وہ بھائی اور بہن کی ضرورت کو خود اپنی ضرورت کی طرح دیکھتا ہے۔ یہی چیز ہے جو ہر گھر کو سکون کا گہوارہ بنا دیتی ہے۔ آدمی جس طرح اپنے گھر میں رہتا ہے اسی طرح اس کو سماج میں رہنا ہے۔ ہر آدمی کا اپنا گھر وہ فطری ماڈل ہے جو اس کو بتاتا ہے کہ وہ سماج میں کس طرح رہے۔ اگر ہر آدمی باہر کے ماحول میں بھی اسی طرح رہے جس طرح وہ اپنے گھر میں رہتا ہے تو پورا سماج امن اور رحمت کا سماج بن جائے گا۔

یہ فطری ماڈل کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں، ان کا سینہ ایک دوسرے کے خلاف بغض سے خالی ہو۔ لوگ ایک دوسرے کی ترقی پر خوش ہوں، سماج کا ایک فرد سماج کے دوسرے فرد کی ترقی پر حسد نہ کرے۔ ہر مرد و عورت کے دل میں دوسرے مرد و عورت کے لیے محبت کا جذبہ ہو۔ ان کا سینہ ایک دوسرے کی دشمنی سے خالی ہو۔ اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچتی ہے۔ ایسے موقع پر آدمی کو چاہیے کہ وہ فریق ثانی کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ کرے۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ بات بڑھ جائے اور دونوں ایک دوسرے سے دوری اختیار کر لیں تو زیادہ سے زیادہ تین دن تک ان کو اس حال میں رہنے کی رخصت ہے، تین دن کے بعد ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے غصہ کو ٹھنڈا کر لیں اور دوبارہ معتدل انداز میں ملنا جلنا شروع کر دیں۔

نیکی اور بدی

حدیث میں آیا ہے کہ ——— نواس ابن سمعان انصاری نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور بدی کے بارہ میں پوچھا۔ آپؐ نے جواب دیا : نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور بدی وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تمہیں ناپسند ہو کہ لوگ اس سے باخبر ہوں (عن النواس ابن سمعان الانصاری قال سألتُ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن البر والاثم فقال البرُّ حُسن الخلق والاثم ما حاك فی صدرك وكرهتَ ان یطّلع علیہ الناس) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب

سماج کا بہترین شہری کون ہے۔ یہ وہ انسان ہے جس کی فطرت زندہ ہو اور اس کے اندر نیکی اور بدی کا احساس موجود ہو۔ وہ ہر معاملہ میں نیکی کے رخ پر چلے اور بدی کی روش سے اپنے آپ کو دور رکھے۔

نیکی اور بدی کا شعور انسان کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں ہے۔ وہ انسان کی فطرت میں پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو ضمیر کہا جاتا ہے۔ ضمیر ہر انسان کے اندر گویا فطرت کا معلم ہے۔ انسان اگر اپنے ضمیر کی آواز کو نہ دبائے تو وہی اس کی رہنمائی کے لیے کافی ہو جائے گی۔

ضمیر کے زندہ ہونے کی پہچان یہ ہے کہ آدمی جب نیکی کرے تو اس پہ خوشی حاصل ہو۔ سچ بولنا، امانت کو ادا کرنا، پڑوسی کا حق ادا کرنا، دوسروں کی خدمت کرنا، یہ سب نیکی کے عمل ہیں۔ باضمیر انسان جب اس قسم کا کوئی عمل کرتا ہے تو اس کی یہ نقد قیمت اس کو ملتی ہے کہ اس کا دل سکون و اطمینان سے بھر جاتا ہے۔

بدی والے اعمال کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ آدمی جب کوئی غلط کام کرتا ہے تو ایسا کام کرنے کے لیے اس کو اپنے ضمیر کے خلاف چلنا ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدی کا کام کرکے آدمی کو خوشی نہیں ہوتی۔ بدی کا کام اس کے دل کے بوجھ کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ ایک طرف اس کا دل ساتھ نہیں دیتا اور دوسری طرف اس کو یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں دوسرے لوگ اس سے باخبر نہ ہو جائیں جس کے نتیجہ میں اس کو شرمندگی اٹھانی پڑے۔

نیکی کا نقد فائدہ دل کا سکون ہے اور بدی کا نقد انجام دل کی بے سکونی۔

گمان نہ کرنا

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ——— تم گمان سے بچو کیوں کہ گمان سب سے بڑا جھوٹ ہے (عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ناقص اور ادھوری معلومات کی بنا پر ایک مرد یا عورت کو دوسرے مرد یا عورت کے بارے میں بدگمانی ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے مواقع پر یہ بے حد غیر ذمہ داری کی بات ہے کہ جو برا خیال دل میں آئے اس پر یقین کر لیا جائے اور اس کے مطابق مذکورہ فرد کو برا سمجھا جانے لگے۔

اس قسم کی بدگمانی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ آپ نے معاملہ کے سارے پہلوؤں کو جانے بغیر محض ناقص معلومات کی بنیاد پر کسی کے بارے میں ایسی رائے قائم کر لی جو واقعہ کے مطابق نہ تھی۔ جس طرح واقعہ کے خلاف بات کہنا جھوٹ ہے، اسی طرح واقعہ کے خلاف رائے بنانا بھی بلاشبہ جھوٹ ہے۔

صحیح انسان وہ ہے جس کا حال یہ ہو کہ جب اس کے سامنے گمان والی کوئی بات آئے تو وہ رائے قائم کرنے سے پہلے اس کی تحقیق کرے۔ وہ معاملہ کے تمام متعلق پہلوؤں کو جاننے کے بعد کوئی رائے بنائے۔ تحقیق کے بغیر رائے قائم کرنا، جھوٹی رائے قائم کرنا ہے۔ اور تحقیق کے بعد رائے قائم کرنا، سچی رائے قائم کرنا ہے۔

اگر کسی کے پاس اتنا وقت نہ ہو کہ وہ معاملہ کی پوری تحقیق کرے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس معاملہ میں خاموش رہے، وہ کسی کی بابت کسی بھی قسم کی کوئی رائے نہ بنائے۔ حدیث کے مطابق کسی انسان کے لیے جس طرح بولنا ایک کام ہے اسی طرح چپ رہنا بھی اس کے لیے ایک کام ہے۔ بولنا صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جو بولنے کے تقاضے پورے کرے۔ جو آدمی بولنے کے تقاضے پورے نہ کر سکے اس کے لیے یہاں چپ رہنا ہے نہ کہ غیر ضروری طور پر بولنا۔

حقیقی شخصیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— خدا تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے (عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم - إنّ اللہ لا ینظر الی صورکم و اموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب

فطرت کے نقشہ میں کون انسان اہم ہے اور کون انسان غیر اہم، جواب یہ ہے کہ جو انسان اپنی داخلی شخصیت کے اعتبار سے اچھا ہے وہی حقیقی معنوں میں اچھا انسان ہے۔ اور جو آدمی اپنی داخلی شخصیت کے اعتبار سے برا ہو وہ حقیقت کی نگاہ میں برا ہے خواہ ظاہری طور پر اس نے کتنا ہی خوش نما لباس کیوں نہ پہن رکھا ہو۔

ایک ظاہر وہ ہے جو لباس اور آرائش کے ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک اور ظاہر ہے جو پروپیگنڈہ کے ذریعہ بنتا ہے۔ دونوں ہی قسم کے ظاہر حقیقت کی نظر میں بے قیمت ہیں۔ جو لوگ اس قسم کے ظواہر پر کھڑے ہوں وہ اپنے لیے بھی بے فائدہ ہیں اور سماج کے لیے بھی بے فائدہ۔

دوسرا انسان وہ ہے جس کے اندر اعلیٰ انسانی صفات پائی جائیں، جو ایک اصول پسند انسان ہو، جو اخلاقی قدروں کو اپنائے ہوئے ہو، جس کے دماغ میں مثبت سوچ ہو اور جس کے دل میں مثبت جذبات بھرے ہوئے ہوں۔ ایسا انسان فطرت کا مطلوب انسان ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو کسی سماج کو حقیقی معنوں میں کامیاب سماج بناتے ہیں۔

آدمی اگر اندر سے خالی ہو اور صرف ظاہری طور پر وہ اپنے آپ کو خوشنما بنا لے تو اس سے صالح اعمال کا صدور نہیں ہو سکتا۔ وہ دیکھنے میں اچھا ہوگا مگر برتنے میں برا۔ صالح اعمال کا صدور صرف اس انسانی شخصیت سے ہوتا ہے جس کا اندرونی وجود بھی صالح اور پاک ہو۔

عمل سے خالی انسان گویا کہ صرف ایک اسٹیچو ہے۔ سچا انسان صرف وہ ہے جو عمل کے وقت عمل کا ثبوت دے سکے۔

غیبت اور بہتان

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ خدا اور اس کا رسولؐ زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ غیبت یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرو جو اس کو ناپسند ہو۔ کہا گیا اے خدا کے رسولؐ، اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کا میں نے ذکر کیا؟ آپؐ نے فرمایا: اگر اس کے اندر وہ عیب ہے جو تم کہہ رہے ہو، تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ عیب اس میں نہیں ہے تو تم نے اس کے اوپر الزام لگایا (عن ابی ھریرۃ انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اتدرون ما الغیبۃ قالوا اللّٰہ ورسولہ اعلم قال ذکرک اخاک بما یکرہ قیل افرأیتَ اِن کان فی اخی ما اقول ان کان فیہ ما تقول فقد اغتبتہ، وان لم یکنْ فیہ فقد بھتّہ) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔

صحت مند معاشرہ کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں ان میں سے ایک اہم چیز یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی خوبیوں کا تو خوب چرچا کریں۔ لیکن وہ ایک دوسرے کی کمیوں اور برائیوں کا چرچا کرنے سے پرہیز کریں۔ خوبیوں کا چرچا کرنے سے معاشرہ میں مثبت قدروں کو فروغ ملتا ہے۔ اس کے برعکس اگر لوگوں کی برائیوں اور کمزوریوں کا چرچا کیا جانے لگے تو معاشرہ میں منفی قدروں کی حوصلہ افزائی ہونے لگے گی۔

لوگوں کے شخصی عیوب کے چرچا کرنے کا نام غیبت ہے۔ اگر آپ کسی کے اندر کوئی شخصی عیب دیکھیں تو آپ کو چاہیے کہ اس سے مل کر تنہائی میں اس کو نصیحت کریں۔ لیکن مجلسوں میں اس کا چرچا کرنا سخت قابل اعتراض بات ہے۔

اس سے بھی زیادہ سنگین برائی یہ ہے کہ آپ کسی کے بارے میں وہ بات کہیں جو اس کے اندر سرے سے موجود نہیں۔ اس قسم کے عمل کا نام الزام تراشی یا بہتان ہے۔ یہ بلاشبہ بہت بڑا جرم ہے۔ کسی پر بے بنیاد الزام لگاتے ہوئے آدمی کو سوچنا چاہیے کہ یہ ایک دوطرفہ معاملہ ہے۔ یعنی وہ الزام اگر فریق ثانی پر نہیں لگا تو وہ خود کہنے والے کی طرف لوٹ جائے گا۔

نرم سلوک

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ جو شخص نرمی سے محروم رہا وہ بھلائی سے بھی محروم رہے گا (عن جریر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من یُحرَم الرفقَ یُحرَم الخیرَ)

ایک اور حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ حضرت عائشہؓ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے عائشہ! اللہ نرم ہے اور وہ نرمی کو پسند کرتا ہے اور وہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جس کو وہ سختی پر نہیں دیتا اور نہ کسی اور چیز پر دیتا ہے (عن عائشۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یا عائشۃ انّ اللہ رفیق یُحِبُّ الرفق ویعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف وما لا یعطی علی سواہٗ) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔

نرمی انسان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ نرمی کے ذریعہ لوگوں کے دل جیتے جا سکتے ہیں۔ اور جب لوگوں کے دل جیت لیے جائیں تو اس کے بعد جیتنے کے لیے کوئی اور چیز باقی نہیں رہتی۔

آپ جب لوگوں کے درمیان نرمی سے بولیں اور ان سے نرمی کا معاملہ کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دل میں آپ کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ آپ کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ماحول کے اندر ایک ایسی فضا بنتی ہے جو ہر لحاظ سے آپ کے حق میں ہوتی ہے۔ آپ کسی خارجی رکاوٹ کے بغیر اپنا ہر کام انجام دینے میں کامیاب رہتے ہیں۔

اس کے برعکس جب آپ لوگوں سے سخت انداز میں بات کریں اور لوگوں سے معاملہ کرنے میں سختی کا رویہ اپنائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پورے ماحول میں آپ کے خلاف فضا پیدا ہو جائے گی۔ لوگ آپ کو دشمن کی نظر سے دیکھنے لگیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ جو کام بھی کرنا چاہیں گے اس میں آپ کے لیے خارجی رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گی۔ ماحول کے غیر ہمدردانہ رویہ کی وجہ سے آپ کا آسان کام بھی مشکل کام بن جائے گا۔

اس دنیا میں نرمی کا کوئی بدل نہیں۔ کوئی بھی دوسری ایسی چیز نہیں جو نرمی کی کمی کی تلافی کرے۔ نرم سلوک والا آدمی اپنے ماحول میں اس طرح رہتا ہے کہ لوگ اس کے ساتھ پھول جیسا سلوک کرتے ہیں۔ اور سخت آدمی اپنے ماحول میں اس طرح رہنے پر مجبور ہوجاتا ہے جیسے کہ وہ کانٹوں کے درمیان رہ رہا ہو۔

آغاز نہیں

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— دو گالی دینے والے جو کچھ کہیں تو وہ اس پر ہے جس نے شروع کیا جب تک کہ مظلوم زیادتی نہ کرے (عن ابی ہریرۃ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال المستبان ما قالا فعلی البادی منهما مالم یعتد المظلوم) سنن ابی داؤد، کتاب الادب

یہ دنیا خدا کے بنائے ہوئے ایک فطری نظام پر قائم ہے۔ وہ فطری نظام یہ ہے کہ کوئی کسی کے اوپر زیادتی نہ کرے۔ ہر ایک اپنے دائرہ میں عمل کرنے کے لیے آزاد ہے۔ لیکن کسی کو بھی یہ آزادی نہیں کہ وہ دوسرے کے دائرہ میں داخل ہو جائے۔

دو آدمی اگر ایک دوسرے کو گالی دینے لگیں تو یہ دیکھا جائے گا کہ دونوں میں سے وہ کون شخص ہے جس نے یہ برا کام شروع کیا تھا، جس نے گالی دینے میں پہل کی تھی وہی اس برائی کا اصل مجرم ہے۔ حتی کہ دوسرے شخص نے اگر برابر کے درجہ میں دفاع کیا تھا تو وہ بری الذمہ قرار پائے گا اور دونوں ہی کی گالی کا گناہ ابتدا کرنے والے کے حساب میں لکھ دیا جائے گا۔

البتہ اگر دفاع کرنے والا برابر کا دفاع نہ کرے بلکہ وہ زیادتی کر بیٹھے، مثلاً پہلے شخص نے اگر صرف گالی دی تھی تو دوسرا شخص پتھر مار دے۔ ایسی حالت میں ساری ذمہ داری مظلوم کے اوپر چلی جائے گی۔ کیوں کہ اس نے برابر کا دفاع نہیں کیا بلکہ دفاع کی حد سے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو مزید زیادتی کا ملزم بنا لیا۔

اجتماعی زندگی کے لیے یہی فطرت کا قانون ہے۔ خدا نے انسان کو ایسی ساخت کے ساتھ پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے آپ فطرت کے اس قانون کی پیروی کرتا ہے۔ فطرت ہر انسان کی سب سے بڑی رہنما ہے۔ اگر انسان کو منحرف نہ کیا جائے تو وہ خود اپنے اندرونی تقاضے کے تحت فطرت کی شاہراہ پر چلتا رہے گا۔ مجرم وہ ہے جو فطرت کے اس نقشہ میں خلل ڈالے۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت کے قانون میں پہل کرنے والے کو سب سے بڑا مجرم بتایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ دفاع کرنے والے کے دفاع کو بھی اسی کے خانہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ جو زیادتی کا آغاز کرے وہی پورے معاملہ کا ذمہ دار ہے، خواہ اس نے پہلے زیادتی کی ہو یا وہ بعد کو زیادتی کرنے والا بن جائے۔

رحمت کا معاملہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ اے خدا کے رسولؐ آپ مشرکوں کے خلاف بد دعا کیجیے۔ آپؐ نے فرمایا۔ میں اس لیے نہیں بھیجا گیا ہوں کہ لوگوں پر لعنت کروں۔ بلکہ میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں (عن ابی هریرة قال قیل یا رسول اللہ ادعُ علی المشرکین قال اِنّی لم اُبعث لعّاناً و اِنّما بُعثتُ رحمةً) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والادب۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں جب لوگوں کو ایک خدا کا پرستار بننے کی طرف بلایا تو وہ آپ کے دشمن ہو گئے اور وہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ستانے لگے۔ آپ کے ساتھیوں نے چاہا کہ لوگوں کے خلاف بد دعا کی جائے مگر پیغمبر اسلامؐ نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ سچا مصلح وہ ہے جو ہر حال میں مثبت طرزِ فکر پر قائم رہے، وہ کسی حال میں بھی منفی ذہنیت میں مبتلا نہ ہو۔

یہی مصلح کا کردار ہے۔ وہی انسان سماجی اصلاح کا کام کر سکتا ہے جس کا سینہ اتنا کشادہ ہو کہ وہ ہر حال میں لوگوں کا خیر خواہ بنا رہے۔ لوگوں کے حق میں اس کی رحمت و شفقت کسی حال میں ختم نہ ہونے پائے۔ دوسروں کے رویہ کی پروا کیے بغیر وہ اپنے اصلاحی مشن پر قائم رہے۔

اگر ایک شخص آپ کے خلاف زیادتی کرے تو آپ کے لیے کرنے کا یہی ایک کام نہیں ہے کہ آپ اس سے متنفر ہو جائیں اور اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ آپ کے لیے اس سے بھی زیادہ بڑا ایک اور کام ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ یک طرفہ طور پر اس کی اصلاح کے خواہش مند بنے رہیں۔ آپ دل سے اس کی بہتری چاہیں۔ اس کو متاثر کرنے کی ضروری تدبیریں کریں، اس کے حق میں خدا سے اچھی دعائیں کریں یہ بھی ایک عمل ہے، یہ بھی ایک تدبیر ہے، بلکہ وہ ایسے موقع کے لیے زیادہ اچھی تدبیر ہے۔

بہتر معاشرہ وہ ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کے سچے خیر خواہ ہوں۔ ان کا خیر خواہی کا جذبہ اتنا طاقتور ہو کہ وہ ہر حال میں باقی رہے۔ دوسروں کا مخالفانہ رویہ بھی اس کو متزلزل نہ کر سکے۔ جو لوگ اپنے سینہ میں اس قسم کی خیر خواہی کی پرورش کریں وہ خود اپنی انسانیت کو بلند کر رہے ہیں۔ یہ خیر خواہی اس بات کی ضامن ہے کہ سماج کبھی بگاڑ کا شکار نہ ہو۔

یکساں کردار

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ لوگوں میں سب سے زیادہ برا وہ ہے جو دو چہرے والا ہے۔ جو کچھ لوگوں کے سامنے ایک چہرہ کے ساتھ آتا ہے اور کچھ لوگوں کے سامنے دوسرے چہرہ کے ساتھ (عن ابی هریرة انّ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال إنّ من شرّ الناس ذا الوجهین الذی یأتی هٰؤلاء بوجه وهٰؤلاء بوجه) صحیح مسلم

سچا انسان وہ ہے جس کے قول اور کردار میں یکسانیت ہو، جو وہی کہے جو اس کو کرنا ہے۔ اور وہی کرے جو اس نے اپنی زبان سے کہا ہے۔

یہی با اصول انسان کا معاملہ ہے۔ با اصول انسان وہ ہے جس کی روش کچھ پختہ اصولوں پر مبنی ہو۔ ایسا آدمی ہمیشہ یکساں کردار کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی حالات کو دیکھ کر اپنا رویہ متعین کرے، اس کے کردار میں یکسانیت نہیں ہوگی۔ وہ کچھ لوگوں کے سامنے ان کی رعایت سے ایک کردار اپنائے گا۔ اور جب وہ دوسری قسم کے لوگوں کے سامنے آئے گا تو ان کی رعایت سے وہ دوسرے کردار کا مظاہرہ کرنے لگے گا۔

دُہرا کردار انسانیت کی توہین ہے۔ دہرا کردار اختیار کرکے آدمی جو فائدہ حاصل کرتا ہے وہ ایک عظیم تر نقصان کی قیمت پر ہوتا ہے۔ وہ نقصان یہ ہے کہ اس کا ضمیر مُردہ ہو جائے، اس کے اندر روحانی ارتقار کا عمل جاری نہ ہو سکے۔

فطرت کے نقشہ میں اعلیٰ انسان وہ ہے جو معلوم کردار کا حامل ہو، جس کے بارہ میں پیشگی طور پر یہ اندازہ کیا جا سکے کہ کسی صورت حال میں وہ کس قسم کے کردار کا ثبوت دے گا۔

خدا کی کائنات میں ہر چیز قابل پیشین گوئی کردار کی حامل ہے۔ آسمان کے ستاروں سے لے کر زمین کے درختوں اور پودوں تک کا یہ حال ہے کہ آپ پیشگی طور پر ان کے سلوک کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ فطرت کا یہی نظام انسان سے بھی مطلوب ہے۔ سچا انسان وہ ہے جس کے بارے میں آپ پیشگی طور پر یہ یقین کر سکیں کہ اس سے جو امید کی جائے گی اس کو بہرحال وہ پورا کرے گا، وہ کبھی اس سے پیچھے ہٹنے والا نہیں۔

بہادر کون

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — طاقتور وہ نہیں ہے جو کشتی میں پچھاڑ دے، طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے (عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس الشدید بالصرعۃ انما الشدید الذی یملک نفسہ عند الغضب) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔

فطرت کے نقشہ میں طاقت کا معیار خارجی نہیں ہے بلکہ داخلی ہے۔ کوئی شخص خارجی دنیا میں بڑے بڑے واقعات ظہور میں لائے، مثلاً وہ لڑائی میں کسی کو ہرا دے، تو فطرت کے نزدیک یہ کوئی بڑا واقعہ نہیں ہے۔ زیادہ بڑا واقعہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو قابو میں رکھے، ہیجان خیز لمحات میں بھی وہ اخلاق اور شرافت کی حد سے باہر نہ جائے۔

کوئی معاشرہ اچھا معاشرہ کب بنتا ہے، اس کا معیار یہ نہیں ہے کہ معاشرہ میں ایسے بہت سے زور آور موجود ہوں جو لڑائی کے موقع پر دوسروں کو پچھاڑ دیا کریں۔ اس قسم کی پہلوانی کسی کو شخصی ہیرو بنا سکتی ہے مگر ایسی پہلوانی کرنے والے کبھی کوئی اچھا سماج نہیں بنا سکتے۔

اچھا سماج وہ لوگ بناتے ہیں جو خود اپنے آپ کو زیر کرنے والے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انھیں کسی کے خلاف غصہ آتا ہے تو وہ دوسرے پر طاقت آزمائی کرنے کے بجائے خود اپنی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، وہ اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کو دباتے ہیں، وہ اپنے اندر ابھرنے والی انتقامی نفسیات کو کچلتے ہیں، وہ اپنے اندر پیدا ہونے والی منفی سوچ کو دوبارہ مثبت رخ کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ وہ معاف کرنے کے بہادر ہوتے ہیں نہ کہ بدلہ لینے یا سبق سکھانے کے بہادر۔

دوسرے کو پچھاڑنے کی طاقت حیوان میں بھی ہوتی ہے۔ مگر یہ صرف انسان ہے جو اپنے آپ کو پچھاڑنے کا کارنامہ انجام دیتا ہے۔ انسان کی بہادری کو ناپنے کا پیمانہ یہی انسانی اخلاق ہے نہ کہ عام حیوانی اخلاق۔ یہ اخلاقی بہادری ہے۔ اور اخلاقی بہادری سے زیادہ بڑی بہادری اور کوئی نہیں۔

انسانی ہمدردی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — تم بھلائی کے کسی کام کو کم نہ سمجھو، خواہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ کشادہ پیشانی سے ملنا ہی کیوں نہ ہو (عن ابی ذرٍ قال قال لی النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم لاتحقرنَّ من المعروف شیئاً ولو ان تلقیٰ اخاك بوجهٍ كريم) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔

بہتر سماج بہتر انسانوں سے بنتا ہے، اور بہتر انسان وہ ہے جو نفع بخش انسان ہو، جو اس طرح دنیا میں زندگی گزارے کہ وہ دوسروں کو دینے والا بنا ہوا ہو۔ اس کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے اگر کوئی بڑی چیز ہو تو وہ انھیں بڑی چیز دے۔ اور اگر اس کے پاس دینے کے لیے کوئی بڑی چیز نہیں ہے تو وہ وہی چیز دے جو اس کے پاس موجود ہے۔

انسانیت کا خلاصہ خیر خواہی ہے۔ ایک انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لیے ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ ہو، یہی انسانیت کا اصل معیار ہے۔ جو انسان اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے اچھے جذبات سے خالی ہو وہ انسان ہی نہیں۔ وہ شکل کے اعتبار سے انسان ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے غیر انسان۔

جو انسان اپنے سینہ میں دوسرے انسانوں کے لیے خیر خواہی کا جذبہ لیے ہوئے ہو اس کا اظہار ہر لمحہ اور ہر موقع پر ہوتا رہے گا، حتی کہ جس وقت بظاہر وہ انسانوں کے درمیان نہیں ہوگا تب بھی اس کے سینہ میں دوسروں کے لیے فکرمندی ہوگی، تب بھی وہ دوسروں کے لیے اچھی دعائیں کر رہا ہوگا۔

ایسا انسان جب دوسروں سے ملے گا تو اس کے دل کی خیر خواہی خندہ پیشانی کی صورت میں اس کے چہرہ پر ظاہر ہو جائے گی۔ وہ راستہ میں کوئی رکاوٹ دیکھے گا تو اس کو ہٹا دے گا تاکہ کسی چلنے والے کو تکلیف نہ ہو، وہ کسی کو زخمی دیکھے گا تو اس کے علاج کی فکر کرے گا، وہ کسی کو ضرورت مند پائے گا تو وہ اپنی جیب سے اس کے اوپر خرچ کرے گا۔

سچا انسان اسی طرح نفع بخش بن کر جیتا ہے۔ وہ یک طرفہ طور پر دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے، خواہ دوسروں کی طرف سے اس کو کچھ بھی ملنے والا نہ ہو۔

مقام عمل

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے عقبہ بن عامر نے پوچھا کہ اے خدا کے رسولؐ — نجات کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم اپنی زبان کو قابو میں رکھو اور اپنے گھر کو اپنے لیے کافی سمجھو اور اپنی خطاؤں پر روؤ (عن عقبة بن عامر رضی اللہ عنہ قال قلت یارسول اللہ ما النجاةُ قال امسِك علیك لسانك ولیسعك بیتك وابك علیٰ خطیئتك)
ریاض الصالحین، باب فی تحریم الغیبة والامر بحفظ اللسان، صفحہ ۳۱۱

زندگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کام اس کو سمجھے کہ وہ دوسروں کے مسائل پر کلام کرے، وہ خارجی دنیا میں اپنا مقام بنانے کی کوشش کرے، وہ دوسروں کی کمیوں اور کوتاہیوں میں الجھا ہوا ہو۔ یہ سب اپنے کام کے میدان کو اپنے سے باہر سمجھنا ہے، اور اپنی ذات سے باہر کام کا میدان بنانا فطرت کے نقشہ کے مطابق نہیں۔

زیادہ صحیح اور فطری بات یہ ہے کہ آدمی خود اپنی ذات کو اپنے کام کا میدان بنائے ہوئے ہو، وہ بولنے سے زیادہ سوچے۔ دور کے میدان کے بجائے وہ اپنے قریب کے دائرہ میں اپنی سرگرمیاں جاری کیے ہوئے ہو۔ دوسروں کی غلطیوں اور زیادتیوں کا چرچا کرنے کے بجائے وہ خود اپنے محاسبہ میں لگا ہوا ہو۔ محاسبۂ خویش کا یہ عمل وہ اتنی شدت کے ساتھ کرے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں۔

کامیابی کا دار و مدار اسی کے اوپر ہے، آدمی کی اپنی ذات پوری طرح اس کے قابو میں ہوتی ہے، جبکہ باہر کی دنیا اس کے اپنے قابو میں نہیں۔ اپنے ذاتی دائرہ میں کی جانے والی ہر کوشش نتیجہ خیز ہوتی ہے، جبکہ باہر کے دائرہ میں کی جانے والی کوشش کا نتیجہ خیز ہونا یقینی نہیں۔

اپنی ذات کے دائرہ میں عمل کرنے کا پہلا یقینی فائدہ یہ ہے کہ اس کوشش کا کوئی ادنیٰ جز بھی بے نتیجہ نہیں رہتا۔ وہ ہر حال میں نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے، خواہ یہ نتیجہ کوشش کرنے والے کو نفسیات کی سطح پر ملے یا مادی اور عملی سطح پر۔ مزید یہ کہ یہی وہ طریقہ ہے جو خود خارجی اعتبار سے بھی مفید ہے۔ اجتماعی زندگی افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہے۔ افراد کا معاملہ اگر درست ہو جائے تو اس کے بعد اجتماع کا معاملہ اپنے آپ درست ہو کر رہتا ہے۔

حسد کی آگ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— تم لوگ حسد سے بچو، کیوں کہ حسد نیکیوں کو اسی طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے (عن ابی هريرة انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ایاکم والحسد فانّ الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد۔

حسد یہ ہے کہ آپ جب کسی کو کسی اعتبار سے اپنے سے بڑا دیکھیں تو آپ اس کی بڑائی پر خوش نہ ہوں بلکہ اپنے دل میں اس کے خلاف جلن محسوس کریں۔ اسی کا نام حسد ہے۔ حسد کرنے والا بظاہر دوسرے کے خلاف حسد کرتا ہے، لیکن اس کا نقصان سب سے پہلے خود حسد کرنے والے کو بھگتنا پڑتا ہے۔

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں کبھی بھی تمام لوگ یکساں نہیں ہو سکتے۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو کم ملتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ ایسی حالت میں جو آدمی کسی کی بڑائی کو دیکھ کر حسد میں مبتلا ہو وہ گویا فطرت سے لڑنا چاہتا ہے، اور فطرت سے لڑ کر کبھی کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں ترقی کا راز یہ ہے کہ آدمی کی سوچ مثبت سوچ ہو، وہ منفی سوچ سے اپنے آپ کو بچائے ہوئے ہو۔ مگر حسد مثبت نفسیات کا قاتل ہے۔ جو آدمی حسد میں مبتلا ہو جائے، اس نے گویا اپنے سینہ کو منفی جذبات کی پرورش گاہ بنالیا، اس نے اپنی ترقی کا دروازہ خود اپنے ہاتھوں سے بند کر لیا۔

سماج میں کوئی آپ کے نیچے ہوتا ہے اور کوئی آپ سے اوپر۔ ایسی حالت میں صحیح روش یہ ہے کہ جب آپ کسی کو اپنے سے کم دیکھیں تو آپ کے اندر اس کی مدد کرنے کا جذبہ پیدا ہو، اور جب آپ کسی کو اپنے سے زیادہ دیکھیں تو آپ کسی جلن کے بغیر یہ سوچیں کہ وہ بھی انسان ہے اور میں بھی انسان ہوں۔ اگر اس نے اپنی انسانی صلاحیتوں کا استعمال کر کے بڑی ترقی حاصل کر لی تو یہی چیز میرے لیے بھی ممکن ہے —— اسی کا نام مثبت سوچ ہے۔

عفو و درگزر

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— معافی اور درگزر سے صرف انسان کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے۔ پس اے لوگو! تم عفو و درگزر سے کام لو خدا تمہاری عزت کو بڑھائے گا (عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما ازداد احدٌ بعفوٍ الا عزاً فاعفوا یعزکم اللہ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۱۱۴

خاندانی اور سماجی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے ٹھیس پہنچتی ہے۔ ایک مرد یا عورت سے دوسرے مرد یا عورت کو ایسا تجربہ پیش آتا ہے جو اس کے اندر چھپے ہوئے غصہ کے جذبات کو بھڑکا دیتا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی آگ سینہ میں اتر آئی ہے جو ہر چیز کو جلا دینا چاہتی ہے۔

یہ بے حد نازک لمحہ ہوتا ہے۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ آدمی جواب کا طریقہ اختیار کرے، وہ اپنے سینہ کی آگ کو دوسرے کے اوپر انڈیل دے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آدمی فریق ثانی کو معاف کر دے، اس کے مقابلہ میں وہ جواب کے بجائے خاموشی کا طریقہ اختیار کر لے، ان دونوں طریقوں کے اثرات ایک دوسرے سے انتہائی طور پر مختلف ہیں۔

آدمی جب فریق ثانی کی اس اشتعال انگیزی کے بعد خود بھی مشتعل ہو جائے تو وہ فریق ثانی کو خود اپنے ہی برابر دکھائی دے گا، وہ سمجھے گا کہ جیسا میں ویسا وہ۔ ایسی صورت میں صرف دو طرفہ ٹکراؤ جاری رہے گا، ٹھیک اسی طرح جیسے حیوانوں میں دو طرفہ ٹکراؤ ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن اگر آپ ایسا کریں کہ فریق ثانی کی اشتعال انگیزی کے باوجود آپ چپ ہو جائیں، آپ غصہ کے جواب میں معافی اور درگزر کا طریقہ اختیار کریں تو اس کا نتیجہ مکمل طور پر مختلف ہوگا۔ اب فریق ثانی کو محسوس ہوگا کہ آپ اس سے بلند ہیں، اخلاقی اعتبار سے وہ نیچے ہے اور آپ اوپر۔ اس طرح آپ کی معافی کا نتیجہ آپ کو عزت کی صورت میں ملے گا۔ وقتی طور پر اپنی بے عزتی کو برداشت کر لینا آپ کے وقار کو بے پناہ حد تک بڑھا دے گا —— اس دنیا میں عزت و وقار کا راز بدلہ لینے میں نہیں ہے بلکہ معاف کر دینے میں ہے۔ یہی اس دنیا کے لیے اس کے خالق کا قانون ہے، اور خالق کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

درست بات

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— جو شخص اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ بولے تو بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیراً او لیصمت) ریاض الصالحین، باب فی تحریم الغیبۃ والامر بحفظ اللسان صفحہ، ۳۶۹

ذمہ دار انسان وہ ہے جو بولنے سے پہلے سوچے اور جب بولے تو وہی بات بولے جو سوچنے اور سمجھنے کے بعد اس کو بولنے کے قابل نظر آئی ہو۔

جس طرح بولنا ایک کام ہے، اسی طرح چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ کبھی آدمی کو اس لیے چپ رہنا چاہیے کہ وہ معاملہ کے بارے میں پوری واقفیت نہیں رکھتا۔ اور ناقص واقفیت کے ساتھ بولنا اپنا بھی نقصان کرنا ہے اور دوسرے کو بھی نقصان میں ڈالنا۔ مزید یہ کہ کسی معاملہ میں کمتر واقفیت کے باوجود بولنا ایک غیر ذمہ داری کی روش ہے، اور غیر ذمہ داری سے زیادہ بری چیز کسی انسان کے لیے اور کوئی نہیں۔

سچا بولنا کیا ہے۔ سچا بولنا یہ ہے کہ آدمی جس مسئلہ پر بولنا چاہتا ہے، وہ اس کی مکمل تحقیق کرے۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح تعصبات سے خالی کرے۔ تاکہ وہ جو رائے قائم کرے وہ ایک غیر جانب دارانہ رائے ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی انتہائی طور پر ضروری ہے کہ آدمی بولنے سے پہلے اس کے نتیجہ کے بارے میں سوچے۔ ایک درست بات بھی اگر انجام کے اعتبار سے برا نتیجہ پیدا کرنے والی ہو تو ایسی درست بات کو بولنا بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ نا درست بات کو بولنا۔

درست کلام کیا ہے۔ درست کلام وہ ہے جو حقیقت واقعہ کے مطابق ہو، جس سے حق کی برتری مقصود ہو، نہ کہ اپنی ذات کی برتری، جو بولنے والے کے لیے اپنے ضمیر کی آواز کی حیثیت رکھتا ہو، جو ایسا ہو کہ جب اس کو علم اور عقل کی کسوٹی پر جانچا جائے تو وہ پورا اترے۔ جو ابدی حقیقت کا ترجمان ہو نہ کہ محض وقتی مصلحت کا اظہار —— بولنا اس کا حق ہے جو چپ رہنا جانے۔ چپ رہ کر جو کچھ کرنا ہے جب آدمی اس کو کر لے، اس کے بعد ہی وہ اس کا حقدار بنتا ہے کہ وہ بولے۔

طاقت کا صحیح استعمال

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق ؓ سے فرمایا کہ —— اے ابو حفص، تم بہت طاقتور آدمی ہو، پس تم کمزور کو نہ ستاؤ (قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعمر بن الخطاب: یا ابا حفص، انک فیک فضلُ قوۃٍ، فلا تؤذِ الضعیف) جامع الاصول فی احادیث الرسول ۳ صفحہ ۱۸۳۔

سماج میں ہمیشہ کچھ لوگ کمزور ہوتے ہیں اور کچھ طاقتور، کچھ غریب اور کچھ امیر، کچھ کم وسائل والے اور کچھ زیادہ وسائل والے۔ یہ فرق ایک فطری فرق ہے اور وہ ہر زمانہ میں اور ہر حال میں باقی رہتا ہے۔

یہ فرق اس لیے نہیں ہے کہ جو طاقت ور ہے وہ کمزور کو ستائے۔ جس کے پاس زیادہ ہے وہ کم والے کو حقیر سمجھے۔ یہ فرق صرف اس لیے ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی کمی کو پورا کریں، لوگ تقسیم کار کے اصول پر زندگی کا نظام چلائیں۔

بعض کام ایسے ہیں کہ انھیں طاقتور انجام دے سکتا ہے، لیکن کمزور اسے انجام نہیں دے سکتا۔ اسی طرح کچھ اور کام ہیں جن کو کرنا کمزور کے لیے آسان ہوتا ہے اور طاقتور کے لیے مشکل۔ یہ ایک فطری تقسیم کار ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنی ملی ہوئی حیثیت کو خدا کی طرف سے دیا ہوا سمجھیں، وہ اس کو خدا کے اجتماعی منصوبہ کے ایک جزء کے طور پر دیکھیں۔ اگر لوگوں میں یہ ذہن ہو تو ہر آدمی حقیقت پسند بن جائے گا، ہر آدمی خدا کے منصوبہ کی تکمیل میں اپنے آپ کو لگا دے گا۔

یہی معاملہ ہر فرق کا ہے۔ انسانوں میں ایک دوسرے کے درمیان جو بھی فرق دکھائی دیتا ہے وہ امتیاز کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذمہ داریوں کی تقسیم کے لیے ہے۔ جو آدمی فرق کو امتیاز کے معنی میں لے اور انسانوں کے اوپر اس کا اظہار کرنے لگے، اس نے کسی انسان کے خلاف سرکشی نہیں کی بلکہ براہ راست خدا کے خلاف سرکشی کی، وہ خدا کے نقشِ کار کو ماننے پر تیار نہیں ہوا۔

کسی آدمی کو کوئی چیز زیادہ ملے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کو خدا کا عطیہ سمجھے اور اس پر خدا کا شکر ادا کرے۔ شکر ایک طرف خدا کی عنایات کا اعتراف ہے، اور دوسری طرف وہ آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے۔ یہ تواضع ہی تمام اعلیٰ اخلاقیات کی روح ہے۔ جس آدمی کے اندر تواضع نہ ہو وہ ایک بے قیمت انسان ہے، خدا کی نظر میں بھی اور بندوں کی نظر میں بھی۔

کائناتی نقشہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— ہر روز صبح کو دو فرشتے اترتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے۔ اے خدا! خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ دے۔ اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ اے خدا! روکنے والے کے مال کو ضائع کر دے (عن ابی هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما من يوم يُصبح العباد فيه الا ملكان ينزلان فيقول احدهما اللهم اعط منفقاً خلفاً، ويقول الآخر اللهم اعط ممسكاً تلفاً)

انسان کے لیے موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ فطرت کے نقشہ کو سمجھے اور اس کے مطابق زندگی گزارے۔ اس دنیا میں فطرت کے نقشہ سے مطابقت کا نام کامیابی ہے اور فطرت کے نقشہ سے انحراف کا نام ناکامی۔

فطرت کا نقشہ کیا ہے۔ فطرت کا نقشہ یہ ہے کہ کسی کو جو کچھ ملے وہ ایسا نہ کرے کہ اس کو خود اپنے لیے ہی سمیٹ لے بلکہ وہ اس کو دوسروں تک پہنچائے۔ سورج کو روشنی ملتی ہے تو وہ اس کو صرف اپنے لیے خاص نہیں کر لیتا بلکہ وہ اپنی روشنی کو سارے عالم میں بکھیر دیتا ہے۔ ہواؤں کے پاس آکسیجن کی نعمت ہے تو وہ اس کو ہر طرف لیے پھرتی ہیں تاکہ وہ تمام سانس لینے والوں کو اسے پہنچا سکیں۔ چشموں کے ذریعہ ایک دریا کو پانی ملتا ہے تو وہ زمین پر رواں ہو جاتا ہے تاکہ کھیتوں اور باغوں کو سیراب کر سکے۔ درخت کو پھول اور پھل ملتے ہیں تو وہ انھیں دوسروں کے لیے وقف کر دیتا ہے، وہ ایسا نہیں کرتا کہ تمام پھلوں اور پھولوں کو صرف اپنے ہی پاس رکھ لے۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ ایک انسان کو جب مال کا کوئی حصہ ملے تو اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ پورے مال کو اپنی ذاتی چیز سمجھ لے اور اس کو صرف اپنے آپ پر خرچ کرے۔ جو ایسا کرے گا وہ گویا فطرت کے نقشہ سے ہٹ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو پوری کائنات کی نظر میں مجرم بنا لیا۔

اس کے برعکس صاحبِ مال کو ایسا کرنا چاہیے کہ وہ ملے ہوئے مال میں دوسرے انسانوں کا حصہ لگائے۔ وہ اس کو بقدرِ ضرورت اپنے پاس رکھے اور اس کے بعد پوری فیاضی کے ساتھ اس کو دوسروں کی ضرورت پوری کرنے میں صرف کرے۔

مہربانی کرنا

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا —— رحم کرنے والوں پر خدائے رحمان رحم کرے گا، تم لوگ زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر مہربان ہوگا (عن عبد اللہ بن عمرو یبلغ بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم الراحمون یرحمہم الرحمٰن، ارحموا اہل الارض یرحمکم من فی السماء) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الرحمۃ۔

زندگی کا نظام رحم کے اصول پر قائم ہے۔ ہر ایک کو چاہیے کہ وہ دوسرے کے ساتھ رحمت و شفقت کا معاملہ کرے، کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے، کوئی کسی سے عداوت نہ رکھے۔

کوئی آدمی جب دوسرے کے ساتھ رحم کا معاملہ کرتا ہے تو وہ خود اپنے انسانی رتبہ کو بلند کر لیتا ہے۔ وہ اپنی روح کو یہ احساس دیتا ہے کہ میں نے وہ کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس جب کوئی آدمی دوسرے کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کرے تو وہ اپنی روح کو بتاتا ہے کہ میں نے وہ کیا جو مجھ کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کو رحم دلی کر کے سکون حاصل ہوتا ہے اور جو آدمی بے رحمی کا طریقہ اختیار کرے وہ ہمیشہ بے سکونی اور بے چینی میں مبتلا رہتا ہے۔

خدا کی سب سے بڑی صفت رحم اور مہربانی ہے۔ اس کی اس صفت کے مظاہر ساری دنیا میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی آدمی رحم دلی کا سلوک کرتا ہے تو وہ خدا کا پسندیدہ بندہ بن جاتا ہے۔ ایسے آدمی کو دنیا میں بھی خدا کی مدد ملتی ہے اور آخرت میں وہ زیادہ بڑے پیمانے پر خدائی مدد کو حاصل کرے گا۔

اس کے برعکس جو آدمی دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بے رحمی کی روش اختیار کیے ہوئے ہو، اس نے اپنے آپ کو خدا کی نگاہ میں مجرم بنا لیا۔ وہ دنیا میں تو خدا کی رحمت سے محروم رہے گا اور آخرت میں بھی وہ مزید اضافہ کے ساتھ خدا کی رحمت سے محروم کر دیا جائے گا۔

دوسروں کے ساتھ مہربانی کرنا احسان نہیں ہے بلکہ خدمت ہے۔ یہ اپنی بڑائی کا اظہار نہیں ہے بلکہ دوسروں کے حقوق کی ادائیگی ہے۔ ہر آدمی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دوسرے کو بھائی کی نظر سے دیکھے اور اس کے معاملہ میں اپنی برادرانہ ذمہ داریوں کو پورا کرے۔

حُسنِ ظن

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— لوگوں کے بارے میں اچھا گمان رکھنا اچھی عبادت کا ایک حصہ ہے (قال نصر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال حسن الظن من حُسن العبادة) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی حسن الظن۔

عبادت کوئی رسم نہیں ہے۔ عبادت اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک روحانی عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی آدمی کی زندگی میں عبادت اپنی روح کے ساتھ شامل ہوتی ہے تو اس کے اخلاقی سلوک میں بھی لازمی طور پر اس کے اثرات دکھائی دینے لگتے ہیں۔ انہی میں ایک اثر وہ ہے جس کا نام حسن ظن ہے۔

حسن ظن یہ ہے کہ آپ ہمیشہ دوسروں کے بارہ میں اچھی رائے رکھیں۔ کسی کے ساتھ آپ کا ربط قائم ہو تو آپ اس کے بارہ میں اپنی سوچ کا آغاز بدگمانی سے نہ کریں بلکہ خوش گمانی کے ساتھ کریں۔ آپ اس کو اپنے ہی جیسا ایک شریف انسان سمجھیں، نہ کہ اپنے سے مختلف کوئی غیر شریف انسان۔

اخلاق کا یہ اصول صرف عام حالات کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ غیر معمولی حالات کے لیے بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے کسی آدمی کی کوئی ایسی بات آئے جو بظاہر درست نہ ہو تب بھی آپ اس کی بہتر تاویل کریں۔ انسان کے بارے میں اپنی خوش گمانی کو آپ اس وقت تک باقی رکھیں جب تک کھلی دلیلوں سے کوئی غلط بات ثابت نہ ہو جائے۔

جس سماج میں لوگ ایک دوسرے کے بارہ میں حسن ظن سے کام لیں وہ سماج گویا پھولوں کا سماج ہوگا۔ اور جس سماج میں لوگ ایک دوسرے کے خلاف بدگمانی کرنے لگیں وہ سماج گویا ایک ایسا سماج ہے جس میں ہر طرف کانٹے بکھیر دیے گئے ہوں۔

جو آدمی دوسرے کے خلاف بدگمانی کرے وہ سب سے پہلے خود اپنے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ صحیح مزاج کا انسان نہیں، اس کے اندر انسانی صفات موجود نہیں۔ حسن ظن خود اپنی شخصیت کا اچھا تعارف ہے اور بدگمانی خود اپنی شخصیت کا برا تعارف۔

شکرواعتراف

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— جو انسانوں کا شکریہ ادا نہ کرے وہ خدا کا شکریہ بھی نہیں ادا کرے گا (عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من لم یشکر الناس لم یشکر الله) مشکاۃ المصابیح ۲ صفحہ ۹۱۱ —

اعتراف تمام انسانی صفات میں سب سے زیادہ اعلیٰ وارفع صفت ہے۔ یہ شریف آدمی کی سب سے زیادہ یقینی پہچان ہے۔ جس آدمی کے اندر اعتراف کی صفت نہ ہو، اس کے اندر انسانیت کی بقیہ صفات بھی موجود نہیں ہوں گی۔

اس اعلیٰ انسانی صفت کے دو پہلو ہیں۔ ایک کا تعلق خدا سے ہے اور دوسرے کا تعلق انسان سے۔ یہ صفت جب خدا کی نسبت سے ظاہر ہو تو اس کا نام شکر ہے۔ اور یہ صفت جب انسانوں کی نسبت سے ظاہر ہو تو اسی کا نام اعتراف ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ آدمی کے اندر ایک صفت پائی جائے لیکن اس کے اندر دوسری صفت موجود نہ ہو۔ جس آدمی کا سینہ شکر خداوندی سے معمور ہو گا وہ انسان کا اعتراف کرنے سے بھی نہیں رکے گا، اسی طرح جس آدمی کے اندر انسان کے لیے اعتراف کا جذبہ پایا جائے وہ اس سے بھی زیادہ خدا کا شکر کرنے والا ہو گا۔

شکر واعتراف کا نفسیاتی سرچشمہ جرأت ہے۔ جس آدمی کے اندر جرأت ہو اس کے لیے شکر یا اعتراف کا کلمہ بولنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس کے برعکس جو آدمی جرأت سے محروم ہو اس کا سینہ شکر واعتراف کے لیے تنگ ہو گا۔ بہادر آدمی اپنے عمل کو بھی دوسرے کے خانہ میں ڈالنے سے نہیں ڈرتا، اور جو آدمی بزدل ہو وہ کوئی بھی عمل دوسروں کے خانہ میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، نہ اپنا عمل اور نہ دوسروں کا کیا ہوا عمل۔

شکر واعتراف ایک عظیم نیکی ہے۔ ایسا کرنے والے کے سینہ میں روحانیت کا ایک باغ اُگ آتا ہے، وہ ہر قسم کے تعصبات سے بلند ہو کر جینے لگتا ہے، وہ قلب و ذہن کی کشادگی کی نعمت کو پالیتا ہے، جس سے بڑی کوئی اور نعمت اس دنیا میں نہیں ہے۔

حقیقی دولت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— دولت مندی سامان کی کثرت کا نام نہیں ہے، دولت مندی یہ ہے کہ آدمی دل کا دولت مند ہو (عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ليس الغنى عن كثرة العرض ولكن الغنى غنى النفس) تفسیر ابن کثیر ۲، ص ۵۲۳

ہر آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے پاس ہر قسم کا ساز و سامان موجود ہو، وہ زیادہ سے زیادہ سامان اکٹھا کرنے میں لگا رہتا ہے مگر اس کی فہرست کبھی مکمل نہیں ہوتی ہے۔ آدمی ایک سامان کے بعد دوسرے سامان کی طلب میں سرگرداں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ غیر مطمئن حالت میں مر جاتا ہے۔

سامان کی کثرت کے باوجود، کیوں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اطمینان کا راز کثرت میں نہیں ہے بلکہ قناعت میں ہے۔ آدمی اگر ضرورت کو معیار بنائے تو بہت جلد اس کی حد آ جائے گی۔ لیکن جب وہ فراوانی کو اپنا مقصود بنا لے تو اس کی حد کبھی نہیں آئے گی۔

سامان زندگی کے لیے ہے نہ کہ زندگی سامان کے لیے۔ سامان کی حیثیت خادم کی ہے اور انسان کی حیثیت آقا کی۔ آدمی جب ضرورت کو اپنا مقصود بنا لے تو وہ اس کے مقابلہ میں آقا کی حیثیت میں ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ سامان کو مطلق حیثیت دے دے تو سامان کی حیثیت اس کے آقا کی ہو جاتی ہے اور اس کی اپنی حیثیت خادم کی۔

بقدر ضرورت سامان پر قانع ہونے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دن اور رات سکون کے ساتھ گزرنے لگتے ہیں، وہ اطمینان کی نیند سوتا ہے اور صبح کو جب وہ سو کر اٹھتا ہے تو اس کا دل اطمینان و سکون سے بھرا ہوتا ہے۔

انسان کی اصل بلندی یہ ہے کہ اس کے سامنے ایک اعلیٰ مقصد ہو اور وہ اپنے آپ کو پورے طور پر اس میں لگا دے۔ یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آدمی مادی ساز و سامان کو ثانوی حیثیت دے اور زندگی کا جو اصل مقصد ہے اس کو اولین حیثیت سے اختیار کرے۔

تحقیق ضروری ہے

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جو کچھ وہ سنے اس کو وہ بیان کرنے لگے (عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفیٰ بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع) مشکاۃ المصابیح ، صفحہ ۵۵

آدمی جب سماج کے اندر زندگی گزارتا ہے تو طرح طرح کی باتیں اس کے سننے میں آتی ہیں، ان میں کوئی اچھی بات ہوتی ہے اور کوئی بری بات۔ اگر آپ اچھی بات کا چرچا کریں تو اس سے سماج میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر آپ کوئی بری بات سنیں اور اس کا چرچا کرنے لگیں تو اس سے پورا سماج خرابیوں کا جنگل بن جائے گا۔

اس نزاکت کا تقاضا ہے کہ آدمی اس اصول کی پابندی کرے کہ وہ سنی ہوئی باتوں کو بلا تحقیق بیان نہ کرے۔ کوئی بات اگر آپ سنیں تو اس کے بعد پہلا کام اس کی تحقیق کرنا ہے نہ کہ تحقیق کے بغیر اس کا چرچا شروع کر دینا۔

آدمی کے لیے صرف دو میں سے ایک رویہ جائز ہوسکتا ہے۔ اگر اس کو بولنا ہے تو سب سے پہلے بات کی مکمل تحقیق کرے۔ اور اگر وہ تحقیق نہیں کرسکتا تو اس پر لازم ہے کہ وہ چپ رہے۔ اس کے بعد کوئی تیسرا رویہ اس کے لیے درست نہیں۔

سنی سنائی بات کو دہرانا اور جھوٹ بولنا دونوں اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ جھوٹ یہ ہے کہ آدمی ایک بے بنیاد بات کو زبان سے نکالے، اور سنی سنائی بات کو دہرانا یہ ہے کہ آدمی ایک بے بنیاد اور غیر مصدقہ بات کا چرچا کرنے لگے۔

جس سماج میں لوگ ایسا کریں کہ وہ جو کچھ سنیں اس کو بلا تحقیق دہرانے لگیں، ایسا سماج افواہوں کا سماج بن جائے گا۔ ایسے سماج میں ہر آدمی دوسرے آدمی کو شبہ کی نظر سے دیکھے گا۔ ایسے سماج میں بدگمانی ایک عام بات بن جائے گی، لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں گے۔

جس سماج میں لوگ بلا تحقیق باتوں کو دہرانے لگیں، ایسے سماج کی بنیادیں اکھڑ جائیں گی۔ وہ ایک بکھرا ہوا سماج ہوگا نہ کہ کوئی متحد سماج۔

محنت کی کمائی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— سب سے بہتر رزق یہ ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کھائے (عن المقدام رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما اکل احدٌ طعاماً قطّ خیراً من ان یاکل من عمل یدہ) فتح الباری ۴ صفحہ ۳۵۵-

رزق ہر انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی دوسروں کی کمائی پر زندگی گزارنے کی کوشش کرے۔ مگر یہ رزق کا کوئی اچھا طریقہ نہیں۔ رزق کے حصول کا زیادہ اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنے دماغ سے محنت کرے۔ اور اس طرح ذاتی محنت سے حاصل کی ہوئی آمدنی پر زندگی گزارے۔

دوسروں کی کمائی پر زندگی گزارنا کوئی سادہ بات نہیں۔ اس سے بے شمار خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اس سے آدمی کے اندر سستی اور کاہلی آتی ہے، وہ جرأت اور حوصلہ سے محروم ہو جاتا ہے، اس کا سینہ اعلیٰ اخلاقیات کی پرورش گاہ نہیں بنتا، اس کی ذہنی اور فکری ترقی رک جاتی ہے، اس کا وجود زندگی اور حرارت کی خصوصیات سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس جو آدمی ذاتی محنت کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کرے۔ جس کی آمدنی، ایک مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہو وہ ایک بلند حوصلہ انسان ہوتا ہے۔ اس کے اندر اعلیٰ اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں، اس کے اندر اقدامی عمل کی ہمت ہوتی ہے، وہ خطرہ مول لے کر آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتا ہے، دوسروں کی کمائی پر جینے والا انسان اگر ایک ناقص انسان ہوتا ہے تو اپنی کمائی پر جینے والا انسان پورے معنوں میں ایک کامل انسان۔

جس سماج میں بیشتر لوگ دوسروں کی کمائی پر جینے والے ہوں وہاں استحصال کا مزاج پرورش پاتا ہے، لوگ ایک دوسرے کو اس نظر سے دیکھنے لگتے ہیں کہ وہ اس سے کتنا زیادہ لوٹ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جس سماج میں زیادہ لوگ اپنی محنت کی کمائی پر گزر کر رہے ہوں وہاں حقیقت پسندی کا مزاج بنے گا۔ لوگ ایک دوسرے سے لینے کے بجائے ایک دوسرے کو دینے کے شائق ہو جائیں گے۔ ایسے ماحول میں نقصان رسانی کی حوصلہ شکنی ہوگی اور نفع رسانی کی حوصلہ افزائی۔

کبر و غرور

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہو گا (لوگوں نے پوچھا کہ کبر کیا ہے) آپ نے فرمایا کہ کبر، حق کو نظر انداز کرنا اور انسانوں کو حقیر سمجھنا ہے (عن عبد اللہ بن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر، قیل وما الکبر) قال الکبر بطر الحق وغمط الناس) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر۔

کبر یا گھمنڈ بلاشبہ تمام جرموں میں سب سے بڑا جرم ہے۔ گھمنڈ کرنے والا کبھی سورج یا پہاڑ یا سمندر جیسی چیزوں کے معاملہ میں گھمنڈ نہیں کرتا۔ جب بھی کوئی گھمنڈ کرنے والا گھمنڈ کرتا ہے تو وہ انسان کے مقابلہ میں گھمنڈ کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی معاملہ میں دوسروں سے زیادہ ہے، مثلاً جسمانی طاقت یا مال کے مقابلہ میں۔ اس فرق کی بنا پر وہ دوسرے کو حقیر اور اپنے کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ اسی کا نام گھمنڈ ہے۔

مگر یہ نہایت پستی کی بات ہے کہ کوئی آدمی اس قسم کے فرق کی بنا پر گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے۔ اس لیے کہ کسی کو اگر کوئی چیز زیادہ ملی ہے تو وہ اس کی اپنی پیدا کی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ وہ خدا کی دی ہوئی ہے۔ جو چیز کسی اور کے دینے سے ملی ہو، اس پر آدمی کے اندر تواضع کی کیفیت پیدا ہونی چاہیے نہ کہ گھمنڈ کی کیفیت۔

گھمنڈ کرنا گویا اپنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آدمی گھمنڈ کی نفسیات میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ ایسے کام کرنے لگتا ہے جو اس کی انسانی حیثیت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ایسا آدمی جھوٹے بھرم میں مبتلا ہو جاتا ہے، وہ زمین میں اکڑ کر چلتا ہے، وہ حق کے آگے جھکنے کے بجائے حق کو نظر انداز کرنے لگتا ہے، وہ دوسرے انسانوں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے، حالاں کہ یہ دوسرے انسان بھی اسی خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں جس نے خود اس کو وجود بخشا ہے۔

اس دنیا میں بڑائی کا حق صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ ایسی حالت میں جو آدمی گھمنڈ کرتا ہے، وہ گویا اپنے آپ کو خدا کے برابر ٹھہرا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا گھمنڈ کرنے والے کو بے حد ناپسند کرتا ہے۔ وہ ایسے آدمی کو دنیا ہی میں ذلیل کر دیتا ہے اور آخرت میں تو اس کے لیے ذلت اور ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔

فرد اور سماج

قرآن کی سورہ نمبر ۱۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ — بے شک خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اس کو نہ بدل ڈالیں جو ان کے جی میں ہے (اِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ) الرعد ۱۱

کسی قوم یا سماج کی حالت کا انحصار اس کے افراد پر ہے۔ کسی انسانی مجموعہ میں فرد کی حیثیت جزء کی ہوتی ہے اور مجموعہ کی حیثیت کُل کی۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ کسی چیز کا جزء جیسا ہو ویسا ہی اس کا کُل ہو۔ یہی اصول انسانی سماج کے لیے بھی ہے۔

سماج کی حالت کو بہتر بنانے کی واحد صورت یہ ہے کہ اس کے افراد کو بہتر بنایا جائے۔ افراد کی تعلیم اگر اچھی ہوگی، ان کے اندر اگر اعلیٰ کیریکٹر ہوگا، وہ اگر صبر و برداشت کی صفت کے حامل ہوں گے، ان کا مزاج اگر ایسا ہوگا جو اتحاد کو پسند کرے اور اختلاف کو ناپسند، جو منفی باتوں سے دور رہے اور صرف مثبت باتوں سے دل چسپی لے، جس سماج میں ایسے افراد ہوں وہ سماج لازماً ترقی کرے گا۔ وہ حقیقی معنوں میں انسانی سماج کے درجہ کو پہنچے گا۔

اس کے برعکس اگر سماج کے افراد جاہل اور بے شعور ہوں، ان میں کردار کی طاقت موجود نہ ہو، وہ تشدد کا مزاج رکھتے ہوں، ان کی سوچ پر جذباتی رجحان غالب رہتا ہو، وہ اتحاد کی اہمیت کو نہ جانیں اور جب بھی کوئی خلافِ مزاج بات پیش آئے تو وہ بے برداشت ہو کر ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کر لیں، ایسے لوگ کسی سماج کے لیے بوجھ ہیں۔

فرد کا بناؤ سماج کا بناؤ ہے، اور فرد کا بگاڑ سماج کا بگاڑ۔ جب بھی کسی سماج کی حالت سدھارنے کی ضرورت ہو تو سارا زور اس کے افراد کی اصلاح پر دینا ہوگا۔ ایسے موقع پر یہ ضرورت ہوتی ہے کہ سماج کے افراد کے اندر صحیح سوچ پیدا کی جائے۔ ان کے علم کے معیار کو بڑھایا جائے۔ ان کے اندر صحیح مزاج لانے کی کوشش کی جائے، ان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ ناخوش گوار مواقع پر اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچائیں اور حالات سے غیر متاثر رہ کر درست فیصلے لے سکیں۔ ایسے افراد کی تیاری ہی کا دوسرا نام سماج کی اصلاح ہے۔ سماج ہمیشہ فرد سے بنتا ہے نہ کہ فرد سماج سے۔

صحت فکر

روایات میں پیغمبر اسلام ﷺ سے جو دعائیں نقل کی گئی ہیں، ان میں سے ایک دعا یہ ہے: **اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ وارانا الاشیاء کما ھی** (اے اللہ، تو ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس کی پیروی کی توفیق دے اور ہمیں باطل کو باطل کے روپ میں دکھا اور ہمیں اس سے بچنے کی توفیق دے۔ اور اے اللہ، تو ہمیں چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں)۔

موجودہ دنیا میں انگنت چیزیں ہیں، اور ہر چیز کے بے شمار پہلو ہیں۔ اسی طرح خود انسان بھی چیزوں کو کسی ایک ہی زاویہ سے نہیں دیکھ پاتا۔ ہر شخص اپنی ذہنی اور قلبی حالت کے تحت چیزوں کو مختلف زاویہ سے اور مختلف رخ سے دیکھتا ہے۔ اس بنا پر ہر آدمی کے لئے اور ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ کوئی خلاف واقعہ رائے قائم کرلے، وہ ایک ایسی رائے قائم کرلے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔

ایسی حالت میں آدمی اگر کوئی درست رائے قائم کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اسے بہت زیادہ اہتمام کرنا پڑے گا۔ وہ سارے متعلق پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اپنی رائے بنائے۔ اسی کے ساتھ وہ مسلسل خدا سے صحت فکر کی دعا کرتا رہے۔ کیوں کہ کوئی بھی شخص خدا کی مدد کے بغیر اس دنیا میں درست رائے تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس دنیا میں چیزیں اس طرح ملی جلی ہیں کہ ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ آدمی حق کو باطل کے روپ میں دیکھ لے، اور باطل اس کو حق کے روپ میں دکھائی دینے لگے۔ ایسی حالت میں غیر معمولی کوشش کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ آدمی حق کو حق کی صورت میں دیکھے، اور باطل اس کو صرف باطل کے روپ میں نظر آئے۔

یہ کسی آدمی کے لئے بہت بڑی نعمت ہے کہ اس کو وہ نگاہ حاصل ہو جائے جو چیزوں کو ویسا ہی دیکھنے لگے جیسا کہ باعتبار حقیقت وہ ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ سب سے زیادہ اسی کی کوشش کرے، وہ سب سے زیادہ اسی کو خدا سے مانگے۔

برداشت کا فائدہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے غصہ کو ضبط کرے جب کہ وہ اس کے نفاذ پر قادر ہو تو اللہ اس کے دل کو ایمان اور سلامتی سے بھر دیتا ہے (**من کظم غضبا وھو یقدر علی انفاذہ ملأ اللہ قلبہ امنا و ایمانا**)۔

یہ پیغمبرانہ تعلیم انسانیت کی تعمیر کے لئے شاہ کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن افراد کے اندر یہ صفت ہو وہ اعلی روحانی ترقی حاصل کریں گے اور جس سماج کے بیشتر لوگ اس صفت کے حامل ہوں وہ سماج امن و سکون کا گہوارہ بن جائے گا۔

جب ایک آدمی کے اندر کسی کے خلاف غصہ آجائے اور وہ اس غصہ کے اظہار پر قادر ہو اس کے باوجود وہ غصہ کو اپنے اندر ہی اندر ضبط کرلے تو یہ کوئی سادہ معاملہ نہیں ہوتا۔ ایسا آدمی اپنے اس عمل کے ذریعہ اپنے اندر ایک نئی اخلاقی طاقت کو جنم دیتا ہے۔ وہ ترقی کر کے نیا انسان بن جاتا ہے۔

وہ اپنے اندر نفرت کے بجائے محبت کی پرورش کرتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو انتقام کے بجائے معافی کے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ وہ اپنے اندر منفی نفسیات کو دباتا ہے اور اس کی جگہ مثبت نفسیات کو فروغ دیتا ہے۔ اس طرح غصہ کو ضبط کرنا اس کے لئے اپنی شخصیت کی تعمیر کے ہم معنے بن جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں مثبت شخصیت کی تعمیر کا سب سے بڑا کورس یہی ہے۔ اسی کورس سے گذر کر وہ آدمی بنتا ہے جو اعلیٰ انسانی صفات کا حامل ہو۔ جو لوگ غصہ کو ضبط کرنے کی اس تعلیم کو اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوں ان کی شخصیت کی اعلیٰ تعمیر بھی واقعہ بننے والی نہیں۔

غصہ کا اظہار شخصیت کو برہم کرتا ہے اور غصہ کو ضبط کرنا شخصیت کو سکون عطا کرتا ہے۔ غصہ اگر پیچھے کی طرف سفر ہے تو غصہ کو ضبط کرنا آگے کی طرف سفر۔ غصہ یہ ہے کہ آدمی حالات کے درمیان گھر کر رہ جائے اور غصہ کو ضبط کرنا یہ ہے کہ آدمی حالات سے اٹھ کر اپنے جینے کے لئے ایک بلند تر سطح حاصل کرلے۔ غصہ برداشت کرنے میں صرف فائدہ ہے، اور غصہ برداشت نہ کرنے میں صرف نقصان۔

عافیت کا راز

پیغمبر اسلام ﷺ کے ایک صحابی حضرت عمیر بن حبیب بن حماشہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ جو آدمی نادان کے چھوٹے شر پر راضی نہ ہوگا۔ اس کو نادان کے بڑے شر پر راضی ہونا پڑے گا (من لا یرضی بالقلیل مما یاتی به السفیه یرضی بالکثیر) الطبرانی۔

موجودہ دنیا ہر قسم کے انسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں اگر اچھے لوگ ہیں تو اسی کے ساتھ برے لوگ اور نادان لوگ بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ امتحان کی مصلحت کی بنا پر ان میں سے ہر ایک کو آزادی حاصل ہے۔ اس لئے موجودہ دنیا میں حالات کبھی معتدل نہیں رہتے۔ یہاں بار بار ایک کو دوسرے سے شکایت پہنچتی ہے۔ یہاں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے لئے کسی نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ سب ہنگامۂ حیات کا نتیجہ ہے۔ اس سے بچنا کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

اب ایک شخص وہ ہے کہ جب اس کو کسی سے تکلیف پہنچے تو وہ فوراً اس کا بدلہ لینے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ وہ تکلیف پہنچانے والے کو سبق دینا چاہے۔ مگر موجودہ دنیا میں اس قسم کی جوابی کارروائی کا نتیجہ مزید برائی کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہاں عقل مند وہ ہے جو چھوٹی تکلیف کو برداشت کر لے تاکہ وہ بڑی تکلیف سے بچ سکے۔ ابتدائی تکلیف ہمیشہ چھوٹی تکلیف ہوتی ہے اور دوبارہ پیش آنے والی تکلیف زیادہ بڑی تکلیف۔ اس لئے ابتدائی تکلیف کو برداشت کر لینا اپنے نتیجہ کے اعتبار سے بڑے شر کے مقابلہ میں چھوٹے شر کو گوارہ کرنا ہے۔

موجودہ دنیا میں انتخاب (چوائس) بے شر اور شر کے درمیان نہیں ہے بلکہ چھوٹے شر اور بڑے شر کے درمیان ہے۔ ایسی حالت میں چھوٹے شر کو گوارہ کر لینا عقل مندی ہے نہ کہ بے شر کی طرف دوڑنا، کیوں کہ بے شر حالت اس دنیا میں سرے سے ممکن ہی نہیں۔

یہ فطرت کا اصول ہے۔ اور اس دنیا میں کوئی کامیابی فطرت کی پیروی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے نہ کہ اس سے انحراف کے ذریعہ۔

بھلی بات

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ بولے تو بھلی بات بولے، ورنہ چپ رہے (**من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليقل خيراً او ليصمت**)۔

دنیا کا اکثر بگاڑ کسی غلط بول کا نتیجہ ہوتا ہے اسی طرح دنیا کا اکثر بناؤ کسی اچھے بول کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک بول سے لوگوں میں محبت بڑھتی ہے اور دوسرا بول لوگوں میں نفرت پھیلانے کا سبب بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں سنجیدہ اور ذمہ دار آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زبان و قلم کو استعمال کرنے میں بے حد احتیاط کرے۔

زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کچھ لکھنا یا بولنا چاہتا ہے مگر لکھنا یا بولنا اسی انسان کے لئے جائز ہے جو مذکورہ پیغمبرانہ ہدایت پر عمل کرے۔ جو شخص اس ہدایت پر عمل نہ کر سکے اس کے لئے لکھنا اور بولنا سرے سے جائز ہی نہیں۔

اس معاملہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کے پاس کہنے کے لئے ایک ایسی بات ہے جو دوسروں کے بارے میں اچھا گمان پیدا کرنے والی ہے۔ جس کی اشاعت سے لوگوں کے درمیان محبت کی فضا پیدا ہونے کی امید ہے۔ جو واضح طور پر ایک ایسی بات ہے جس سے لوگوں کے اندر مثبت ذہن یا تعمیری شوق پیدا ہونے والا ہے۔ اس قسم کی بات بلاشبہ ایک بھلی بات ہے اور اس کو کہنے پر خدا کی طرف سے کوئی پابندی نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ جو بات لکھنے یا کہنے جارہے ہیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک منفی بات ہے۔ اندیشہ ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے اندر بدگمانیاں پیدا ہوں۔ لوگوں کے اندر اشتعال بھڑکے۔ لوگ ایک دوسرے کے خلاف نفرت کرنے لگیں۔ انسانیت دوست اور دشمن میں تقسیم ہو جائے۔ ایسی صورت میں آپ کے اوپر لازم ہے کہ آپ چپ رہیں، نہ کہ بول کر انسانیت کے مسائل میں اضافہ کا سبب بن جائیں۔

اعلیٰ کردار

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ تم اس سے جڑو جو تم سے کٹے اور تم اس کو دو جو تم کو محروم کرے۔ اور تم اس کو معاف کر دو جو تم پر ظلم کرے (**تصل من تطعك وتعطي من حرمك وتعفو عمن ظلمك**)۔

اس حدیث میں کردار کا وہ طریقہ بتایا گیا ہے جو کسی انسان کو اعلیٰ انسان بناتا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی رد عمل کی نفسیات سے پاک ہو۔ اس کا اخلاق جوابی اخلاق نہ ہو بلکہ وہ اعلیٰ انسانی اصولوں کے تحت متعین ہوا ہو۔ وہ ہر ایک سے یکساں طور پر حسن اخلاق کا رویہ اختیار کرے، خواہ اس سے اچھا تجربہ ہوا ہو یا برا تجربہ۔

سماجی زندگی میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو آپ سے شکایت ہوتی ہے اور وہ آپ سے قطع تعلق کر لیتا ہے یا سلام وکلام بند کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو بھی وہی نہیں کرنا ہے جو اس نے آپ کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے برعکس آپ کو یک طرفہ طور پر اس سے ملنا ہے۔ آپ کو یک طرفہ طور پر اس سے سلام وکلام جاری رکھنا ہے۔ یہ سب کچھ محض ظاہری طور پر نہیں بلکہ دل کی پوری آمادگی کے ساتھ ہونا چاہئے۔

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص آپ سے غصہ ہو جاتا ہے اور جو کچھ وہ آپ کو دے رہا تھا اس کو دینا بند کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو یہ نہیں کرنا چاہئے کہ آپ بھی اس کو جو کچھ دے سکتے ہیں وہ اسے نہ دیں۔ اس کے برعکس آپ کو اپنے عطیات کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے۔ آپ جو کچھ اسے دے سکتے ہیں، وہ ضرور اسے دیں۔ اور دینے کے بعد کسی واپسی کی امید نہ رکھیں۔

اسی طرح اجتماعی زندگی میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے جو آپ کی نظر میں ظلم ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کے دل میں غصہ بھڑک اٹھتا ہے۔ مگر اعلیٰ انسانیت یہ ہے کہ آپ غصہ کو ختم کر دیں۔ ظلم کرنے والے کو معاف کر کے دوبارہ اس کے ساتھ اپنے تعلقات کو معتدل بنا لیں۔

بدگمانی

صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں یہ روایت آئی ہے کہ پیغمبر اسلام نے لوگوں کو ہدایت دیتے ہوئے کہا کہ تم لوگ گمان سے بہت زیادہ بچو، کیوں کہ گمان سب سے بڑا جھوٹ ہے (**ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث**) متفق علیہ۔

گمان یہ ہے کہ آدمی پوری معلومات کے بغیر کسی کے بارے میں ایک رائے قائم کرلے۔ ہر آدمی کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ ہر آدمی کا عمل بہت سے اسباب کے تحت ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کامل تحقیق کے بغیر کسی کے عمل کی حقیقت کو جاننا ممکن نہیں۔ کوئی شخص کسی کا صرف ایک عمل دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرلے تو یہ گمان ہوگا۔ اور گمان کسی کے لئے بھی جائز نہیں۔

آدمی کے ہر عمل کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں، اس لئے اس کی توجیہات بھی متنوع اور مختلف ہوتی ہیں۔ دوسروں کے بارے میں آدمی کا مشاہدہ یا تجربہ ہمیشہ جزئی مشاہدہ اور تجربہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی کی ایک روش کو دیکھ کر اس کے خلاف برا گمان کرنا گویا جزئی علم کو کلی علم سمجھ لینا ہے۔ ناقص معلومات پر کامل واقفیت کا دعوی کرنا ہے۔ اس لئے کسی کے خلاف بدگمانی عین اسی قسم کی ایک چیز بن جاتی ہے جیسا کہ جھوٹ۔

جھوٹ اخلاقی حیثیت سے انتہائی معیوب کلام ہے۔ وہ خدائی شریعت کے اعتبار سے سراسر ناجائز ہے۔ ایسی حالت میں جو آدمی کسی کے خلاف بدگمانی کرتا ہے تو وہ ایک بے حد سنگین جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ ایسا کرکے وہ خدا کی نظر میں اپنے آپ کو ایک غیر مطلوب بندہ بنالیتا ہے۔ اور انسانوں کی نظر میں وہ ایک ایسا شخص بن جاتا ہے جس سے تمام لوگ نفرت کریں۔ جس کو سماج میں باعزت درجہ نہ ملے۔

گمان کی بنیاد پر کسی کے خلاف رائے قائم کرنے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی کوئی رائے ہی قائم نہ کرے۔ آدمی رائے قائم نہ کرنے کے لئے آزاد ہے۔ مگر رائے قائم کرتے ہی وہ قابل مؤاخذہ ہو جاتا ہے۔

اچھا گمان کرنا جائز ہے۔ اور برا گمان کرنا بلاشبہ ناجائز۔

غیبت کا کفارہ

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ تم اس کے حق میں بخشش کی دعا کرو جس کی تم نے غیبت کی ہے۔ تم یہ کہو کہ اے اللہ، تو مجھ کو اور اس کو بخش دے (إن من كفارة الغيبة أن تستغفر لمن اغتبته تقول اللهم اغفر لنا وله) البیہقی۔

اجتماعی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی زبان سے دوسرے کے لئے کچھ برے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ جو غیبت کی تعریف میں آتے ہیں، جس کو اگر صاحب معاملہ سنے تو اس کو سخت تکلیف ہو گی۔ غیبت کو خدا کے دین میں گناہ بتایا گیا ہے۔ ایسی حالت میں وہ شخص کیا کرے جس کی زبان سے اپنے بھائی کے لئے غیبت والے الفاظ نکل گئے ہیں۔ اس نے اپنے بھائی کے حق میں اس کی غیر موجودگی میں ایسے کلمات کہہ دئے ہیں کہ اگر وہ اس کو سنے تو اس کے دل کو تکلیف پہنچے گی۔

اس کا حل دین میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی اس کے حق میں دعا کرے جس کے خلاف غیبت کے الفاظ اس کی زبان سے نکل گئے ہیں۔ وہ اپنے لئے خدا سے بھلائی مانگے اور اپنے بھائی کے لئے بھی خدا سے بھلائی کی درخواست کرے۔ وہ اپنی اصلاح کا طالب بھی ہو اور اپنے بھائی کی اصلاح کا طالب بھی۔ اس قسم کی دعا سادہ طور پر کچھ الفاظ بولنے کا نام نہیں۔ وہ اس شخص کے حق میں خیر خواہی کا اظہار ہے جس کے خلاف غیبت کا فعل ہوا تھا۔ غیبت اپنی حقیقت کے اعتبار سے نفرت اور بدخواہی کا عمل ہے۔ اگر کسی سے اس قسم کا عمل سرزد ہو جائے تو آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے دل سے نفرت اور بدخواہی کے جذبات کو نکالے اور اس کی جگہ متعلق شخص کے حق میں محبت اور خیر خواہی کے جذبات پیدا کرے۔ اسی محبت اور خیر خواہی کا ایک اعلے اظہار وہ ہے جس کو اس حدیث میں دعا کہا گیا ہے۔

جس سماج میں غیبت عام ہو جائے وہ سماج نفرت اور بے اعتمادی کا سماج بن جائے گا۔ کسی سماج کو اس بگاڑ سے بچانے کی تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ اسپرٹ پیدا کی جائے کہ جب کبھی ان کی زبان سے غیبت کے الفاظ نکل جائیں تو اس کے بعد وہ نیک دعاؤں سے دوبارہ اس برائی کو دھو دیں۔

نیکی کرنا

قرآن میں زندگی کے جو اصولی احکام بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ نیک کام کرے کیوں کہ نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاد دہانی ہے یاد دہانی حاصل کرنے والوں کے لئے ﴿إن الحسنٰت يذهبن السيأت ذٰلك ذكرىٰ للذاكرين﴾ ہود ۱۱۔

موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے انسان سے بار بار کوئی غلطی یا برائی ہو جاتی ہے کبھی خدا کی نسبت سے اور کبھی انسان کی نسبت سے۔ آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ جو غلطی یا برائی اس سے ہوئی ہے وہ اس کو مٹا کر ختم کر دے۔ ایسی حالت میں انسان کو کیا کرنا چاہئے، اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

وہ جواب یہ ہے کہ آدمی سے جب کوئی برائی سرزد ہو جائے تو اس کے بعد وہ نیکی کا کوئی کام کرے۔ اس طرح اس کی غلطی کی تلافی ہو جائیگی۔ اس کا اچھا عمل اس کے برے عمل کو ڈھانپ لے گا۔ وہ اس کو ایسا کر دے گا گویا کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ خدا کی عبادت میں اگر کمی ہو جائے تو آدمی کو چاہئے کہ وہ مزید عبادت کر کے اس کی تلافی کرے۔ وہ خدا کے لئے مزید بندگی اور وفاداری کا عمل انجام دے کر خدا کی رحمت کو دوبارہ اپنی طرف متوجہ کر لے۔ اس طرح وہ دوبارہ اطمینان قلب کا درجہ حاصل کر لے گا۔

انسان کی نسبت سے اگر کوئی غلطی واقع ہو تو اس کی تلافی کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً اگر آپ نے کسی کو برا کہہ دیا یا اس کو گالی دیدی تو آپ کو چاہئے کہ اس سے مل کر اس سے معافی مانگیں اور تعلقات کو دوبارہ معتدل بنائیں۔ غلطی پر معافی مانگنا بیک وقت اپنے اندر دو فائدے رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ ایسا کر کے آدمی اپنے آپ کو احساس گناہ کی شرمندگی سے بچالیتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آپ نے جس آدمی کے دل کو تکلیف پہنچائی ہے اس کی شکایت کو رفع کرنے کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہے۔

اسی طرح برائی کے بعد نیکی کرنے کی ایک اور صورت یہ ہے کہ اس کے لئے مال خرچ کیا جائے۔ جس آدمی کے ساتھ برائی کا فعل ہوا ہے اس کو تحفہ دینا یا مالی مدد پہنچانا۔ اس کے نام پر مال کا صدقہ کرنا۔ اگر آپ نے کسی کو مالی نقصان پہنچایا ہے تو نقصان کے بقدر اس کی تلافی کرنا، وغیرہ۔

جنت والے

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کیا چیز ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ جنت میں لے جائے گی۔ آپ نے جواب دیا کہ اللہ کا تقوی اختیار کرنا اور بہتر اخلاق (سئل رسول الله ﷺ عن اکثر ما یدخل الناس الجنة— قال تقوی الله وحسن الخلق) الترمذی۔

کسی آدمی کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ دنیا میں ایسی زندگی گذارے کہ جب وہ مر کر اگلی دنیا میں پہنچے تو وہاں اس کو جنت میں رہنا نصیب ہو، وہ وہاں ابدی خوشیوں کی زندگی پاسکے۔ اسی کامیاب زندگی کا راز اس حدیث میں بتایا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز تقوی کی روش ہے۔ یعنی خدا کو بڑا مان کر اس سے ڈرتے رہنا۔ اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھنا۔ یہ یقین کرنا کہ میں کسی بھی حال میں خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ میرے کھلے اور چھپے تمام احوال خدا کے علم میں ہیں۔ میری کوئی بھی تدبیر مجھ کو خدا سے بچانے والی نہیں۔

یہ یقین جس آدمی کے دل میں آجائے اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ آزاد زندگی کو چھوڑ کر پابند زندگی اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنے آپ کو غیر ذمہ دارانہ روش سے بچاتا ہے۔ اور ذمہ دارانہ روش کو اختیار کرتا ہے۔ یہ عقیدہ اس سے گھمنڈ اور انانیت جیسے جذبات کو چھین لیتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں خدا کا فرماں بردار بندہ بن جاتا ہے۔

جنتی انسان کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کا کردار جنتی کردار بن جاتا ہے۔ لوگوں کے درمیان وہ اسی دنیا میں اس طرح رہنے لگتا ہے جس طرح آخرت میں جنت کے باشندے آپس میں رہیں گے۔ اس کے دل میں لوگوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی زبان میٹھے بول سے تر رہتی ہے۔ وہ لوگوں سے اس طرح ملتا ہے جیسے ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی سے ملے۔ دوسروں سے معاملہ کرنے میں وہ ہمیشہ انصاف پر قائم رہتا ہے۔ جب بھی وہ لوگوں سے کوئی معاملہ کرتا ہے تو اس وقت اخلاقی اور انسانی اصول اس کے رہنما ہوتے ہیں نہ کہ محض ذاتی مفادات۔

کامیابی کا راز

انسانی فلاح کا راز اصولی اعتبار سے صرف ایک ہے: فطرت کے مقرر راستہ پر چلنا اور اس سے کبھی نہ ہٹنا۔ یہی بات قرآن میں اس طرح بیان کی گئی ہے: کیا وہ خدا کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالانکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کے تابع دار ہیں (آل عمران ۸۳)۔

انسان اور کائنات دونوں کے لئے خدا نے کامیابی کا ایک ہی راستہ (کورس) مقرر کیا ہے۔ بقیہ کائنات اس راستہ پر مشین کی طرح جبری نظام کے تحت چل رہی ہے۔ انسان کو فطرت کی اس شاہراہ پر خود اپنے اختیار کے تحت چلنا ہے۔ یہی اختیاری پابندی انسان کا شرف ہے۔ اور اسی اختیاری پابندی کی قیمت میں اس کو جنت کا انعام دیا جائے گا۔

زمین پر بہت سی اونچی اونچی چیزیں ہیں۔ مثلاً درخت اور پہاڑ وغیرہ۔ درخت اور پہاڑ بظاہر سیدھے کھڑے ہوئے ہیں مگر وہ اپنا سایہ زمین کے اوپر ڈال دیتے ہیں۔ اخلاقی زبان میں اسی کا نام تواضع ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے تمام رویے میں اسی طرح تواضع کا انداز اختیار کرے۔ چڑیاں صبح وشام زمین کی فضا میں اپنے سریلے نغمے بکھیر رہی ہیں۔ اسی طرح انسان کو چاہئے کہ وہ لوگوں کو اپنے کڑوے بول سے بچائے۔ ایک انسان سے دوسرے انسان کو صرف میٹھا بول سننے کو ملے۔

ستارے اپنے اپنے مدار کے پابند رہتے ہوئے اپنا سفر طے کرتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو انصاف کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی زندگی گزارنا چاہئے۔ درخت کاربن ڈائی آکسائڈ لیتا ہے اور آکسیجن لوٹاتا ہے۔ اسی طرح انسان کو برے سلوک کے جواب میں اچھا سلوک کرنا چاہئے۔ سورج نفع بخشی کے اصول پر سرگرم ہے، اسی طرح انسان کو چاہئے کہ وہ ہر ایک کو نفع پہنچانے والا بنے۔

کائنات فطرت کے اعلیٰ اصولوں کا ایک بے نقص ماڈل ہے۔ اس ماڈل کو خود فطرت نے وضع کیا ہے۔ انسان کو بھی اسی ماڈل کی پیروی کرنا ہے۔ یہی انسانی کامیابی کا واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا انسان کے لئے کامیابی کا کوئی اور راستہ نہیں۔